قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

مارچ 2024 قیمت 15₹

Azadi Ka Amrit Mahotsav

G20 भारत 2023 INDIA

ماہنامہ اردو دنیا نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

۲۶ واں قومی اردو کتاب میلہ ممبئی ۲۰۲۴ء

GRAND
FINALE
2024

اردو دنیا

ماہنامہ

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:26،شمارہ:03،مارچ2024

مدیر : پروفیسر دھننجے سنگھ

نائب مدیر : عبدالباری

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین : عبدالرشید اعظمی،شاداب شمیم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر،قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ تعلیم،محکمۂ اعلیٰ تعلیم،حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز،بی۔88،اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II،نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ:محمد اکرام

ڈیزائننگ:محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPULاور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون،ایف سی 33/9،انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،

نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8،ونگ-7 آر کے پورم،نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ:110-7-22،تھرڈ فلور،ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر5-1 پتھر گٹی،حیدرآباد۔500002

فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

ربط و التفات — قارئین کے خطوط 5

رپورٹ

ممبئی قومی اردو کتاب میلہ 2024 — نایاب حسن 7

زبان و تعلیم

بائٹ سائز لرننگ ایک نئی تدریسی حکمت عملی — روبینہ 23

چمن زار نسواں

بشیرالنسا بشیر — آمنہ تحسین 26

بہار کا پہلا جریدہ نسواں ماہنامہ عفت پٹنہ — محمد ذاکر حسین ندوی 30

خطوطِ صفیہ اختر نسائی ادب کا گراں قدر سرمایہ — شاداب تبسم 33

ترنم ریاض کی شاعری میں نسائی ابعاد — منظور احمد گنائی 36

لعل و گہر

نئے رستے بنانے والا شاعر مظہر امام — نجمہ رحمانی 39

محمود ایوبی: استحصال زدہ طبقے کا درد آشنا کہانی کار — شمع اختر کاظمی 43

ڈاکٹر الیاس صدیقی — مبین نذیر 45

ادب زاویے اور جہات

امیر خسرو: ہندوستانی ثقافت کا امین — زبیر احمد بھاگلپوری 47

میر کا طرز شاعری — احسان حسن 51

بین تہذیبی مکالمہ اور تحتیہ ترجمہ نگاری کا رجحان — وسیم احمد علیمی 54

جموں و کشمیر کے نمائندہ غیر مسلم افسانہ نگار — زاہد یاسین شاہ 57

کہیں ہم بھول نہ جائیں

وحید العصر گونوجھا — امتیاز وحید 60

خصوصی گفتگو

سید محمود احمد کریمی سے انٹرویو — عبدالحی 62

یاد رفتگاں

بدرالدین الحافظ — محمد احمد دانش روانوی 66

استاد راشد خان — رضوان الحق 69

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ — ادارہ 73

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 82

ہماری بات

کتابیں علم کا خزانہ ہوتی ہیں جو نہ صرف ہمارے شعور کو بیدار کرتی ہیں بلکہ ہمارے اندر نئے خیالات و جذبات اور فکر کی نئی جہتیں بھی پیدا کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے کتاب کو سب سے اچھا ساتھی اور دوست کہا جاتا ہے۔ کتابیں چونکہ اپنے آپ میں ایک دنیا ہوتی ہیں اور ان کے اندر کئی اور دنیائیں آباد ہوتی ہیں، اس لیے کتاب کا مطالعہ کرنے والا گویا ایک ہی وقت میں کئی تہذیبوں اور کئی دنیاؤں کی سیر کرلیتا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ کتابوں نے اور کتابوں سے مربوط افراد نے انسانی سماج پر ہر دور میں غیر معمولی اثر ڈالا ہے۔ قوموں کی تعمیر و ترقی اور تہذیبوں کے ارتقا میں جتنا حصہ کتابوں کا رہا ہے، اتنا کسی اور چیز کا شاید رہا ہو۔ آج کے دور میں بھی اگر ہم اپنے ملک کو عالمی منظر نامے پر نیک نام اور سرخرو بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں کتاب ہی کا سہارا لینا پڑے گا۔ یوں بھی ہمارا ملک وِدیا اور علم کی دھرتی ہے، اس نے زمانۂ قدیم سے علم اور تہذیب کے شعبوں میں دنیا کو بہت کچھ دیا ہے، اسی وجہ سے ہمارے ملک کو پوری دنیا میں عزت و عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

یہ افسوس کی بات ہے کہ ہر لحہ ترقی کرتی ہوئی اس دنیا میں کتاب کلچر ختم ہوتا جا رہا ہے، نئی نسل کتابوں سے دور ہو رہی ہے، کتابوں کی جگہ سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ پر زیادہ وقت صرف کر رہی ہے، جس کی وجہ سے علم اور تہذیب و ثقافت سے اس کا رشتہ ٹوٹ رہا ہے اس لیے نئی نسل کو کتابوں سے قریب لانا اور ان کو تہذیب و ثقافت سے جوڑنا بے حد ضروری ہے، اسی وجہ سے قومی اردو کونسل ہر سال ملک کے مختلف شہروں میں کتاب میلے کا انعقاد کرتی ہے تاکہ معاشرے میں کتاب کلچر کو فروغ دیا جائے اور نئی نسل کو کتابوں سے قریب لایا جائے۔

کونسل دہلی، ممبئی، لکھنؤ، حیدرآباد، بنگلور، کولکاتا، مالیگاؤں، پٹنہ، اورنگ آباد، شولاپور، کشن گنج، سری نگر اور وانمباڑی وغیرہ شہروں میں اب تک دو درجن سے زائد قومی کتاب میلے کا انعقاد کر چکی ہے، اس کے علاوہ بیرون ملک ابوظہبی اور شارجہ کے عالمی کتاب میلے میں بھی کونسل ہندوستان کی نمائندگی کر چکی ہے۔

حال ہی میں قومی اردو کونسل نے ممبئی میں قومی اردو کتاب میلے کا انعقاد کیا تھا، یہ قومی کونسل کا چھبیسواں قومی کتاب میلہ تھا۔ اس میں اردو زبان و ادب سے محبت کرنے والوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی، خاص طور پر بچے اور بچیوں نے غیر معمولی شوق و ذوق کا مظاہرہ کیا اور کتابوں سے اپنی بے مثال محبت کا ثبوت پیش کیا۔ نو دنوں تک چلنے والے اس کتاب میلے میں کم و بیش نوے لاکھ روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی بڑی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں، جو کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں اور اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس کتاب میلے نے یہ بھی ثابت کیا کہ اردو کا مستقبل تابناک اور روشن ہے۔ اسی طرح نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا (NBT) کے زیر اہتمام پرگتی میدان میں بھی عالمی کتاب میلے کا انعقاد کیا گیا جس میں مجموعی طور پر لاکھوں محبان کتب شریک ہوئے۔ اس میں بھی قومی اردو کونسل اور اردو کے ساتھ درجنوں دوسری زبانوں کے پبلشرز اور اشاعتی اداروں نے حصہ لیا۔

کتاب میلے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں سماج، سائنس، جغرافیہ، تاریخ اور زبان و ادب ہر موضوع پر بے شمار کتابیں موجود ہوتی ہیں اور ایک ہی جگہ ہمیں اپنے ذوق کی کتابیں آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔ ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ کتاب میلوں میں کم وقت میں ہم بہت سارے موضوعات پر شائع ہونے والی نئی کتابوں اور ان کے مصنفین کے بارے میں بھی جانکاری حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسے میلے نہ صرف ہمارے ذہن اور شعور کو تازگی بخشتے ہیں بلکہ مجموعی طور پر سارا معاشرہ ان کے مثبت اثرات کو محسوس کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے قلمکاروں اور ادیبوں سے روبرو ہونے کا بھی براہ راست موقع ملتا ہے، جس سے ان کے خیالات و نظریات اور افکار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

کتاب میلے تہذیبی و ثقافتی شعور کو استحکام بخشنے، کتاب بینی اور مطالعے کی تہذیب کو عام کرنے اور نئی نسل کو ڈیجیٹل مواد کے بجائے مطبوعہ کتابوں کے لمس اور ان کی خوشبوؤں سے سرشار کرنے کا اہم ذریعہ ہیں، اس لیے زبان و ثقافت کے فروغ کے لیے سرگرم اداروں کو وقتاً فوقتاً ایسے میلوں کا انعقاد کرتے رہنا چاہیے اور ہمیں ان سے بیش از بیش استفادہ بھی کرنا چاہیے۔

پروفیسر دھننجے سنگھ

ربط و التفات

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماهنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

✍ موسم گل کی آمد آمد ہے اور گل پوش وادیوں میں ہی نہیں بلکہ شدید سردی کے باعث ہر طرف برفباری کے امکانات روشن ہیں ایسے میں اردو دنیا کے دلکش مشمولات بطورِ خاص اداریہ کی خوبصورت اور پر مغز باتیں اس شمارے کا حسن دو بالا کر رہی ہیں۔ 21 فروری کے حوالے سے مادری زبانوں کی اہمیت عظمت اور افادیت کو جن دلائل اور مثالوں کے ساتھ آپ نے درج کیا ہے، قابل صد ستائش ہیں۔

ادب زاویے اور جہات کے تحت تراجم کے فوائد اور ان کی ادبی اہمیت کو درشاتا مضمون معلومات میں اضافے کا باعث ہے۔ اردو فکشن تنقید اپنے موضوع کا حق ادا کرتا ہوا مضمون ہے۔ فورٹ سینٹ جارج کالج... اردو شاعری میں کرشن کنھیا، اردو مشاعروں کی ادبی افادیت، املہ سے بے نیازی، غرض زبان و تعلیم، یاد رفتگاں خصوصی گفتگو، نگر نگر اردو، کتاب دریچہ، فلم /ڈراموں، ادب اطفال، نیا آسماں نئے ستارے، کتابوں کی دنیا اور خبر نامے، تمام تر ادبی کاوشیں سنجیدگی کے ساتھ مطالعے کی متقاضی ہیں تاکہ ذہن دریچوں میں نئی روشنی داخل ہو سکے۔

✍ **ڈاکٹر رضوانہ ارم**: صدر شعبۂ اردو، جمشید پور وومنس یونیورسٹی، جمشید پور

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' کثیر الجہات رسالہ ہے۔ ادب، زندگی اور معاشرے کا آئینہ و نقاد ہوتا ہے جس میں معاشرتی معاملات و مسائل کی تصویر نظر آتی ہے۔ جو لوگ اس آئینے کو دیکھنے کی جرأت کرتے ہیں انھیں وہ چہرے نظر آتے ہیں جو بسا اوقات پرنور ہوتے ہیں اور کبھی کبھی اضمحلال و افسردگی کا مرقع۔ رسالہ اردو دنیا میں ایسی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں جن میں دونوں طرح کی تصویریں آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔ کبھی کبھی دل اداس کر جاتی ہیں تو کبھی کبھی حظ و انبساط نیز مسرت ملتی ہے۔ اس کے ساتھ کچھ تحریریں نئی دنیا و جہان سے متعارف کراتی ہیں۔ نئی واقفیت و آگہی سے روشناس کراتی ہیں۔ کچھ تحریریں دل میں گدگدی پیدا کرتی ہیں۔

'اردو دنیا' کے ادبی، لسانی اور شخصیات پر مبنی مشمولات اردو قارئین کے لیے نشانِ راہ ہوتے ہیں۔ غضنفر صاحب کا مضمون جو ترجمے کی افادیت و اہمیت کو اجاگر کرتا۔ ترجمے کے فن کو انھوں نے جامِ جم کی صفت سے مملو قرار دیا ہے گویا ترجمہ دیارِ غیر کی خوبصورتی و بدصورتی دونوں کا دیدار کرتا ہے۔ وہیں ابوبکر عباد نے اردو زبان کے جمہوری کردار و اوصاف پر روشنی ڈالی ہے۔ محترمہ انوپما پول نے اردو زبان کے اس کردار کو واضح کیا ہے جو غیروں کے بھی کام آنے کا آلہ بنی ہے۔ اس کو فتح و نصرت آلہ بنانے کے لیے کہاں کہاں، کیسے کیسے صیقل کیا گیا۔ طالب اکرام صاحب نے اردو شعر و ادب کو ثروت مند بنانے والے کردار کرشن کنہیا پر بالتحقیق اچھا محاکمہ پیش کیا ہے۔ عبدالرحمٰن فیصل نے جس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے، اردو رسائل و جرائد کے لیے کمیاب موضوع ہے جسے انھوں نے ادبی جہت کے نام سے متعارف کرایا ہے۔ گلشن مسرت کا مضمون اردو مشاعرہ بھی اپنی افادیت و اہمیت رکھتا ہے۔ اسلم جاوداں صاحب کا مضمون 'املہ سے بے بیازی ایک بڑی غلطی' لسانی اعتبار سے ایک ایسے گوشے کی طرف رہنمائی کرتا ہے جس کی کمی محسوس ہو رہی تھی اور کچھ موہوم صورتوں کو صاف کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ زبان و تعلیم، یاد رفتگاں، خصوصی گفتگو، نگر نگر اردو، کتاب دریچہ، فلم/ ڈراما، ادب اطفال، نیا آسماں نئے ستارے، کتابوں کی دنیا وغیرہ نے رسالہ 'اردو دنیا' کو متمول و مفید اور وقیع بنا دیا ہے۔

✍ **فردوس بانو فلاحی**: گلمرگ اپارٹمنٹ، ایم 109، فرسٹ فلور، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

’اردو دنیا‘ فروری کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے، ٹائٹل پیج پر حروف تہجی کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا، پہلے تو یہ حروف سب کو یاد ہوا کرتے تھے لیکن آجکل کم ہی لوگوں کو یہ یاد رہتا ہے، حروف تہجی کو سرورق پر دے کر آپ نے بہت اچھا کیا، مشمولات کی رنگارنگی ہمیشہ کی طرح دلچسپ ہے، ایک رسالے میں اتنی چیزوں کو جگہ دینا یہ آپ لوگوں کا ہی خاصہ ہے، اداریہ میں مادری زبان کے متعلق بڑی اہم بات کہی گئی ہے، مادری زبان کا تحفظ ہم سب پر لازم ہے، میرا داغستان کے حوالے سے اداریے میں جو واقعہ نقل کیا گیا ہے وہ واقعی سبق آموز ہے اور اس واقعے سے مادری زبان کی اہمیت و افادیت بھی واضح ہو جاتی ہے، پروفیسر غضنفر کا مضمون بے حد معلوماتی ہے، انھوں نے ترجمے کی اہمیت اور ترجمے کی افادیت پر مدلل گفتگو کی ہے، ترجمہ واقعی ایک مشکل کام ہے، غضنفر نے ترجمے کے سلسلے میں بالکل صحیح کہا ہے کہ ترجمہ کی حیثیت جام جم کی ہے اور اس کے ذریعے ہم نادیدہ دنیاؤں کو دیکھ پاتے ہیں اور اجنبی جہانوں سے مانوس ہوتے ہیں۔ انو پما پول کا مضمون سینٹ جارج کالج مدراس کے حوالے سے ہے، یہ بہت ہی اچھا مضمون ہے اور اس کو پڑھ کر کئی نئی چیزوں کا علم ہوا، اردو زبان و ادب کے فروغ میں عام طور پر فورٹ ولیم کالج کے کردار پر ہی زور دیا جاتا ہے لیکن اس مضمون کو پڑھ کر لگا کہ سینٹ جارج کالج کا ذکر بھی فورٹ ولیم کالج کے ساتھ ضروری ہے، اس لیے کہ دونوں اداروں کے مقاصد ایک ہی تھے، اور دونوں سے اردو زبان و ادب کا فروغ ہوا ہے، اس ادارے سے بھی کئی اہم اور مشہور کتابیں شائع ہوئی ہیں جیسے ’دکنی انوار سہیلی‘، الف لیلہ کا پہلا ترجمہ ’حکایت الجلیلہ‘ اور داستانی کتاب ’ملکہ زماں و کلام کندلہ‘ وغیرہ کتابیں یہاں سے شائع ہو کر مقبول ہوئیں، ہاں یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ فورٹ ولیم کالج پہلے قائم ہوا اور اس کے بارہ سال بعد فورٹ سینٹ جارج کالج قیام عمل میں آیا۔ امتیاز احمد کا مضمون ’اردو زبان کے آغاز سے متعلق مختلف نظریات کا جائزہ‘ ایک طویل مضمون ہے، اس طرح کے اور بھی کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں، اس مضمون کو دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اتنے طویل مضمون میں کوئی نئی چیز نہیں ملی، وہی پرانی باتیں، وہی پرانی دلیلیں، امید ہے کہ اس طرح کے مضامین کے بجائے نئے پہلو پر مضامین کو فوقیت دی جائے گی، پروفیسر صغیر افراہیم کا انٹرویو پڑھ کر اچھا لگا، صغیر افراہیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک طویل مدت تک درس و تدریس سے وابستہ رہے ہیں، اس انٹرویو میں انھوں نے اپنے علمی و ادبی سفر کو بڑی خوب صورتی سے بیان کیا ہے، ان کا نام کئی حوالوں سے معروف ہے خاص طور پر پریم چند پر ان کے کام اور ان کی کتاب کی پذیرائی قابل رشک ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی مضامین بدنام نظر کی نظموں میں زندگی کی خوشبو، برہانپور کی نظمیہ شاعری، کوکن میں ادب اطفال کی صورت حال اور وحشت کا تصور میر و غالب وغیرہ اچھے ہیں، تبصرہ کے تحت بارہ کتابوں کے تبصرے ہیں، مجموعی طور پر یہ رسالہ بھی اور رسالوں کی طرح معلوماتی ہے، اسے اردو کے طلبا، اساتذہ اور خاص طور پر ریسرچ اسکالرز کو ضرور پڑھنا چاہیے۔

ابصار شمیم: رہوا، رامپور، وارث نگر، سمستی پور، بہار

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ شمارہ جنوری مجھے بذریعہ ڈاک وقت پر مل گیا۔ موجودہ شمارہ خوبصورت سرورق پر نئے سال کی مبارکبادی کا پیام لیے ہے۔

شمارے میں ہماری بات کے تحت فکر انگیز اداریہ، ربط و التفات میں قارئین کے خطوط جس میں صرف ستائشی اور تحسینی کلمات نہیں بلکہ ان میں رسالے کے مشمولات کے حوالے سے بحث / معقول تجاویز شامل ہوئی ہیں۔

دیگر عنوانات - ادب میں چار مضامین، زبان و تعلیم میں ایک، زبان اردو کے معتبر اور ممتاز مصنف و نقاد شارب ردولوی پر ایک دلچسپ مضمون، خصوصی گفتگو میں ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی سے انٹرویو، ادب و صحافت کے امام ڈاکٹر امام اعظم کو خراج عقیدت، کتابوں کی دنیا میں 7 کتابوں اور ایک رسالے پر تبصرہ، تعارف کتابیں ملنے کے پتے، قیمت درج ہیں۔ ’خبر نامہ‘ میں جہانِ اردو کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی تفصیلی رپورٹس شامل ہیں۔ ان تمام علمی ادبی تحقیقی تخلیقی مثبت انداز کے مضامین جن کے پڑھنے سے قارئین کی معلومات میں حد درجہ اضافے کے ساتھ قلب و ذہن کو سکون فراہم ہوتا ہے۔ شمارے میں شائع ہوئے ہیں۔ ’اردو دنیا‘ کا ہر شمارہ 100 صفحات کا سیاسی خبروں اور اشتہارات سے ایک دم پاک وصاف اردو کے عام قارئین، ریسرچ اسکالرز، طالب علموں کے لیے ایک حسین گلدستہ ہوا کرتا ہے۔

افضل بیگ: بنگلورو، کرناٹک

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ کا تازہ شمارہ بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔ اس شمارے کے خوبصورت سرورق، دیدہ زیب کمپوزنگ، عمدہ طباعت اور بہترین دبیز کاغذ پر سجے ہوئے معیاری مضامین، دل و دماغ کو روشن کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ سچ کہوں تو ’اردو دنیا‘ کے مضامین مجھے اس قدر پسند آتے ہیں کہ میں ایک یا دو روز کے اندر ہی انھیں پورا کا پورا پڑھ لیتا ہوں، مگر ایک ’خلش‘ یا یوں کہہ لیں کہ ایک ’کمی‘، جو ہر ماہ میرے ذہن کو جھنجھوڑتی ہے، وہ یہ کہ ماہنامہ ’اردو دنیا‘ میں غزلوں اور افسانوں کے لیے بھی تھوڑی سی جگہ ہونی چاہیے۔ غزلوں اور افسانوں کے بغیر قدرے تشنگی کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔

فیروز جلالپوری: محلّہ قاضی پورہ، پوسٹ آفس جلال پور، ضلع امبیڈکر نگر، یوپی

اردو دنیا جاذب نظر رنگوں سے بھرپور دسمبر 2023 کا تازہ ترین شمارہ دستیاب ہوا۔ جس قدر محنت اور جانفشانی سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے اردو دنیا شائع ہو رہا ہے، اس کا احساس تخلیقات کے انتخاب اور فہرست کو مختلف موضوعات کی سرخی کے ساتھ تقسیم کر کے معنی خیز بنانے سے بخوبی ہوتا ہے۔ دسمبر کے شمارے کے ساتھ ہی اردو دنیا نے اپنے 25 سال مکمل کر لیے ہیں اس کے لیے میں قومی کونسل کی پوری ٹیم کو جن کی قربانیوں سے یہ رسالہ تسلسل کے ساتھ پوری کامیابی سے منظر عام پر آ رہا ہے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا سے ہی اس رسالے نے اپنا معیار قائم کر رکھا ہے اور گزرتے دنوں کے ساتھ اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس شمارے میں بھی اداریے کے اندر اہم نکات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ مجلّے کی تمام منتخب تحریروں کا انتخاب بہت عمدہ ہے۔ ادب، زاویے اور جہات کی سرخی میں شامل مضامین اپنے آپ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ خاص طور پر سلیم شہزاد اور شمس بدایونی کے مضامین معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہیں۔ ساتھ ہی شہناز رحمان، نصرت جہاں اور عبدالرحمٰن کے مضامین میں بھی عالمانہ رنگ کی جھلک اور پرکشش اسلوب کی دل آویزی دیکھنے کو ملتی ہے۔ لعل و گہر کے سرنامے کے ساتھ جن مضامین کو جگہ دی گئی ہے ان میں سرور مہدی، ارشاد آفاقی کے ساتھ امام الدین امام وغیرہ کے مضامین تنقیدی و تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ اس کے علاوہ کلیم الدین احمد کے گوشے ’جہان کلیم‘ اور جمیل مظہری کے گوشے ’ذکر جمیل‘ کے تحت شامل شدہ تخلیقات میں منفرد اور جداگانہ رنگ کا احساس ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں دیگر مضامین اور تبصرے بھی قابل قدر ہیں۔

محمد فیصل خان: رائل اپارٹمنٹ، نیو حیدر آباد، لکھنؤ، اتر پردیش

نایاب حسن

ممبئی قومی اردو کتاب میلہ 2024

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیراہتمام عروس البلاد ممبئی میں چھبیسویں قومی اردو کتاب میلے کا انعقاد عمل میں آیا۔ یہ ایک تاریخ ساز کتاب میلہ تھا جو بی کے سی گراؤنڈ میں 6 جنوری تا 14 جنوری 2024 جاری رہا۔ اس دوران پچیس سے زائد رنگارنگ ادبی و ثقافتی پروگراموں کا انعقاد ہوا اور کم و بیش نوے لاکھ کی اردو کتابیں فروخت ہوئیں۔

ممبئی ہندوستان کی صنعتی راجدھانی، ثقافتی رنگارنگی کا خوب صورت نمونہ، بالی ووڈ کی رونق افروزیوں کا مرکز اور عروس البلاد ہے۔ اس شہر کی ایک اہم شناخت اردو ادب وثقافت کے حوالے سے بھی ہے، ہمیشہ سے یہ شہر اردو کے سرکردہ ادیبوں، شاعروں، تخلیق کاروں اور اردو تحریکوں کی جولان گاہ رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس شہر میں اردو زبان و ادب کے حقیقی شائقین بستے ہیں، جو اس سے محبت کا اظہار محض زبانی کلامی طور پر نہیں کرتے؛ بلکہ اردو میں پڑھنے لکھنے کو باعث فخر سمجھتے ہیں اور اسی زبان میں مختلف علوم وفنون کی تحصیل کے ذریعے غیر معمولی کامرانیاں حاصل کرتے ہیں۔ مہاراشٹر کے دوسرے شہروں کی طرح ممبئی میں بھی اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد ہزاروں میں ہے، جس سے صحیح معنوں میں اردو زبان کا فروغ ہورہا ہے اور یہ زبان ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہورہی ہے۔ انھی خصوصیات کی وجہ سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے چھبیسویں قومی اردو کتاب میلے کے لیے شہرِ ممبئی کا انتخاب کیا گیا؛ تاکہ اس شہر میں اردو زبان، اردو کتابوں اور اردو ثقافت کے رواج ومقبولیت کا گراف مزید بلند کیا جائے اور خصوصاً نئی نسل میں کتاب کلچر کے فروغ کو ایک نئی سمت، تیزی واستحکام بخشا جائے۔

کونسل نے اس میلے کے انعقاد کے لیے ممبئی کے تاریخی ادارے انجمن اسلام کے ساتھ اشتراک کا فیصلہ کیا، جو گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے ممبئی اور مضافات میں گراں قدر تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے اور اس کے سیکڑوں اسکولوں، کالجوں میں ایک لاکھ سے زائد طلبہ و طالبات تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ اس ادارے نے اردو ادب وتحقیق کے باب میں بھی اہم کارنامے انجام دیے ہیں، اس سے اردو کی کئی نامور شخصیات وابستہ رہی ہیں اور درجنوں ادبی وتحقیقی کتابیں بھی اس ادارے نے شائع کی ہیں۔ اس ادارے کے اسی اختصاص کی بنا پر کونسل نے اس کے اشتراک سے 6 تا 14 جنوری 2024، ممبئی کے باندرہ کرلا کمپلیکس، ایم ایم آر ڈی اے گراؤنڈ میں چھبیسویں قومی اردو کتاب میلے کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔

کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر دھنجے سنگھ نے 13 دسمبر 2023 کو اپنے اخباری بیان میں اس کتاب میلے کی اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ مہاراشٹر میں اردو کے شائقین اور اس زبان سے محبت کرنے والے کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں، ہزاروں اردو میڈیم اسکول اور کالجز برسرِ کار ہیں اور طلبہ میں بھی اردو سیکھنے کا غیر معمولی شوق پایا جاتا ہے، اس لیے ہم نے اس سال مشہور تعلیمی وثقافتی ادارہ انجمن اسلام کے اشتراک سے مہاراشٹر کے مرکزی شہر ممبئی میں کونسل کے قومی اردو کتاب میلے کے انعقاد کا فیصلہ کیا

ہے، مجھے امید ہے کہ اس کتاب میلے میں شہر ممبئی اور مضافات کے تمام محبان اردو غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کریں گے۔ پروفیسر سنگھ نے کہا کہ کونسل کے کتاب میلے ہمیشہ کامیاب رہے ہیں اور اب تک اس کے زیر اہتمام مختلف شہروں میں پچیس میلے منعقد کیے جا چکے ہیں، پچھلے سال تملناڈو کے شہر وانمباڑی میں اس کا انعقاد کیا گیا تھا، جس میں شائقین علم و ادب نے کم و بیش 45 لاکھ کی کتابیں خرید کر ایک ریکارڈ قائم کیا تھا۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ ممبئی کتاب میلے کے تئیں اردو طبقہ اس سے زیادہ ذوق و دلچسپی کا مظاہرہ کرے گا اور یہ میلہ پچھلے اردو کتاب میلوں سے بھی زیادہ کامیاب ثابت ہوگا۔

میلے کی تیاریاں مکمل ہونے کے بعد 4 جنوری 2024 کو ممبئی مراٹھی پتر کار سنگھ کے ہال میں کونسل اور انجمن اسلام کی جانب سے ایک مشترکہ پریس کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ اس کانفرنس میں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر دھننجے سنگھ کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکے، البتہ انھوں نے اپنے پیغام میں کونسل کی طرف سے ممبئی کے تمام محبانِ اردو کو مبارکباد پیش کی اور امید ظاہر کی کہ وہ اس تاریخی قومی کتاب میلے سے خوب مستفید ہوں گے۔ کونسل کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر و میلہ انچارج اجمل سعید نے کونسل کے کتاب میلوں کی تاریخ اور موجودہ میلے کی غرض و غایت بیان کی اور کہا کہ قومی اردو کونسل اب تک ملک کے مختلف شہروں میں پچیس کتاب میلے کر چکی ہے اور ان میلوں کے ذریعے ہمیں نئی نسل کو کتابوں سے جوڑنے میں خاطر خواہ کامیابی ملی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس میلے کے انعقاد میں ممبئی کی نمایاں تعلیمی و ثقافتی تنظیم انجمن اسلام کونسل کے ساتھ تعاون کر رہی ہے اور مسلسل نو دنوں تک ہونے والے ثقافتی پروگراموں کا انعقاد مختلف ادبی اداروں کے زیر اہتمام ہوگا۔ ہم انجمن اسلام سمیت تمام معاون اداروں کے شکر گزار ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس میلے میں کل 180 سے زائد اردو کتابوں کے پبلشرز اور کتب فروشوں کے اسٹال لگائے گئے ہیں، جہاں ہر قسم کے موضوعات پر کتابیں خصوصی رعایت پر دستیاب ہوں گی۔ اس موقعے پر انجمن اسلام کے صدر جناب ظہیر قاضی نے کہا کہ کونسل نے اس سے قبل 2012 میں صابو صدیق کالج میں اردو کتاب میلے کا انعقاد کیا تھا لیکن اس سال کا میلہ کئی معنوں میں مختلف ہے اور یہ وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے، انھوں نے کہا کہ ممبئی اور گردونواح کے شہروں میں اس میلے کے تعلق سے جس غیر معمولی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ میلہ نہایت کامیاب رہے گا۔ انھوں نے ممبئی میں اس میلے کے انعقاد کے لیے کونسل اور حکومت ہند کا خصوصی شکریہ بھی ادا کیا۔ پریس کانفرنس میں انجمن کے نائب صدر ڈاکٹر شیخ عبداللہ، ڈاکٹر قاسم امام، فاروق سید اور فرید خان وغیرہ خاص طور پر موجود رہے۔

قومی اردو کتاب میلے کا پہلا دن

6 جنوری کو کتاب میلے کا افتتاح کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر دھننجے سنگھ، ساہتیہ اکادمی، دہلی کے سکریٹری کے سری نواس راؤ، انجمن اسلام کے صدر ظہیر قاضی اور دگر اہم شخصیات کے ذریعے فیتہ کاٹ کر کیا گیا۔ اس موقعے

اردو کتابوں کی فروخت کا قومی ریکارڈ

قومی اردو کونسل کے کتاب میلوں کا حساب کتاب

	ماہ	سال	مقام	مجموعی فروخت
1	نومبر	2000	لال قلعہ، دہلی	10 لاکھ روپے
2	نومبر	2001	لال قلعہ، دہلی	12 لاکھ روپے
3	جنوری	2003	انجمن اسلام، صابو صدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	16 لاکھ روپے
4	ستمبر	2003	سری نگر، جموں کشمیر	22 لاکھ روپے
5	جنوری	2004	انجمن اسلام، صابو صدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	23 لاکھ روپے
6	دسمبر	2004	حیدرآباد، آندھرا پردیش	24 لاکھ روپے
7	دسمبر	2005	لکھنؤ، اتر پردیش	23 لاکھ روپے
8	دسمبر	2006	کولکاتہ، مغربی بنگال	16 لاکھ روپے
9	نومبر	2007	پٹنہ، بہار	14 لاکھ روپے
10	جنوری	2009	ممبئی، مہاراشٹر	26 لاکھ روپے
11	فروری-مارچ	2010	حیدرآباد، آندھرا پردیش	52 لاکھ روپے
12	مارچ	2011	جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی گراؤنڈ دہلی	15 لاکھ روپے
13	جنوری	2012	انجمن اسلام، صابو صدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	52.4 لاکھ روپے
14	نومبر	2012	لکھنؤ، اتر پردیش	25 لاکھ روپے
15	ستمبر	2013	شیواجی، چھوٹا میدان، بنگلور، کرناٹک	31 لاکھ روپے
16	دسمبر-جنوری	2013-14	مالیگاؤں	87 لاکھ روپے
17	دسمبر-جنوری	2014-15	عام خاص میدان، اورنگ آباد	1,29,40,722 روپے
18	نومبر	2015	جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی گراؤنڈ دہلی	ایک کروڑ سے زائد
19	دسمبر	2015	قلی قطب شاہ اسٹیڈیم، حیدرآباد	50 لاکھ روپے
20	دسمبر	2016	رئیس ہائی اسکول، بھیونڈی، مہاراشٹر	ایک کروڑ 12 لاکھ روپے
21	دسمبر	2017	ایم اے پانگل اینگلو اردو ہائی اسکول	تقریباً 62 لاکھ روپے
22	اپریل	2018	روئی دھاسہ میدان، کشن گنج، بہار	تقریباً 20 لاکھ روپے
23	جون	2019	علامہ اقبال لائبریری گراؤنڈ کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، جموں کشمیر	تقریباً 50 لاکھ روپے
24	دسمبر	2021	مالیگاؤں، مہاراشٹر	تقریباً سوا کروڑ روپے
25	جنوری	2023	اسلامیہ کالج (خود مختار)، وانمباڑی، تمل ناڈو	تقریباً 45 لاکھ روپے
26	جنوری	2024	بی کے سی گراؤنڈ ممبئی	تقریباً 90 لاکھ روپے

پر ایک پروقار افتتاحی تقریب کا بھی انعقاد ہوا، جس کی صدارت پروفیسر دھننجے سنگھ نے کی، مہمان خصوصی کے سری نواس راؤ تھے اور مہمانان اعزازی ظہیر قاضی اور مہاراشٹر اردو اکیڈمی کے سی ای او شعیب ہاشمی تھے۔ اس تقریب کا آغاز اسکولی بچیوں نے 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' ترانہ پیش کر کے کیا۔ اس کے بعد طالبات کے ایک گروپ نے تمام مہمانوں کے استقبال میں ایک خوبصورت گیت پیش کیا۔ باضابطہ افتتاحی تقریب کا آغاز معزز مہمانوں نے شمع روشن کر کے کیا اور تمام مہمانوں کا گلدستہ پیش کر کے استقبال کیا گیا۔

استقبالیہ کلمات انجمن اسلام کے صدر ظہیر قاضی نے پیش کیے۔ انھوں نے تمام مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ اردو ایک شیریں زبان ہے جسے بولنے والے تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور یہ ہمیشہ زندہ رہنے والی زبان ہے۔ انھوں نے کہا کہ بھارت سرکار اردو زبان کے فروغ پر خاص توجہ دے رہی ہے اور اس کا نمونہ یہ چھبیسواں اردو کتاب میلہ ہے، ہم ممبئی جیسے اہم شہر میں اس میلے کے انعقاد کے لیے کونسل اور بھارت سرکار کے شکرگزار ہیں۔

ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری کے سری نواس راؤ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اس کتاب میلے میں شریک ہو کر بے پناہ خوشی ہو رہی ہے۔ اگر میں آج کی تقریب میں نہیں آتا، تو ایک تاریخی پروگرام کا حصہ بننے سے محروم رہ جاتا، انھوں نے کہا کہ میں بہت سے کتاب میلوں میں جا چکا ہوں مگر عوام خصوصاً اسکولی بچوں اور بچیوں میں ایسا جوش و خروش کہیں نہیں دیکھا، آئندہ جہاں کہیں جاؤں گا اس میلے کا ضرور تذکرہ کروں گا۔ انھوں نے اردو زبان کی خوبی بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس زبان میں بہت سی زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں اس وجہ سے کسی بھی زبان سے اس زبان میں ترجمہ آسان ہے۔ کتاب میلوں کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس قسم کے میلے علم کی روشنی پھیلانے اور سماج کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، یہ میلہ بھی ہمارے نئے بھارت کی تعمیر میں غیر معمولی کردار ادا کرے گا۔

پروفیسر دھننجے سنگھ نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اردو زبان میں ایک مخصوص قسم کی لطافت اور مٹھاس ہے، جس کی وجہ سے یہ ہندوستان ہی نہیں، پوری دنیا میں پھل پھول رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی کہانی ہمارے پورے دیش کی کہانی ہے، اردو ہندوستان کی زبان ہے اور ہماری ثقافت کا زندہ نمونہ ہے۔ پروفیسر سنگھ نے تحریک آزادی کے دوران اردو کے انقلابی کردار پر بھی مختصراً روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ مادری زبان کا تحفظ نہایت ضروری ہے، جس پر ہماری نئی تعلیمی پالیسی میں بھی خاص زور دیا گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وزیر اعظم نریندر مودی اور وزیر تعلیم دھرمیندر پردھان اردو کے فروغ کے تئیں نہایت سنجیدہ ہیں اور کونسل کا یہ کتاب میلہ بھی اسی کا حصہ ہے۔ ممبئی میں اس میلے کا انعقاد اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ ہندوستان کا بہت اہم تاریخی اور ثقافتی شہر ہے۔ انھوں نے اس کتاب میلے کے انعقاد میں انجمن اسلام کے تعاون کا خصوصی شکریہ ادا کیا اور اس کی تعلیمی و سماجی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ بھارت کی تقدیر کو بنانے میں اس ادارے کا قابل قدر حصہ ہے۔ نئی نسل میں

کتاب کلچر کو فروغ دینے پر زور دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کتابیں پڑھنا اور ان سے جڑنا بہت ضروری ہے، آج کے بچے ملک کے مستقبل ہیں اور یہ کتابیں پڑھیں گے تبھی ملک کی تعمیر میں حصہ لیں گے۔

افتتاحی تقریب کا اہتمام ادارہ 'گل بوٹے' نے کیا تھا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب نے بحسن وخوبی انجام دی اور کونسل کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر و میلہ انچارج اجمل سعید کے اظہار تشکر پر افتتاحی اجلاس کا اختتام عمل میں آیا۔ اس موقعے پر کونسل اور انجمن اسلام کے مختلف ارکان کے علاوہ ممبئی کے درجنوں اسکولوں کے ہزاروں طلبہ و طالبات اور اہل علم و دانش شریک رہے۔ انھوں نے مجموعی طور پر لاکھوں کی کتابیں بھی خریدیں۔ مہمانوں نے مختلف اسکولوں کے ذریعے پیش کی گئی سائنسی نمائش کا بھی معائنہ کیا اور اس اجلاس میں پروفیسر شفیع شیخ کی کتاب 'شان نزول' اور پروفیسر عائشہ سمن کی 'متاع بیت بازی' نامی کتابوں کا اجرا بھی عمل آیا۔ پہلے دن شام شعر ونغمہ کا بھی اہتمام کیا گیا، جس میں معروف غزل سنگر طلعت عزیز نے سامعین کو محظوظ کیا۔

دوسرا دن

میلے کے دوسرے دن بھی بڑی تعداد میں شائقین میلے میں آئے اور اپنی پسندیدہ کتابوں کی خریداری کی۔ اس دن دو اہم پروگراموں کا بھی انعقاد عمل میں آیا جن میں سے ایک 'آن لائن ٹیچنگ اور اردو ذریعہ تعلیم' کے عنوان سے تھا، جس کا اہتمام کونسل و انجمن اسلام کے تعاون سے

آل انڈیا آئیڈیل ٹیچرس اسوسی ایشن نے کیا تھا۔ پروگرام کے آغاز میں آئیٹا کے صدر سید شریف نے آئیٹا کی کارگزاری پیش کی جبکہ ہیڈ ماسٹرز اسوسی ایشن کے سربراہ عبدالرحمٰن نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس کے بعد ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنس کے ریسرچر صداقت فقیہ ملا نے 'ٹکنالوجی مربوط تعلیم و تعلم: امکانات اور زاویے' کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ موجودہ صدی میں ہم ٹکنالوجی سے گھرے ہوئے ہیں، ایسے میں یہ ہمیں طے کرنا ہے کہ ہم ٹکنالوجی کو تعلیم و تعلم کے لیے مثبت طریقے سے کیسے استعمال کرسکتے ہیں، اس حوالے سے انھوں نے مختلف کارگر طریقوں کی بھی نشان دہی کی۔ رئیس ہائی اسکول اینڈ جونیر کالج، بھیونڈی کے پرنسپل ضیاء الرحمٰن انصاری نے اپنی تقریر میں آن لائن تعلیم کے سلسلے میں کچھ اصولی باتوں پر توجہ دلائی اور خصوصا اردو زبان میں آن لائن تعلیم کی گزشتہ پچیس سالہ تاریخ اور موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالی۔ آئن لائن ٹیچنگ میں تناؤ پر قابو پانے کے طریقوں پر ڈاکٹر آصف صدیقی نے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ اسٹریس کو کم کرنے کے لیے روزانہ ورزش کا معمول ہونا چاہیے اور اپنے آپ کو جسمانی سرگرمیوں میں بھی مشغول رکھنا چاہیے۔ مہاراشٹر سرکار کے محکمہ تعلیم میں اعلیٰ افسر بھنڈارے جی نے بھی اس موقعے پر اظہار خیال کیا اور نئی نسل کے لیے کتابوں کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے والدین اور سرپرستوں سے کہا کہ بچوں کو اپنی نگرانی میں جدید ٹکنالوجی کے استعمال کا طریقہ سکھائیں۔

پروگرام کی صدارت کر رہے انڈین سینٹر آف اسلامک فائنانس دہلی کے جنرل سکریٹری ایچ عبدالرقیب نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہمیں نفع بخش علوم کے حصول کا ہر طریقہ اپنانا چاہیے اور دور جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ اس موقعے پر مہاراشٹر کے مختلف اسکولوں کے تیس سے زائد اساتذہ کو کورونا اور لاک ڈاؤن کے دوران جدید ٹکنالوجی استعمال کر کے تعلیم و تدریس کا فریضہ انجام دینے پر اعزازات سے بھی نوازا گیا، اس مجلس کی نظامت فہیم مومن نے کی۔

دوسرا سیشن 'علما کا اردو ادب' کے عنوان سے منعقد ہوا جس کا اہتمام ممبئی کے معروف تعلیمی ادارے مرکز المعارف نے کیا تھا۔ اس سیشن کی نظامت مفتی جسیم الدین قاسمی نے کی۔ مذاکرے میں حصہ لیتے ہوئے مولانا برہان الدین قاسمی نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو زبان وادب کے فروغ میں جہاں عصری دانش گاہوں کے تعلیم یافتہ ادیبوں اور شاعروں کا کردار ہے، وہیں مدارس کے

فضلا نے بھی اردو ادب کی اہم خدمات انجام دی ہیں، انھوں نے اس حوالے سے درجنوں ایسے علما کا ذکر کیا جنھوں نے اردو ادب میں اپنی تصانیف کے ذریعے قابل قدر اضافہ کیا ہے۔مولانا انیس اشرفی نے کہا کہ اردو کی پرورش اور اس کی نشو ونما میں بڑا حصہ علما کا ہے، جن دوسرے لوگوں نے اس زبان کی خدمت کی ہے ان کا بھی کسی نہ کسی حوالے سے علما یا مدارس سے رابطہ رہا ہے۔

مولانا نظام الدین قمرالدین نے کہا کہ اردو کے تحفظ اور فروغ میں علما کی حصے داری کے تعلق سے سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ ان حضرات نے وقت آنے پر اردو میں لکھنے پڑھنے کو دینی فریضہ جانا ہے۔مولانا عبدالمعید مدنی نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو زبان کی علمی وعملی تشکیل میں علما کا ہاتھ رہا ہے، لسانیات، قواعد، نظم ونثر کی اصناف، عروض وآہنگ حتی کہ اس کے تلفظ واملا کو طے کرنے میں بھی علما کی کوششیں شامل ہیں۔مولانا سید روح ظفر نے اپنے خطاب میں کہا کہ علما اور اردو ادب ایک نہایت وسیع الذیل موضوع ہے، جس کا مختصر وقت میں کما حقہ احاطہ نہیں کیا جا سکتا، ہمارے علما نے ایک بہت بڑا تحریری و تصنیفی سرمایہ اردو میں مہیا کیا ہے، جس سے یقیناً اردو زبان کا بھی فروغ ہو رہا ہے۔حافظ عبدالقدوس شاکر حکیمی نے کہا کہ اردو کی ابتدا سے ہی علما اس زبان کی خدمت کر رہے ہیں اور آج بھی ان کا کردار اس حوالے سے نہایت روشن ہے۔مولانا حکیم محمود دریابادی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کی بنیادوں میں علما کی مخلصانہ کاوشیں شامل ہیں، جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔انھوں نے قومی اردو کونسل اور میلے کے دگر منتظمین کا شکریہ بھی ادا کیا کہ انھوں نے ایسے اہم موضوع پر مذاکرے کا انعقاد کیا جسے عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں ممبئی کے اہل علم موجود رہے اور کچھ لوگوں نے پروگرام کے تعلق سے اپنے تاثرات بھی پیش کیے۔مولانا عتیق الرحمٰن قاسمی کے اظہار تشکر پر اس محفل مذاکرہ کا اختتام عمل میں آیا۔

تیسرے پروگرام میں کردار آرٹ اکیڈمی نے معروف شاعر ساحر لدھیانوی کی زندگی پر مبنی داستانِ ساحر پیش کی، جسے سامعین نے خوب پسند کیا۔اس کے اسکرپٹ ڈزائنر، ہدایت کار اور داستان گو اقبال نیازی تھے۔

تیسرا دن

تیسرے دن بھی میلے کے آڈیٹوریم میں متعدد ثقافتی وعلمی پروگراموں اور مذاکروں کا انعقاد ہوا۔صبح کے سیشن میں کوہ نور میوزک اکیڈمی کے زیر اہتمام ممبئی کے مختلف اسکولوں کے طلبہ وطالبات کی تیرہ ٹیموں کے درمیان حب الوطنی پر مبنی گیتوں کی پیش کش کا مقابلہ ہوا، جس میں کامیاب ہونے والی ٹیموں کو گراں قدر انعامات سے نوازا گیا۔حکم کے فرائض ہمایوں کبیر، ابوفیصل شفیق اور ڈاکٹر شہروز خاور نے انجام دیے۔اس سیشن میں کوہ نور میوزک اکیڈمی مالیگاؤں کی ٹیم نے قومی اردو کونسل کا نہایت خوب صورت ترانہ پیش کیا، جس کی کمپوزنگ ابوفیصل شفیق نے کی تھی، یہ ترانہ معروف شاعر عبیداعظم اعظمی کا تخلیق کردہ ہے۔

اس ٹیم نے ایک گیت اردو زبان پر بھی پیش کیا، یہ گیت بھی عبید اعظم اعظمی کا تحریر کردہ ہے۔

دوسرے سیشن میں اردو جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام 'اردو صحافت : کل اور آج کل' کے عنوان سے سمینار کا انعقاد ہوا، جس کی صدارت سینئر صحافی اور دانشور عبدالسمیع بوبیرے نے کی اور نظامت کے فرائض روزنامہ ہندوستان کے ایڈیٹر سرفراز آرزو نے انجام دیے۔ مذاکرے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ممبئی اردو نیوز کے ایڈیٹر شکیل رشید نے اردو صحافت کی تعلیم پر گفتگو کی اور کہا کہ تعلیمی اداروں میں اردو صحافت کی تعلیم و تربیت کا معقول اور نتیجہ خیز نظم نہیں ہے، جس پر توجہ دینے اور صحافت کے نصاب کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔

ای ٹی وی بھارت کے شاہد انصاری نے موبائل جرنلزم پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت میں بہت مواقع ہیں، البتہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم پیشہ ورانہ انداز میں اردو صحافت کو اپنائیں اور برتیں۔ یو این آئی کے اعجاز انصاری نے اردو صحافت کے فروغ میں نیوز ایجنسیوں کے کردار پر گفتگو کی۔ جاوید جمال الدین نے اردو صحافت کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالی۔ ہارون افروز نے اردو صحافت اور صحتِ زبان پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت اور صحتِ زبان لازم و ملزوم ہیں؛ کیوں کہ اردو صحافت محض ایک پیشہ نہیں، علم و فن ہے اور اسی وجہ سے ماضی سے لے کر اب تک اردو صحافت صحتِ زبان کے اعتبار سے دوسری زبانوں کی صحافت سے بہتر رہی ہے۔ موجودہ دور کے صحافیوں کو بھی صحت زبان پر خاص توجہ دینی چاہیے۔

روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر شاہد لطیف نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو صحافت اور اردو زبان کو آج سب سے بڑا خطرہ یہ درپیش ہے کہ اردو الفاظ کو ہندیانے کی کوششیں ہو رہی ہیں اور اس کی وجہ سے بہت سے غلط الفاظ رائج ہو رہے ہیں، اس پر اردو والوں کو متنبہ رہنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری صحافت تبھی باقی رہ سکتی ہے اور تبھی وہ مسلسل ترقی پذیر ہوگی، جب ہم اپنی صحافت کے ذریعے قاری کی امنگوں اور توقعات کو پورا کریں۔

صدر جلسہ عبدالسمیع بوبیرے نے کہا کہ آج کے پروگرام کے تمام مقررین نے اپنے اپنے موضوع سے انصاف کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو صحافت کا ماضی روشن ہے، البتہ موجودہ دور میں اسے مختلف قسم کے چیلنجز کا سامنا ہے، جن کا مقابلہ کرکے ہی ہم اپنی صحافت کو عہد حاضر سے ہم آہنگ کر سکتے ہیں۔

تیسرا پروگرام کاوش فاؤنڈیشن کے ذریعے منعقد کیا گیا، جو سول سروسز اگزام کی تیاریوں کے سلسلے میں رہنمائی پر مبنی تھا، اس حوالے سے سابق آئی اے ایس افسر جناب شہزاد حسین نے خطاب کیا اور اہم نکات بیان کیے۔ اس موقعے پر مختلف مسابقہ جاتی امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے نوجوانوں نے بھی اپنے تجربات شیئر کیے۔

چوتھا دن

چوتھے دن جہاں انفرادی طور پر شائقینِ کتب نے

کثیر تعداد میں کتابوں کی خریداری کی، وہیں ممبئی اور مضافات کی متعدد لائبریریوں نے لاکھوں کی کتابیں خریدیں۔ اسی طرح اس دن بھی پروگراموں کے تین سیشنز ہوئے، جن کا اہتمام ادبی تنظیم اردو کارواں نے کیا تھا۔ پہلے سیشن میں اردو اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے عنوان سے مجلس مذاکرہ کا انعقاد اردو چینل کے ذریعے کیا گیا، جس کی نظامت معروف شاعر ڈاکٹر قمر صدیقی نے کی۔

مذاکرے میں اظہار خیال کرتے ہوئے معروف اے آئی پلیٹ فارم چیٹ جی پی ٹی سے منسلک عاصم سید نے آرٹیفیشیل انٹیلیجنس (اے آئی) کے حوالے سے گفتگو کی، انھوں نے تفصیل سے اس کا تعارف کروایا اور اس کے مفید استعمال کے طریقوں کی نشاندہی کی۔ روزنامہ انقلاب سے وابستہ شاہنواز خان نے اردو صحافت پر انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اثرات کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس کی وجہ سے اردو صحافت کو بڑی آسانیاں فراہم ہوئی ہیں، جیسے اخباروں کی کتابت کے بجائے ٹائپنگ کا سلسلہ شروع ہوا، خبروں کے حصول کے ذرائع بڑھ گئے، خبروں کا ترجمہ کرنا آسان ہوگیا اور اسی طرح کی دوسری سہولیات بھی فراہم ہوئی ہیں۔ بچوں کے رسالے 'گل بوٹے' کے ایڈیٹر فاروق سید نے ٹکنالوجی کا استعمال کر کے ادبی و تعلیمی سرگرمیاں انجام دینے پر زور دیا۔ معروف افسانہ نگار انور مرزا نے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ادب پر اثرات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح دوسرے شعبوں میں ٹکنالوجی کی وجہ سے بڑی تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں، اسی طرح ادب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے ہیں؛ چنانچہ اب ہمارے ادبا جہاں ڈیجیٹل لائبریری سے براہ راست فائدہ اٹھا رہے ہیں، وہیں کاغذ قلم کی مدد سے لکھنے کی بجائے کمپیوٹر اور موبائل کے ذریعے وہ ادب بھی تخلیق کر رہے ہیں۔ اردو کارواں کے سربراہ فرید خان کے شکریے کے ساتھ اس سیشن کا اختتام ہوا۔

دوسرا سیشن 'اردو کی تحریکیں اور ممبئی' کے عنوان سے منعقد ہوا، جس کی صدارت سینئر صحافی و شاعر ندیم صدیقی نے کی اور ڈاکٹر سلیم خان مہمان اعزازی تھے۔ اس پروگرام کی میزبانی عوامی ادارہ ممبئی اور اردو گگن سنستھا ممبئی نے کی، جبکہ پروگرام کی نظامت مشیر احمد انصاری نے کی۔

مذاکرے میں اظہار خیال کرتے ہوئے عبدالسمیع بوبیرے نے ممبئی کی اردو تحریکوں اور ممبئی میں رہنے والے اہم شعرا و ادبا کی سرگرمیوں اور ان کے سماجی اثرات کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر ماجد قاضی نے کہا کہ ممبئی ہر دور میں ادبی اہمیت کا حامل شہر رہا ہے، خصوصا ترقی پسند تحریک سے وابستہ چوٹی کے ادبا و شعرا کا مرکز یہ شہر رہا ہے، اس تحریک سے وابستہ ادیبوں نے بہترین افسانے اسی شہر میں رہ کر لکھے، بعد میں جدیدیت سے وابستہ نوجوانوں کا اہم مرکز بھی یہ شہر رہا ہے اور اب بھی یہاں قومی شہرت کے حامل ادبا موجود ہیں۔ اعجاز ہندی نے ممبئی کی موجودہ ادبی تنظیموں کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے اردو کے فروغ میں انجمن اسلام اور اس کے اسکولوں کے خصوصی کردار پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر سلیم خان نے اردو کی مختلف ادبی تحریکوں کے پس منظر اور ان کے اہداف و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کوئی بھی تحریک مقصد سے خالی نہیں ہوتی، البتہ اس میں توازن ضروری ہے، ہماری اردو تحریکیں مختلف زمانوں میں پیدا ہوئیں اور ایک عرصے کے بعد ان کے اثرات اس لیے زائل ہوگئے کہ ان کے طرز فکر و تخلیق میں توازن قائم نہ رہ سکا۔ ڈاکٹر شفیع شیخ نے انجمن اسلام کی تعلیمی و ادبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور ان کی مختلف جہتوں کو اجاگر کیا۔ صدر مجلس ندیم

صدیقی نے اپنے خطاب میں ممبئی کی ادبی تحریکوں پر مختصراً گفتگو کرتے ہوئے روایت پسندی، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے اثرات اور دائرۂ عمل کا ذکر کیا۔

تیسرا اہم پروگرام مقامی شاعروں کے مشاعرے کا تھا، جس میں ممبئی اور مہاراشٹر کے اہم شاعروں نے شرکت کی۔ اس مشاعرے کی صدارت ممبئی کے سینئر شاعر احمد وصی نے کی، جبکہ ڈاکٹر شعور اعظمی، ندیم صدیقی، پروفیسر عائشہ سمن، سدھارتھ شانڈلیہ، فرحان حنیف وارثی، نظر بجنوری، یوسف دیوان، کاشف سید، احسن عثمانی، مقصود آفاق، توصیف کاتب اور مادھو بروے نور نے سامعین کو اپنے کلام سے نوازا۔

پانچواں دن

میلے کے پانچویں دن کے پہلے سیشن میں 'غیر اردو داں حضرات میں اردو کی ترغیب' کے عنوان سے محفل مذاکرہ کا انعقاد کیا گیا۔ اس کا اہتمام ہماری پرتھا فاؤنڈیشن کے ذریعے کیا گیا تھا، جس کی نظامت معروف شاعر سدھارتھ شانڈلیہ نے کی۔

نریندر بنڈابے نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میری مادری زبان گوکہ اردو نہیں ہے، مگر شروع سے میرا تعلق سنیما کے شعبے سے رہا ہے، جس کی وجہ سے میں بچپن سے اردو زبان سے جڑا ہوا ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ آج مراٹھی کے کئی ایسے ادیب ہیں، جنھوں نے اردو سیکھی اور اب وہ اردو ادب کے ذخیرے کو مراٹھی میں منتقل کر رہے ہیں، اس حوالے سے انھوں نے متعدد مراٹھی ادیبوں کے تراجم وتخلیقات کا ذکر کیا۔ مادھو بروے نور نے اردو ادب کی تاریخ پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں ایک بہت طویل فہرست ہے غیر مسلم اردو ادیبوں کی، جنھوں نے اردو کی تمام اصناف کے فروغ میں اپنا غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ بزرگ شاعر ساگر ترپاٹھی نے کہا کہ اردو گنگا جمنی تہذیب کی نمائندہ زبان ہے، جس میں ہندوستان کی تمام زبانوں کے الفاظ ومحاورات پائے جاتے ہیں۔ اس میں ستر فیصد سے زائد الفاظ سنسکرت کے ہیں اور یہ خالص ہندوستانی الاصل زبان ہے، اردو محبت کی زبان ہے، تہذیب وتمدن کی زبان ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کا مستقبل جو بھی ہو، مگر اردو کا مستقبل بہت تابناک ہے۔

دوسرا سیشن 'اردو افسانہ نئی صدی میں' کے عنوان سے بزم ریختہ فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا، جس کی نظامت رسالہ 'تکمیل' کے ایڈیٹر عامر اصغر نے کی جبکہ صدارت سینئر افسانہ نگار محمد رفیع انصاری نے کی۔

اس مجلس میں ایم مبین نے اردو افسانے کے موضوعات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو افسانے کو کبھی موضوعاتی بحران کا سامنا نہیں رہا، ہماری ادبی تحریکوں اور معاشرتی ضروریات و مسائل نے افسانہ نگاروں کو بہت سے موضوعات دیے، جنھیں ہر دور کے افسانہ نگاروں نے بڑی خوبی سے برتا ہے اور آج کے افسانہ نگار بھی موجودہ صدی کے مسائل کی عکاسی کر رہے ہیں۔ اشتیاق سعید نے کہا کہ انفارمیشن ٹکنالوجی نے آج کے قاری کی سوچ کو بہت وسیع کردیا ہے، مگر ہمارے یہاں افسانے روایتی انداز میں ہی لکھے جا رہے ہیں، جس کی وجہ سے قارئین ان پر توجہ نہیں دیتے۔ صادقہ نواب سحر نے اردو افسانہ نگاری میں خواتین کی شمولیت پر گفتگو کرتے ہوئے ان کو درپیش سماجی مسائل پر بھی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ آج کی خواتین اپنے خیالات کا اپنے انداز میں اظہار کر رہی ہیں اور نئی نسل میں کئی خواتین افسانہ نگار سامنے آ رہی ہیں۔ وسیم عقیل شاہ نے اردو افسانہ نگاری میں نئی نسل کی نمائندگی کے حوالے سے گفتگو کی۔ محتشم اکبر نے الیکٹرانک پلیٹ فارمز پر افسانہ نگاری کے حوالے سے اظہار خیال کیا اور کہا کہ انٹرنیٹ اور اینڈرائڈ موبائل کی سہولت نے بڑی آسانیاں پیدا کردی ہیں اور

مختلف سوشل میڈیا گروپس پر افسانے شائع ہو رہے ہیں اور ان پر بڑے بڑے فکشن نگار اپنی آرا کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ مہمان خصوصی رحمٰن عباس نے اردو فکشن کی موجودہ صورت حال پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ آج مہاراشٹر اور ممبئی اردو کا مرکز ہے، البتہ ہمیں کچھ چیزوں پر خصوصی توجہ دینے اور نئے تخلیق کاروں کی تربیت کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ تخلیق کاروں کے لیے مسلسل جدوجہد بھی ضروری ہے، تخلیق ایک طویل سفر ہے اور یہ ریاضت چاہتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے اردو فکشن کی جغرافیائی توسیع کے لیے اچھی تخلیقات کے ترجمے پر بھی زور دیا۔ صدارتی خطاب میں محمد رفیع انصاری نے کہا کہ موجودہ دور میں افسانہ نگاروں کو سچ لکھنا چاہیے اور واقعہ نگاری پر خاص توجہ دینی چاہیے۔

تیسرے سیشن میں رئیس ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج بھیونڈی کے زیر اہتمام طلبہ و طالبات کے مابین انٹر جونیئر کالج بیت بازی کا پروگرام ہوا۔ جس کی صدارت مومن جان عالم رہبر نے کی، مہمان خصوصی عرفان جعفری رہے، اور مشتاق رضا بولنجکر، عبدالملک مومن اور عبید اعظم اعظمی مہمانان اعزازی کی حیثیت سے شریک پروگرام رہے۔ نظامت شمیم اقبال نے کی۔ اس پروگرام میں پانچ اسکولوں کی ٹیموں نے حصہ لیا، جن میں انجمن اسلام جم خانہ گرلس سکول، رئیس ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج بھیونڈی، نور الاسلام ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج گوونڈی، الحمد جونیئر کالج بھیونڈی اور صلاح الدین ایوبی میموریل جونیئر کالج کے طلبہ و طالبات شامل تھے۔ بیت بازی کے اس خوب صورت پروگرام میں انصاری ثنا جعفری کو بہترین شعر خوانی کا انعام ملا، جبکہ تیسری پوزیشن نور الاسلام گوونڈی، دوسری پوزیشن الحمد جونیئر کالج بھیونڈی اور اول پوزیشن رئیس ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج بھیونڈی کی ٹیم نے حاصل کی۔ بیت بازی کے بعد ایک تمثیلی مشاعرے (برائے اساتذہ) کا انعقاد کیا گیا، جس سے کثیر تعداد میں سامعین محظوظ ہوئے۔

چھٹا دن

میلے کے چھٹے دن کے پروگراموں کی میزبانی آئیڈیل فاؤنڈیشن کے تعلیمی شعبے کوکن ٹیلنٹ فورم نے کی اور پہلے سیشن میں اسکولی طلبہ و طالبات کے مابین

ڈبیٹ کا پروگرام ہوا، جس میں جج کے فرائض امین مہمتولے، ضیاء الدین شیخ اور جاوید مقصود نے انجام دیے۔ کمال مانڈلیکر اور داؤد چوگلے نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ علی ایم شمسی نے صدارت کی۔ مفتی سفیان ونو اور یاسین دلوی مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شریک پروگرام تھے۔ یہ مباحثہ مصنوعی ذہانت کے فوائد و نقصانات کے موضوع پر تھا، جس میں چار چار طلبہ و طالبات کے دو گروپوں نے حصہ لیا اور تین راؤنڈ میں ایک گروپ نے اے آئی کی حمایت میں، جبکہ دوسرے گروپ نے اس کی مخالفت میں تقریریں کیں۔ اس مباحثے میں پہلی پوزیشن آمنہ عثمان شیخ، دوسری پوزیشن حافظ محمد اور تیسری پوزیشن ملک آفرین شکیل نے حاصل کی۔ کمال مانڈلیکر کے اظہار تشکر کے ساتھ اس پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔

اردو فارسی اور عربی تدریس کی صورت حال کے حوالے سے دوسرے سیشن کا انعقاد ہوا۔ جس کا اہتمام شعبۂ اردو، فارسی و عربی ممبئی یونیورسٹی نے کیا۔ اس سیشن کی صدارت پروفیسر انور پاشا نے کی اور ڈاکٹر تابش خان نے نظامت کی۔ مہمانان خصوصی پروفیسر اخلاق احمد آہن، پروفیسر شفیع شیخ اور مہمانان اعزازی ڈاکٹر عبداللہ امتیاز اور ڈاکٹر جمشید احمد ندوی رہے۔ ڈاکٹر جمشید ندوی نے ہندوستان، خصوصاً ممبئی میں عربی کی تدریسی صورت حال پر گفتگو کی، انھوں نے کہا کہ یونیورسٹی کی سطح پر تو عربی کی تدریسی صورت حال بہتر ہے اور ملک بھر میں پچاس سے زائد یونیورسٹیز میں عربی کی اعلیٰ تعلیم کا نظم ہے، مگر اسکول کی سطح پر حالات اتنے اچھے نہیں ہیں، جن پر توجہ کی ضرورت ہے۔ پروفیسر شفیع شیخ نے ممبئی یونیورسٹی میں اپنے 35 سالہ

تدریسی تجربات کی روشنی میں غیر مادری زبان کی تحصیل و تدریس کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا دلچسپ انداز میں جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر اخلاق احمد آہن نے ہندوستان میں فارسی زبان کی تدریسی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ہمارے یہاں عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ فارسی بیرونی زبان ہے، حالانکہ یہ درست نہیں ہے، یہ ہمارے برصغیر کی ہی زبان ہے جس کی کئی سو سالہ تاریخ ہے۔ عہد وسطی میں فارسی ایک عالمی سطح کی زبان تھی اور ہمارے یہاں کی تقریباً سبھی زبانوں کو بنانے سنوارنے میں اس کا حصہ رہا ہے۔ اس کی اصطلاحات ومحاورات ساری ہندوستانی زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی علمی روایت کو عالمی پیمانے پر تعارف اسی زبان سے حاصل ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ فارسی زبان کی تعلیم کو ہمیشہ سے اہمیت حاصل رہی ہے اور آج بھی 150 یونیورسٹیوں میں اس کی تعلیم ہو رہی ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی میں بھی فارسی کو ایک کلاسیکی ہندوستانی زبان کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے اور اسکولوں میں اس کی تدریس پر خصوصی توجہ دیے جانے پر زور دیا جا رہا ہے۔ پروفیسر آہن نے کہا کہ اردو کے بڑے شعرا کو بغیر فارسی جانے ہم نہ سمجھ سکتے ہیں، نہ اچھی طرح پڑھ سکتے ہیں۔ اس زبان میں نہ صرف اسلامیات بلکہ سناتن دھرم، سکھ دھرم اور دیگر مذاہب کا بھی بڑا تصنیفی سرمایہ موجود ہے اس لیے اس کی تعلیم و تدریس کی غیر معمولی اہمیت ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ ڈاکٹر عبداللہ امتیاز نے اردو زبان کو تدریسی سطح پر درپیش مسائل کی جانب توجہ دلائی اور کہا کہ ہمیں اپنی مادری زبانوں کی حفاظت کرنی ہے تو نئی نسل کو اردو کی تعلیم دینی ہوگی۔ پروفیسر انور پاشا نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اردو ہی نہیں، ہر زبان کی تدریس کا مسئلہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، انھوں نے تعلیم کو معیشت سے جوڑنے کی ضرورت پر بھی زور دیا اور کہا کہ اگر کسی زبان کا معیشت سے رشتہ کٹتا ہے تو اس کا منفی اثر اس کی تعلیم پر بھی پڑتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اردو کے ساتھ دوسرے تعلیمی شعبوں میں بھی سنجیدہ جد و جہد کرنی چاہیے؛ تاکہ ہم ہر شعبے میں اعلی کارکردگی کا مظاہرہ کرسکیں۔ آخر میں کتاب میلے کے مقامی کوآرڈینیٹر امتیاز خلیل نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مہاراشٹر میں اردو کی بہتر صورت حال کے حوالے سے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے مراٹھی بولنے والے بھی اردو کو اپنی دشمن زبان نہیں سمجھتے، بلکہ اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے اس زبان کو ہر اعتبار سے پھلنے پھولنے میں مدد ملی ہے۔ اس موقعے پر ممبئی یونیورسٹی اور مختلف اسکولوں، کالجز کے طلبہ و اساتذہ کی بڑی تعداد موجود رہی۔

تیسرے سیشن میں اسکولی طلبہ و طالبات کے درمیان غزل سرائی کا پرگرام ہوا، اس کی میزبانی 8 ڈی ایڈ کالجز نے مشترکہ طور پر کی، جس کی نگراں پرنسپل سائرہ خان (آرسی ڈی ایڈ کالج آف ایجوکیشن امام باڑہ) تھیں۔ 13 کالجوں کے طلبہ نے معروف شعرا کا کلام پیش کیا۔ حکم کے فرائض وجاہت حسین خان، عبداللہ زکریا اور ہمایوں خان نے انجام دیے۔ پروگرام کی صدارت معروف گلوکارہ سربونی چودھری نے کی، مہمان خصوصی ڈاکٹر مسرت صاحب علی تھیں اور نظامت کے فرائض حنیف شیخ نے انجام دیے۔ اس پروگرام میں کئی ڈی ایڈ کالج کے پرنسپل صاحبان نے شرکت کی۔ چوتھے سیشن میں ادبی چوپال کے تحت صوفی سنگیت کا اہتمام کیا گیا، جس میں ریحان خان اور ہمایوں کبیر نے سامعین کو اپنی خوبصورت گلوکاری سے محظوظ کیا۔

ساتواں دن

کتاب میلے کا ساتواں دن خواتین کے نام تھا۔ اس دن جہاں اسکول و کالجز کی طالبات و اساتذہ اور اہل علم و دانش نے ہزاروں کی تعداد میں کتاب میلے میں شریک ہوکر اپنی پسندیدہ کتابیں خریدیں، وہیں پروگراموں

کے بھی دو اہم سیشنز ہوئے۔ پہلے سیشن میں بزم نسواں کے زیر اہتمام تانیثیت اور خواتین کی تعلیم پر پروگرام کا انعقاد ہوا، جس کی صدارت میجر ڈاکٹر افسر فاروقی نے کی اور انیسہ انصاری نے نظامت کی۔ کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر محترمہ شمع کوثر یزدانی مہمان خصوصی تھیں۔

پروفیسر عائشہ سمن نے اردو میں تانیثی ادب کے پس منظر اور تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ایک زمانے میں ہمارے یہاں خواتین کو تعلیم حاصل کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی، مگر دھیرے دھیرے حالات بدلے اور خواتین نے اپنے آپ کو پہچانا، چنانچہ آج مختلف شعبوں میں وہ اعلی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ محترمہ جویریہ قاضی نے کہا کہ ہندوستان میں خواتین کی تعلیم کا بہت قدیم سلسلہ ہے، جو مغرب کے نظام تعلیم کے عام ہونے سے بھی پہلے موجود تھا، موہن جوداڑو اور ہڑپا کی تہذیب پر ہمیں فخر ہے اور یہ تہذیب یقیناً تعلیم کے نتیجے میں ہی پیدا ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم اور تہذیب کی روشنی میں توازن ضروری ہے، نہ اتنی تیز ہو کہ آنکھیں چندھیا جائیں اور نہ ایسی ہلکی کہ کچھ نظر ہی نہ آئے، اپنی فکر اور عمل میں توازن کے بغیر ہم حقیقی معنوں میں ترقی نہیں حاصل کر سکتے۔ محترمہ سامیہ شاہ نے اپنے خطاب میں کہا کہ اسلام نے مرد و عورت دونوں کو تعلیم کے حصول کی تلقین کی ہے، مگر ہمارے معاشرے میں خواتین کی تعلیم پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی، ہم اپنے معاشرے کو اسی وقت تک ترقیات سے ہم کنار کر سکتے ہیں، جب مرد و عورت دونوں میں تعلیم کو عام کیا جائے۔

کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر محترمہ شمع کوثر یزدانی نے اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا کہ قومی اردو کونسل جہاں عمومی طور پر ادب اور زبان کے فروغ پر توجہ دے رہی ہے وہیں کمپیوٹر، کیلی گرافی، پیپر میشی، عربی، اردو، فارسی سرٹیفکیٹ و ڈپلوما کے کورسز سے لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کی بھی بڑی تعداد استفادہ کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ خواتین دنیا کونسل کا ایک اہم رسالہ ہے، جس میں صرف خواتین قلم کاروں کے مضامین وتخلیقات یا خواتین تخلیق کاروں پر تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔

محترمہ افسر فاروقی نے صدارتی خطاب میں سابقہ مقررین کی تقریروں پر اپنی رائے دی اور کہا کہ ان مقررین نے اپنے اپنے موضوع پر اچھی گفتگو کی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ آج کے دور میں ہمیں لڑکی اور لڑکا دونوں کو تعلیم یافتہ بنانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے نئی نسل میں اعتماد کی کمی پر خصوصی گفتگو کی اور کہا کہ ہمیں اپنا اعتماد ہمیشہ بہت بلند رکھنا چاہیے اور احساس کمتری سے بچنا چاہیے۔

دوسرے سیشن میں انجمن گرلز بورڈ کے زیر اہتمام شام نسواں کا انعقاد کیا گیا، جس میں مختلف اسکولوں اور کالجوں کی طالبات نے ثقافتی پروگرام پیش کیے، جن میں نظمیں، قوالی، غزلیں، ڈرامہ، لطیفہ، مونو ایکٹنگ اور دیش بھکتی گیت شامل تھے۔ اس سیشن کی نظامت محترمہ آسیہ شیخ و محترمہ فردوس شیخ نے کی۔ اس موقعے پر درجنوں اسکولوں اور کالجوں کے سیکڑوں طلبہ طالبات کے علاوہ اساتذہ ودانشوران موجود رہے۔

آٹھواں دن

قومی اردو کتاب میلے کا آٹھواں دن خاصا پر رونق رہا، آج جہاں ممبئی و اطراف کے درجنوں اسکولوں کے ہزاروں طلبہ وطالبات، اساتذہ اور شائقین علم وادب نے لاکھوں کی کتابیں خریدیں، وہیں حسبِ معمول کئی ثقافتی پروگرام بھی ہوئے۔

آٹھویں دن کے پہلے سیشن میں ممبئی میونسپل اردو اسکول کے طلبہ وطالبات کے مابین مونو ایکٹنگ مقابلے کا انعقاد ہوا، جس کا اہتمام بی ایم سی ٹیچرز ایسوسی ایشن نے کیا تھا۔ اس پروگرام کی صدارت معروف ڈراما نگار آفتاب حسنین نے کی۔ راجو امیر تردی، مجیب خان اور شاہ مختار احمد مہمانان خصوصی تھے۔ ناصر علی شیخ، خان عبداللہ عبدالکریم اور ڈاکٹر میمونہ شیخ نے حکم کے فرائض انجام دیے اور ڈاکٹر عمران امین نے نظامت کی۔

دوسرے سیشن میں تنظیم والدین ممبرا کے زیر اہتمام 'اردو ذریعۂ تعلیم ایک اہم فریضہ' کے عنوان سے مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس مجلس کی صدارت دہلی اردو اکیڈمی کے سکریٹری جناب احسن عابد نے کی۔ مہمانان اعزازی کی حیثیت سے جناب نور محمد عنبر، جناب عثمان شیخانی اور جناب سید زاہد علی شریک رہے، جبکہ مہمانان خصوصی جناب امتیاز خلیل اور جناب اجمل سعید تھے۔ پروفیسر عبدالرحمٰن شیخ نے مذاکرے میں حصہ لیتے ہوئے فروغ اردو کے مختلف ذرائع مثلاً کتابوں، پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے کردار پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اردو کی ترویج و اشاعت میں تعلیم کے ساتھ ان ذرائع نے ہر دور میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو کے فروغ میں مشاعروں اور اردو اسکولوں کے رول پر بھی گفتگو کی۔

پروفیسر عبدالماجد انصاری نے اعداد وشمار کی روشنی میں ہندوستان اور عالم گیر سطح پر اردو زبان کی صورت حال کا جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے زبان کے فروغ میں مؤثر ثابت ہونے والے بارہ مختلف عناصر کی نشان دہی کی اور کہا کہ ان میں سے ہر عنصر کی فروغ زبان میں اپنی اہمیت ہے۔ محترمہ صبا پٹیل نے مادری زبان میں تعلیم کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بچوں کو ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینا اس لیے ضروری ہے کہ اس میں بچہ چیزوں کو اچھی طرح سمجھتا بھی ہے اور اس زبان میں اپنے خیالات کا اظہار بھی بخوبی کر سکتا ہے۔ اسی وجہ سے نئی تعلیمی پالیسی میں بھی مادری زبان میں ابتدائی تعلیم پر زور دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے اردو زبان کے فروغ میں مسلم ادبا وشعرا کے ساتھ غیر مسلم ادیبوں کی حصے داری پر روشنی ڈالی۔ مہمان اعزازی جناب نور محمد عنبر نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہماری زبان ہمارے تہذیبی ورثے کی امین ہے اور ہمیں اسے پڑھنے، لکھنے اور بولنے میں کسی بھی جھجک کی بجائے فخر کا احساس ہونا چاہیے۔ قابل ذکر ہے کہ انھوں نے اس میلے سے ایک لاکھ روپے کی کتابیں بھی خریدیں۔ جناب عثمان شیخانی نے کہا کہ قومی اردو کونسل اس لائق ستائش ومبارکباد ہے، جس نے اس عظیم اردو کتاب میلے کا انعقاد کیا۔ انھوں نے کہا کہ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ اردو اسکول پسماندہ ہوتے ہیں، مگر ایسا نہیں ہے،

مہاراشٹر اور خصوصاً ممبئی میں ایسے اردو میڈیم اسکولوں کی کمی نہیں جو اعلیٰ انفراسٹرکچر سے لیس ہیں اور بہت بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ جناب سید زاہد علی نے اپنے تاثرات میں کہا کہ اردو کے تحفظ کے لیے اس کے رسم الخط کا تحفظ ضروری ہے، اسی طرح اردو کے رسائل و مجلّات اور اخباروں کے مطالعے کا بھی چلن عام ہونا چاہیے، یہ اردو زبان کے تحفظ اور فروغ دونوں کے لیے اہم ہے۔

دہلی اردو اکیڈمی کے سکریٹری جناب احسن عابد نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اس کتاب میلے میں آکر اور پروگرام میں شرکت کر کے مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے، اس کامیاب کتاب میلے کے انعقاد کے لیے میں قومی اردو کونسل اور انجمن اسلام کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اتنی بڑی تعداد میں آنے والے شائقین بھی قابل مبارکباد ہیں۔ اس مذاکرے میں مقررین نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ قابل قدر ہیں اور ان سے فروغ اردو کے سلسلے میں یقیناً مدد ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہندوستان کی نہایت مقبول زبان ہے، جس سے وہ لوگ بھی دلچسپی رکھتے ہیں، جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ درس و تدریس کی سطح پر اردو کو جن مشکلات کا سامنا ہے ان کی طرف بھی انھوں نے نشان دہی کی اور کہا کہ اگر اردو میں بھی سائنس و ٹیکنالوجی اور مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے مواد تیار کیا جائے تو یقیناً اس سے بڑی تبدیلی آئے گی۔ انھوں نے کہا کہ مہاراشٹر میں اردو کی صورت حال دوسرے علاقوں سے بہت بہتر ہے اور اس میں یقیناً یہاں کے اردو اسکول، اساتذہ اور طلبہ کا رول ہے۔ اس سیشن کی نظامت محمد شعیب ندوی نے کی اور پروگرام میں اسکولی طلبہ وطالبات کے علاوہ بڑی تعداد میں اساتذہ اور اہل علم و دانش شریک رہے۔ تیسرا پروگرام معروف مزاحیہ اداکار رحمٰن خان کا تھا، انھوں نے ایک خوب صورت مزاحیہ شو پیش کیا، جس سے ہزاروں کا مجمع محظوظ ہوا۔

آخری دن

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام اور انجمن اسلام کے اشتراک سے ممبئی کے بی کے سی گراونڈ میں 6 جنوری سے جاری قومی اردو کتاب میلہ 14 جنوری کو اختتام پذیر ہوگیا۔ یہ میلہ کئی اعتبار سے منفرد اور کامیاب ترین ثابت ہوا۔ اس میلے میں خصوصاً ممبئی کے اسکولوں کے طلبہ و طالبات نے مجموعی طور پر پچاسوں ہزار کی تعداد میں شرکت کی اور کتابوں سے اپنی بے مثال محبت کا ثبوت دیا، خواتین بھی جوق در جوق اس میلے میں شریک ہوئیں، ان کے علاوہ مختلف اداروں اور انجمنوں نے بھی اس میلے میں غیر معمولی جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیا اور نو دنوں میں کم وبیش نوے لاکھ کی اردو کتابیں فروخت ہوئیں۔

آج ایک عظیم الشان اختتامی اجلاس کا بھی انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر دھننجے سنگھ نے کی، مہمان خصوصی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عین الحسن اور نیشنل کمیشن فار مائناریٹی ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز کے ممبر پروفیسر شاہد اختر، جبکہ مہمان اعزازی ڈاکٹر ظہیر قاضی، کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر محترمہ شمع کوثر یزدانی اور اجمل سعید تھے۔ نظامت کتاب میلے کے مقامی کوآرڈینیٹر امتیاز خلیل نے کی۔

انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی نے اس اجلاس میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک تاریخ ساز کتاب میلہ ہے، جس نے ممبئی کے سابقہ

کتاب میلوں کے تمام ریکارڈز توڑ دیے اور ممبئی کے علاوہ دور دراز کے شہروں اور قصبات سے بھی لوگ صرف اس میلے میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس میلے میں ممبئی کے اسکولوں کے طلبہ واساتذہ نے بہت بڑی تعداد میں شرکت کی، جس سے ان کی زبان وادب سے محبت جھلکتی ہے۔ انھوں نے ان تمام طلبہ، اساتذہ، اسکولوں کے ذمے داران اور میلے میں آنے والے سبھی شائقینِ اردو زبان کا شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر شاہد اختر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ممبئی کے اس تاریخی اور یادگار کتاب میلے میں شرکت کر کے مجھے بہت مسرت ہو رہی ہے اور میں اہالیان ممبئی کو اردو سے اس غیر مشروط محبت

کے اظہار کے لیے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ انھوں نے میلے کے انعقاد کے لیے ممبئی کے انتخاب پر کونسل کے ڈائرکٹر و ذمے داران کی ستائش کی کہ انھوں نے ہندوستان کے اس بڑے صنعتی وثقافتی شہر کا انتخاب کیا۔ پروفیسر عین الحسن نے کہا کہ کونسل اور انجمن کے ذریعے منعقدہ یہ میلہ واقعی ایک میلہ ہی ہے، جس میں لاکھوں کتابوں کی نمائش کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کسی کے کہنے سے زندہ نہیں ہے، اس کے اندر خود اتنی قوت ہے کہ وہ نہ صرف زندہ ہے؛ بلکہ اس نے اپنی نئی نئی بستیاں بنالی ہیں۔ اردو میں ایسی شیرینی ہے، ایسی موسیقیت ہے کہ یہ سننے والوں کو اپنا گرویدہ بنالیتی ہے، اس لیے یہ زبان کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے دلچسپ انداز میں اردو شاعری کی خوب صورتی، اردو لفظوں کی شیرینی، اس کی وسعت پذیری اور ہردل عزیزی پر روشنی ڈالی۔

پروفیسر دھنجے سنگھ نے اس میلے کی رنگارنگی اور اردو دوستوں کے والہانہ پن کے تئیں اپنی بے پناہ فرحت و مسرت کا اظہار کیا۔ انھوں نے اردو کے حوالے سے کہا کہ یہ ہندوستان کی مٹی میں، اس کی فضاؤں میں گھلی ہوئی ہے۔ انھوں نے اس میلے میں طلبہ و طالبات کے جوش و خروش پر خصوصی مسرت ظاہر کی اور ان کی شائستگی، علم کی تشنگی اور جذبے کی ستایش کی۔ انھوں نے کہا کہ ممبئی کے اس کتاب میلے نے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو کا مستقبل نہایت تابناک ہے۔ انھوں نے انفرادی و اجتماعی تعمیر و

ترقی میں کتابوں کے رول کا بھی خصوصی ذکر کیا۔ پروفیسر سنگھ نے میلے کو کامیاب بنانے میں شامل کونسل کے متعلقہ اسٹاف، انجمن اسلام، دیگر تمام معاون اداروں، صحافیوں، پبلشرز اور شائقینِ زبان وادب کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر سیفی بک ایجنسی کے سربراہ جناب سیفی میلے میں شریک ناشرین کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور کہا کہ کونسل نے اس میلے کا انعقاد کرکے ہمیں کتابوں کی نمائش کا بہت قیمتی موقع عنایت کیا، جس کے لیے ہم شکر گزار ہیں۔ میلہ انچارج اجمل سعید نے اظہار خیال کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر سمیت میلے کے انعقاد میں معاون اداروں اور افراد خاص طور پر انجمن اسلام، ڈاکٹر

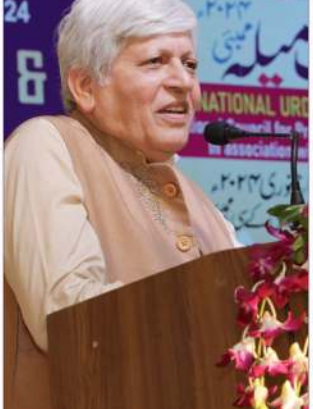

ظہیر قاضی، امتیاز خلیل، ہمایوں کبیر، فرید خاں اور پروگرام کوآرڈینیٹر محمد شہاب الدین کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ اس اجلاس کا اختتام کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر محترمہ شمع کوثر یزدانی کے باضابطہ اظہارِ تشکر پر ہوا۔

اس موقعے پر میلے کے دوران طلبہ و طالبات کے مابین سائنس کمپٹیشن، حب الوطنی گیتوں، بیت بازی، مباحثہ اور مونو ایکٹنگ کے مقابلوں میں اول، دوم اور سوم انعامات حاصل کرنے والے بچوں اور بچیوں کو بالترتیب پانچ ہزار، تین ہزار، دو ہزار اور ایک ایک ہزار کے نقد تشجیعی انعامات سے نوازا گیا۔ میلے میں کتابوں کے بیسٹ کلیکشن کا ایوارڈ الحسنات بک پرائیویٹ انٹر پرائز لمیٹڈ کو دیا گیا، جبکہ کتابوں کی بہتر نمائش کا ایوارڈ ایم آر پبلی کیشنز کو ملا۔ اس میلے کے انعقاد میں معاونت کرنے والے اداروں کو بھی نشان اعتراف سے نوازا گیا۔ اسی طرح طرح میلے کے دوران دو ہزار روپے سے زائد کی کتابیں خریدنے والے ہزار سے زائد شائقین کو توصیفی اسناد دی گئیں۔

قبل ازاں 'ہندی فلموں کا اردو ادب' کے عنوان سے ایک مذاکرے کا انعقاد ہوا جس کی نظامت مشہور شاعر و آئی پی ایس افسر خالد قیصر نے کی۔ اس مذاکرے میں روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر شاہد لطیف نے فلموں کی بگڑتی ہوئی زبان پر تشویش ظاہر کی اور کہا کہ چونکہ فلمیں معاشرے کی عکاس ہوتی ہیں اور چونکہ ہمارے معاشرے میں زوال آگیا ہے، تو اس کا اثر فلموں کی زبان اور گانوں پر بھی ہوا ہے۔ مکالمے یا گانوں میں مختلف زبانوں کا اختلاط بھی ایک مسئلہ ہے، جس پر توجہ دی جانی چاہیے۔ معروف سکرپٹ رائٹر و فلم ساز رومی جعفری نے کہا کہ فلموں میں لکھی جانے والی زبان میں کیرکٹر کو خاص طور پر دھیان میں رکھا جاتا ہے۔ کیرکٹر جس علاقے کا ہے اسی طرح کی بولی استعمال کی جاتی ہے، مگر جو عمومی بول چال استعمال ہوتی ہے وہ اردو ہی ہے جسے ہندی یا ہندوستانی کہہ سکتے ہیں۔ یہ عام بول چال کی زبان ہے۔ انھوں نے کہا کہ فلموں نے اردو ادب کی سب سے زیادہ خدمت کی ہے، ان کی وجہ سے ایسے علاقوں کے لوگ بھی اردو بولتے ہیں، جہاں کی زبان اردو نہیں ہے۔ مشہور اداکار جاوید جعفری نے کہا کہ اردو کی حصے داری ہندوستانی سینما میں بہت اہم ہے اور آج انٹرنیٹ کی وجہ سے نئی نسل بھی اس طرف توجہ دے رہی ہے اور بچے اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے تلفظ کے حوالے سے کچھ مشکلات کا بھی ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ چونکہ آج کا دور نہایت تیز رفتار ہے، ایسے میں ہم لوگوں پر دباؤ تو نہیں ڈال سکتے، ہاں اپنی کوشش کر سکتے ہیں کہ اپنی زبان اور تہذیب کا تحفظ کریں۔ دانش جاوید نے کہا کہ ہندوستان کی پہلی بولتی فلم اردو میں تھی، زمانہ آگے بڑھتا رہا اور مختلف زبانوں میں یہ سفر جاری رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ فلموں اور ادب و زبان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

آخری سیشن میں قومی مشاعرے کا انعقاد ہوا، جس کی نظامت خالد قیصر نے کی اور اسلم حسن، عزم شاکری، گووند گلشن، جیوتی ترپاٹھی، خان شمیم، عبید اعظم اعظمی، پرگیہ شرما، قمر صدیقی، راشد دموی، رفیعہ شبنم عابدی، رحمٰن مصور، سمیر سامنت، شاہد لطیف اور ذاکر خان ذاکر نے اپنا منتخب کلام پیش کیا۔ مشاعرے سے ہزاروں سامعین محظوظ ہوئے۔

■

Md Nayab Hasan
Batla House, Jamia Nagar,
New Delhi-110025
Mob.9560188574

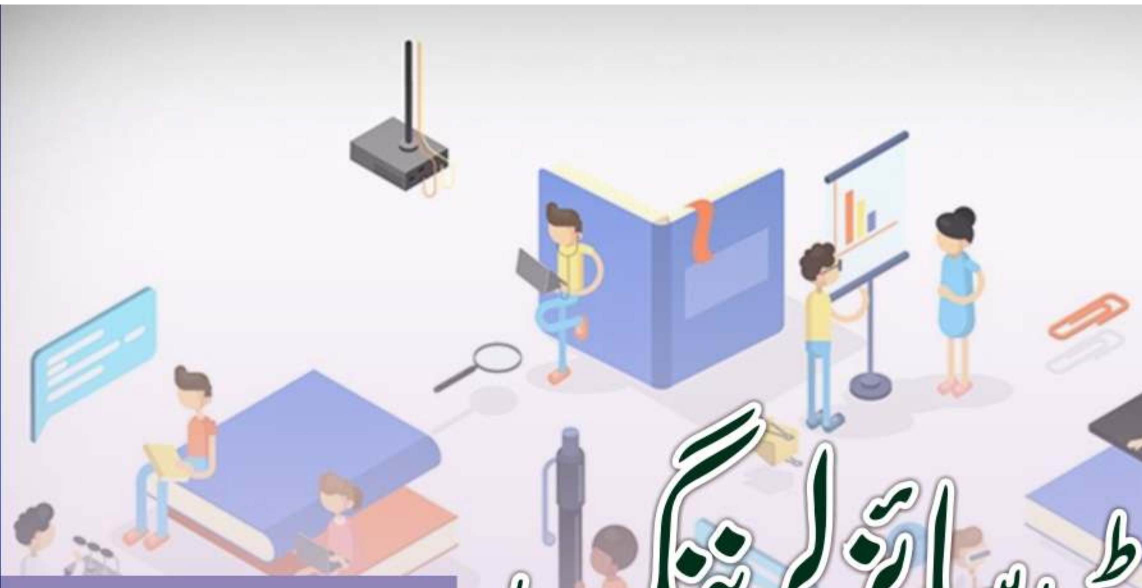

روبینہ

بائٹ سائز لرننگ
ایک نئی تدریسی حکمت عملی

بائٹ سائز لرننگ ایک ایسی تدریسی حکمت عملی ہے جو مختصر سرگرمیوں کے ساتھ مل کر مواد کے مختصر حصوں کا استعمال کرتی ہے۔ اسے مائیکرو لرننگ بھی کہا جاتا ہے یہ یونٹوں یا سرگرمیوں کے چھوٹے اور اچھی طرح سے منصوبہ بند بائٹ سائز ٹکڑوں کو استعمال کرتی ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کبھی کسی کمرۂ جماعت، لیکچر، تعلیمی اجلاس، یا سیمینار سے دوران ہی طلبہ باہر نکل جاتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ طلبہ کیونکہ منقطع، Disengaged، اور غیر متحرک ہیں؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ایک وقت میں بہت سارا مواد طلبہ کو بہم پہنچانے کی کوششیں کی جاتی ہیں اور طلبہ یوں محسوس کرتے ہیں کہ ان کا ذہن بالکل خالی یا بلینک ہو گیا ہے۔ کیونکہ وہ بہت زیادہ اپنے ذہن پر دباو ڈال چکے ہیں نتیجے کے طور پر وہ کمرہ جماعت میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر پاتے ہیں۔ اگرچہ کہ طلبہ کو مشغول کرنے، متحرک کرنے اور معلومات کو ذہن نشین کروانے کے لیے کوئی جادو کی چھڑی نہیں ہے۔ لیکن بائٹ سائز لرننگ ایک نئی تدریسی حکمت عملی ہے جو مدد کر سکتی ہے۔

بائٹ سائز لرننگ

ہم سب نے یہ جملہ سنا ہے ''اچھی چیزیں چھوٹے پیکجوں میں آتی ہیں۔'' بائٹ سائز لرنگ ایک ایسی تدریسی حکمت عملی ہے جو مختصر سرگرمیوں کے ساتھ مل کر مواد کے مختصر حصوں کا استعمال کرتی ہے۔ اسے مائیکرو لرنگ بھی کہا جاتا ہے یہ یونٹوں یا سرگرمیوں کے چھوٹے اور اچھی طرح سے منصوبہ بند بائٹ سائز ٹکڑوں کو استعمال کرتی ہے۔ طلبہ کو لمبے، بلا وقفہ والے سیشنز میں شامل کرنے کے بجائے معلومات کو چھوٹے، قابل انتظام حصوں میں تقسیم کرتی ہے تمام بائٹ سائز لرنگ کے ماڈیولز چھوٹے ہوتے ہیں 10 سے 15 منٹ کے درمیان لیکن تمام چھوٹے ماڈیولز بائٹ سائز کے فارمیٹ پر عمل نہیں کرتے ہیں۔ ماڈیولز سے مراد ویڈیو، ٹیکسٹ کا ایک ٹکڑا، ایک پوڈ کاسٹ— یہ طریقہ خاص طور پر آن لائن اکتساب پر لاگو ہوتا ہے اور تمام میڈیا فارمز کا استعمال کر سکتا ہے۔

کسی موضوع کے بارے میں جاننے کے لیے بائٹ سائز لرنگ طلبہ کو اپنے اکتسابی عمل پر زیادہ توجہ مرکوز کرنے اور فعال طور پر شامل رکھتا ہے اور اسے ایک کمتر طریقہ نہیں سمجھا جانا چاہیے جو کہ صرف کند ذہن طالب علموں کے لیے ہے عنوانات کو بائٹ سائز کے ماڈیولز میں کم کر کے ہم کند ذہن طالب علموں کو نچلی سطح پر نہیں لے جا رہے ہیں بلکہ انھیں انسانی دماغ کی فزیالوجی کے بارے میں ہماری بڑھتی ہوئی سمجھ کے مطابق ڈھال رہے ہیں۔

بائٹ سائز لرننگ کے فوائد

مختلف تحقیقات و مطالعات نے بائٹ سائز لرنگ کے کچھ مخصوص فوائد کی نشاندہی کی ہے۔ مثال کے طور پر، Giurgiu (2017) کے ایک مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ مواد کے چھوٹے حصوں نے طلبہ کو معلومات کو بہتر طریقے سے یاد رکھنے اور کورس کے اختتامی امتحان میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے میں مدد کی۔ Liu, Wei, and Gao (2016) کی ایک اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ مواد کو سیکھنے اور سمجھنے میں طالب علم کی دلچسپی نمایاں طور پر بہتر ہوئی ہے۔ بائٹ سائز لرنگ کے فوائد مندرجہ ذیل ہیں:

Retention/ Focus Is Improved

طلبہ کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ بغیر توقف کے طویل مدت تک کسی کام پر توجہ مرکوز کریں کیونکہ ہماری توانائی دن بھر میں متواتر کم ہوتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر مطالعات سے پتا چلتا ہے کہ 60 سے 90 منٹ تک توجہ مرکوز کرنے کے بعد ہماری چوکسی کم ہو جاتی ہے۔ اس دورانیہ میں طلبہ اکثر کھڑے ہونے یا ٹہلنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ طلبہ بے چین ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی توجہ کا دورانیہ ختم ہو رہا ہوتا ہے۔

ابرینا ٹومپکنز Abreena tompkins ایک تدریسی ماہر کے مطابق ''جسمانی طور پر فرد کے نیوران مسلسل 20 منٹوں سے زیادہ متحرک اور چوکس رہتے ہیں۔ ان 20 منٹوں کے اختتام پر اس کے نیوران مکمل الرٹ سے مکمل طور پر گراوٹ کی طرف چلے جاتے ہیں اور ان نیورونز کو مکمل طور پر بحال ہونے اور مکمل الرٹ حالت میں واپس آنے میں دو سے تین منٹ لگتے ہیں۔ اگر فرد نے تین منٹ سے زیادہ وقفہ/ بریک لیا تو اس نے

اپنی توجہ دوبارہ مبذول کر لی ہے۔'' طلبہ سرگرمی اور آرام کے مستقل اور بار بار چلنے والے پیٹرن کے ساتھ بہترین کام کرتے ہیں۔ جہاں بائٹ سائز لرننگ کے بہترین نتائج حاصل ہوسکتے ہیں۔ طلبہ بائٹ سائز لرننگ میں اعلی توانائی کے ادوار سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور توانائی کے ختم ہونے اور توجہ برقرار رکھنے میں نمایاں کمی آنے سے پہلے وہ اپنے مواد کا ایک حصہ ختم کر سکتے ہیں۔

کورس کے مواد میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے Interest In Course Material Increases

بائٹ سائز لرننگ اور اس کی تاثیر کے بارے میں تحقیق نے اس بات پر توجہ مرکوز کی ہے کہ طالب علموں نے روایتی متبادلات کے برخلاف اس طریقہ کار کو استعمال کرتے وقت کورس کے مواد پر کیسے ردعمل ظاہر کیا اور اسے کس حد تک یاد رکھا۔ مثال کے طور پر، Giurgiu (2017) کے ایک مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ مواد کے چھوٹے حصوں نے طلبہ کو معلومات کو بہتر طریقے سے یاد رکھنے اور کورس کے اختتامی امتحان میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے میں مدد فراہم کی۔ Liu, Wei, and Gao (2016) کے ایک اور مطالعے سے معلوم ہوا کہ مواد کو سیکھنے اور سمجھنے دونوں میں طلبہ کی دلچسپی نمایاں طور پر بہتر ہوئی ہے۔

یہ مطالعات کورس کے مواد اور طالب علم کی مصروفیت کے درمیان تعلق کے بارے میں واضح حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں۔ اگر طلبہ کو کم برن آؤٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ کورسز اور ان کے اندر موجود مواد کو زیادہ احسن طریقے سے سیکھتے ہیں۔ سائنس نے مسلسل ثابت کیا ہے کہ حوصلہ افزائی/محرکہ اور مشغولیت کامیاب اکتساب کے بہت بڑے حصے ہیں اور تحقیق اور عقل دونوں ہی اس کی حمایت کرتے ہیں۔

اکتساب اور ترقی کے پیشہ ور افراد پر کیے گئے ایک سروے کے مطابق 94% نے کہا کہ وہ وقت خرچ کرنے والے روایتی ای لرننگ کورسز کے مقابلے بائٹ سائز لرننگ کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ ان کے طلبہ اسے ترجیح دیتے ہیں (Boyette, 2012)۔ جیسا کہ ہر استاد جانتا ہے پرجوش طلبا اکتساب کا ایک دلچسپ ماحول بناتے ہیں جو خود اس اپروچ کا ایک غیر محسوس فائدہ ہے۔ روایتی گریڈ اسکول یا کالج کے ماحول سے ہٹ کر بائٹ سائز لرننگ نوجوان طلبہ کے لیے بھی فوائد فراہم کرتی ہے۔

علمی صلاحیتوں کے ساتھ صف بندی Alignment with Cognitive Capabilites

ملر (1956) کے بنیادی کام 'The Magical Number Seven, Plus or Minus Two' کے مطابق انسان اوسطا اپنی ورکنگ میموری میں تقریباً سات اشیا محفوظ رکھ سکتا ہے۔ بائٹ سائز تدریس اس بات کو مدنظر رکھتی ہے اور وہ قابل انتظام حصوں میں معلومات پیش کرتی ہے اس طرح بہتر یادداشت اور تفہیم کو فروغ دیتی ہے۔ (کلارک، 2010)۔

جدید طرز زندگی کے مطابق Fits Modern Lifestyles

ہم ملٹی ٹاسکنگ دور میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ایک طویل مضمون پڑھنا یا ایک گھنٹے کے لیکچر میں شرکت کرنا ہر ایک کے مصروف شیڈول میں فٹ نہیں ہوسکتا ہے۔ دوسری طرف، بائٹ سائز ٹیچنگ، چھوٹے، توجہ مرکوز اسباق پیش کرتی ہے جو آسانی سے مربوط ہوسکتے ہیں۔ چاہے وہ سفر کے دوران ہو، کافی کے وقفے کے دوران ہو، یا کاموں کے درمیان ہو۔ ہگ (2005) نے نشاندہی کی ہے کہ جدید طالب علم اکثر متعدد کرداروں اور ذمے داریوں کو نبھاتا ہے جس کی وجہ سے طویل عرصے تک اکتسابی سیشن میں مشغول رہنا مشکل ہوجاتا ہے۔ ایسے میں مختصر، لچکدار ماڈیولز کے ساتھ، بائٹ سائز لرننگ کو روزمرہ کی زندگی میں بغیر کسی رکاوٹ کے ضم کیا جا سکتا ہے جو آج کے طلبہ کے مطالبات کو پورا کرتا ہے۔ (کیپ، 2012)۔

Personalized Learning Pathways

بائٹ سائز لرننگ طلبہ کو یہ منتخب کرنے کی اجازت دیتی ہے کہ ان کے موجودہ علم اور ضروریات کی بنیاد پر کون سے ماڈیولز کے ساتھ مشغول ہونا ہے (ہگ، 2007)۔ یہ طلبہ کو بااختیار بناتی ہے اور زیادہ Personalized Learning Pathways فراہم کرتی ہے۔

اکتساب

بائٹ سائز کے ماڈیولز کے ساتھ طلبہ منتخب کر سکتے ہیں کہ وہ کیا سیکھنا چاہتے ہیں اور کب سیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لچک سے مخصوص موضوعات پر نظر ثانی کرنا یا واقف مواد کو چھوڑنا آسان ہوجاتا ہے، جس سے ذاتی طور پر سیکھنے کا تجربہ حاصل ہوتا ہے۔

مصروفیت کی برقراری

مواد جتنا چھوٹا ہوگا طلبہ کا دھیان بھٹکنے یا بور ہونے کا امکان اتنا ہی کم ہوگا۔ بائٹ سائز لرننگ ماڈیولز، خاص طور پر ملٹی میڈیا جیسے ویڈیوز یا انٹرایکٹو کوئز طلبہ کی دلچسپی کو برقرار رکھ سکتے ہیں اور مواد کے ساتھ زیادہ فعال مشغولیت کی حوصلہ افزائی کر سکتے ہیں۔ Guo et al (2014) کے ایک مطالعے میں پایا گیا کہ ویڈیو مصروفیت Video engagement چھ منٹس کے بعد تیزی سے کم ہوتی ہے۔ مختصر مواد طلبہ کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کا رجحان رکھتا ہے۔ علمی بوجھ کے امکانات کو کم کرتا ہے اور مجموعی مصروفیت کو بڑھاتا ہے (رونی، 2015)۔

فوری اطلاق

بائٹ سائز لرننگ اکثر مخصوص مہارتوں یا علم کے شعبوں کو نشانہ بناتی ہے۔ ایک بار جب ایک طالب علم ماڈیولز کو مکمل کر لیتا ہے، تو وہ سیکھنے کے عمل کو تقویت دینے اور اس کی عملی قدر کو بڑھانے کے لیے جو کچھ سیکھا ہے اسے فوری طور پر لاگو کر سکتا ہے۔

کفایتی اور موثر

معلمین اور اداروں کے لیے بائٹ سائز کا مواد تیار کرنا اکثر زیادہ کفایتی ہوسکتا ہے۔ طویل کورسز یا مواد تیار کرنے کے بجائے اساتذہ مختصر ماڈیولز تیار کر سکتے ہیں جنھیں ضرورت کے مطابق آسانی سے اپ ڈیٹ یا ترمیم کیا جا سکتا ہے۔ طلبہ کے لیے بائٹ سائز کا مطلب ہے کہ غیر ضروری مواد پر کم اور براہ راست متعلقہ چیزوں پر زیادہ وقت گزارنا۔ ادارہ جاتی نقطہ نظر سے ٹورنس (2013)

بائٹ سائز لرننگ اور اس کی تاثیر کے بارے میں تحقیق نے اس بات پر توجہ مرکوز کی ہے کہ طالب علموں نے روایتی متبادلات کے برخلاف اس طریقہ کار کو استعمال کرتے وقت کورس کے مواد پر کیسے رد عمل ظاہر کیا اور اسے کس حد تک یاد رکھا۔ مثال کے طور پر، Giurgiu (2017) کے ایک مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ مواد کے چھوٹے حصوں نے طلبہ کو معلومات کو بہتر طریقے سے یاد رکھنے اور کورس کے اختتامی امتحان میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے میں مدد فراہم کی۔

نے مشاہدہ کیا ہے کہ بائٹ سائز کا مواد تیار کرنا جامع کورسز تیار کرنے سے کہیں زیادہ کفایتی ہوسکتا ہے۔ مزید برآں طلبہ اپنے علمی خلا کو زیادہ مؤثر طریقے سے نشاندہی کرسکتے ہیں جس سے وسائل کا بہتر استعمال ہوتا ہے۔
(میٹر اینڈ مورینو،2003)

موبائل لرننگ کی حمایت

بائٹ سائز لرنگ موبائل لرنگ کے لیے ایک بہترین ساتھی ہے۔ اسمارٹ فونز یا ٹیبلیٹ پر بہت سے طلبہ کی مواد تک رسائی کے ساتھ، مختصر اکتسابی ماڈیولز چلتے پھرتے استعمال کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔ تعلیمی مقاصد کے لیے موبائل ڈیوائس کے استعمال میں اضافے کو دیکھتے ہوئے Partridge alet (2011) کا استدلال ہے کہ بائٹ سائزلرنگ موبائل لرنگ کے ساتھ مکمل طور پر مطابقت رکھتی ہے۔ مختصر ماڈیولز کو چلتے پھرتے استعمال کیا جاسکتا ہے جس سے تعلیم زیادہ قابل رسائی ہوجاتی ہے۔

Provides Quick Feedback

بہت سے بائٹ سائزلرنگ ماڈیولز فوری جانچ کے ساتھ ہوتے ہیں جیسے کوئز یا انٹرایکٹو سرگرمیاں۔ یہ فوری فیڈ بیک طلبہ کو مواد پر اپنی گرفت کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے اور مزید سیکھنے یا نظر ثانی کی ترغیب دے سکتا ہے۔ فوری اطلاق Retention کو تقویت دیتا ہے اور جب فوری فیڈ بیک کے ساتھ جوڑا بنایا جائے جیسا کہ Bruck alet (2012) نے مشاہدہ کیا ہے یہ طلبہ کے اعتماد اور فہم کو بڑھاتا ہے۔

بائٹ سائز ٹیچینگ کے اقدام

ہم اس دور میں رہتے ہیں جہاں فوری طور پر تسکین چاہیے۔ طلبہ وہی چاہتے ہیں جو اساتذہ چاہتے ہیں۔ طالب علموں کو ایک نئے تصور سے متعارف کرانے، کمرہ جماعت کے اسباق کو تقویت دینے، یا امتحان سے پہلے جائزہ لینے کے لیے اساتذہ بائٹ سائز ٹیچنگ کا استعمال کریں۔ اپنے کمرۂ جماعت میں بائٹ سائزلرنگ ماحول بنائیں۔ ان اقدامات کے ذریعے اساتذہ بائٹ سائز ٹیچنگ کو نافذ کرسکتے ہیں۔

کمرۂ جماعت کے لیے اکتسابی اہداف کا تعین کریں: سبق یا کورس کے اختتام تک آپ اپنے طلبہ کو کیا جاننا یا کرنے کے قابل بنانا چاہتے ہیں اس کی وضاحت شروع کریں۔ مقاصد آپ کے مواد کی تخلیق کے عمل میں رہنمائی کریں گے۔

مواد کا تجزیہ کریں: اس مواد کا جائزہ لیں جو آپ پڑھانا چاہتے ہیں۔ بنیادی خیالات کا تعین کریں اور ان کے

بائٹ سائز لرننگ موبائل لرننگ کے لیے ایک بہترین ساتھی ہے۔ اسمارٹ فونز یا ٹیبلیٹ پر بہت سے طلبہ کی مواد تک رسائی کے ساتھ، مختصر اکتسابی ماڈیولز چلتے پھرتے استعمال کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔ تعلیمی مقاصد کے لیے موبائل ڈیوائس کے استعمال میں اضافے کو دیکھتے ہوئے Partridge alet (2011) **کا استدلال ہے کہ بائٹ سائزلرننگ موبائل لرننگ کے ساتھ مکمل طور پر مطابقت رکھتی ہے۔**

آپسی ربط کو دیکھیں۔

مواد کو تقسیم کریں: اپنے مواد کو چھوٹے ٹکڑوں یا 'بائیٹس' میں تقسیم کریں۔ ہر حصہ ایک مکمل خیال یا تصور پیش کرنے کے قابل ہونا چاہیے۔

معلومات کو ترجیح دیں: اس بات کا تعین کریں کہ کون سی معلومات ضروری ہیں اور کیا اضافی ہے۔ اس بات کو یقینی بنائیں کہ ضروری معلومات پہلے اور واضح طور پر پیش کی گئی ہوں۔

حواس کو مشغول کریں: مختلف اکتسابی انداز کے مطابق اور مواد کو زیادہ دلچسپ بنانے کے لئے ملٹی میڈیا (ویڈیوز، تصاویر، آڈیو کلپس، وغیرہ) شامل کریں۔ متن کو میڈیا کی دیگر شکلوں کے ساتھ متوازن کریں۔

انٹرایکٹو عناصر: طلبہ کو مشغول کرنے اور ان کی تفہیم کی جانچ کرنے کے لیے کوئز، پولز، یا انٹرایکٹو مشقیں شامل کریں۔ یہ نہ صرف مواد کو تقسیم کرتا ہے بلکہ فوری فیڈ بیک بھی فراہم کرتا ہے۔

مدت کی حد: ہر بائٹ سائز کی لمبائی 10-2 منٹ ہو۔ یہ مدت موضوع کی پیچیدگی اور استعمال شدہ میڈیم کی بنیاد پر مختلف ہوسکتی ہے۔

ترتیب: مواد کو منطقی ترتیب میں منظم کریں۔ اس بات کو یقینی بنائیں کہ ایک حصے سے دوسرے حصے میں واضح تسلسل ہو۔

سیاق وسباق فراہم کریں: اس بات کو یقینی بنائیں کہ طلبہ واقف ہوں کہ معلومات کیوں متعلقہ ہیں۔ بائٹ سائز حصوں کو بڑے موضوع یا مقصد سے مربوط کریں۔

واضح اور جامع زبان استعمال کریں: حد سے زیادہ پیچیدہ زبان سے گریز کریں۔ مواد کو تمام طلبہ کے لیے قابل رسائی بنائیں۔

حقیقی دنیا کی مثالیں شامل کریں: طلبہ کو مواد سے متعلق کیس اسٹڈیز، قصے، یا عملی مثالیں فراہم کریں۔

فیڈ بیک لوپس: طلبہ کو سوالات پوچھنے یا مواد پر تبادلہ خیال کرنے کے مواقع فراہم کریں۔ یہ سمجھنے کے لیے فیڈ بیک فراہم کریں کہ بائٹ سائز کا مواد کس طرح موصول ہوتا ہے اور کہاں بہتری لائی جاسکتی ہے۔

لچکدار اکتسابی مواقع: تسلیم کریں کہ ہر طالب علم ایک ہی ترتیب میں نہیں سیکھتا ہے۔ طلبہ کو یہ منتخب کرنے کی اجازت دیں کہ وہ بائٹ سائز کے ٹکڑوں سے کس ترتیب میں نمٹنا چاہتے ہیں۔

تقویت: اکتساب کو تقویت دینے کے لیے وقتاً فوقتاً کلیدی تصورات پر نظر ثانی کریں۔ Retention کو یقینی بنانے کے لیے فالواپ مواد یا مشقوں پر غور کریں۔

تشخیص اور تکرار: آپ کے بائٹ سائز کے مواد کی تاثیر کا تعین کرنے کے لیے طلبہ کی مصروفیت، تاثرات اور کارکردگی کی نگرانی کریں۔ فیڈ بیک کی بنیاد پر ضرورت کے مطابق مواد میں ترمیم اور بہتری کریں۔

بائٹ سائز ٹیچنگ اگرچہ مؤثر ہے لیکن بہترین نتائج کے لیے اس نقطہ نظر کو دیگر تدریسی طریقوں کے ساتھ شامل کرنا فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے۔

محاکمہ

مختصر حصوں میں نئے عنوانات کا اکتساب کافی موثر ہے۔ بائٹ سائزلرنگ کو متعدد مضامین کے لیے اور پیشہ ورانہ پروگرام اور اسکول دونوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بائٹ سائزلرنگت کے بارے میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اسے سمجھنا آسان ہے جو اسے ہر اس شخص کے لیے مثالی بناتا ہے جسے جلدی کچھ سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایک موثر حکمت عملی ہے جو طلبہ کی کارکردگی کی سطح کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ اکتسابی عمل میں ان کی دلچسپی اور حوصلہ افزائی میں بھی اساتذہ کی مدد کرسکتی ہے۔ بائٹ سائزلرنگ ان انسٹرکٹرز اور ایڈمنسٹریٹرز کے لیے فائدہ مند ہے جو اپنی تدریس کو تمام طلبہ کے لیے مزید بہتر اور سودمند بنانا چاہتے ہیں۔ طالب علموں کو تعلیمی ترقی سے مطمئن محسوس کرنے اور ایک ہی وقت میں بہت سارے کام کے بوجھ سے بچنے کے لیے اساتذہ بائٹ سائزلرنگ کا استعمال کرسکتے ہیں۔

■

Dr. Rubeena
Asst Professor, Dept of Education and Training
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad- 32 (Telangana)
Mob.:9492530291
Email.: syedarubeena1@gmail.com

بشیر النسا بشیر
حیدر آباد دکن کی
بیدار ذہن شاعرہ

آمنہ تحسین

حقیقت سے تقریباً سب ہی کما حقہ واقف ہیں کہ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اردو ادب' خاص کر' نسائی ادب' کو بہت فروغ ملا۔ اصناف ادب، موضوعات اور اسلوب کے حوالے سے اس دور کو عروج کا دور بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ خواتین کو لکھنے پڑھنے اور تخلیقی اظہار کے ساتھ ساتھ انھیں شائع کروانے کے بھی مواقع ملنے لگے۔ جس کے نتیجے میں بہ حیثیت ادیبہ یا شاعرہ' کئی قلم کار خواتین کے نام اردو کے ادبی افق پر جگمگانے لگے تھے۔ ایسے ادبی ماحول میں بشیر نے اپنا تخلیقی سفر شروع کیا۔ گذرے برسوں کی تخلیق کار خواتین کے مقابلے میں بشیر النساء بشیر کو حیدر آباد کے سازگار ادبی ماحول کے علاوہ ورثے میں نسائی شاعری کی بڑی توانا روایت بھی ملی تھی۔

بشیر النساء بشیر کے حالات زندگی

بشیر النساء بشیر 1915 میں شہر حیدر آباد میں پیدا ہوئیں۔ وہ انتہائی مذہبی اور ادب کے شیدا خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے والد مولوی عبدالرحمٰن' پنجاب کے رہنے والے تھے۔ وہ پنجاب کے مشہور ملک خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ روزگار کے مسائل نے انھیں پنجاب سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا تو وہ ملازمت کے

بتاؤں کیا تمھیں میں کون ہوں' کیا ہوں' بہر صورت
سراپا درد ہوں' ایک ہستیِ محرومِ درماں ہوں
میری فطرت کا ہر ذرہ ہے محوِ خود فراموشی
بظاہر آئینہ ہوں اور بباطن رازِ پنہاں ہوں
مثالِ شمعِ گریاں ہوں برنگِ نے ہوں فریادی
کبھی ویرانہ مسکن ہے کبھی زیبِ گلستاں ہوں
یہ دھیمی سی نوا' تفسیر ہے جذباتِ پنہاں کی
نہ شاعر ہوں نہ اہلِ فن' نہ ہم بزمِ سخنداں ہوں[1]

معنویت سے بھر پور جذب و تاثیر میں ڈوبے درجہ بالا مذکور اشعار بشیر النساء بشیر کی فکر و دانش، ان کی خود آگہی اور شاعرانہ کمال کے ترجمان ہیں۔ بشیر النساء بشیر حیدر آباد کی مایہ ناز شاعرہ تھیں۔ وہ ایک حساس قلم کار تھیں۔ ان کی شخصیت میں سیاسی و سماجی شعور بہ درجہ اتم موجود تھا۔ ان کی تحریریں عصری آگہی اور فن کاری کا بہترین امتزاج ہیں۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ مضامین بھی تحریر کیے' لیکن زیادہ تر توجہ شاعری پر ہی مرکوز رکھی۔ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی' اور ہر صنف کو اپنا خونِ جگر دے کر ادبی شاہکار بنادیا۔ بشیر النساء بشیر' صاحبِ دیوان شاعرہ تھیں۔ ان کا دیوان' آبگینۂ شعر' کے عنوان سے 1948 میں ادارہ ادبیاتِ اردو' حیدر آباد سے شائع ہوا۔' آبگینۂ شعر'' کا دیباچہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے لکھا۔ بقول ڈاکٹر زور:

'' محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ عہد حاضر کی باکمال خاتون ہیں جن کا کلام اردو دنیا میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔''[2]

بشیر النساء بشیر اپنے وقت کی انتہائی مقبول اور کہنہ مشق شاعرہ تھیں۔ ان کا کلام ہندوستان کے موقر رسائل میں شائع ہوتا تھا۔ بشیر نے یوں تو ابتدائی عمر سے ہی مشقِ سخن شروع کردی تھی لیکن ان کے کلام کی اشاعت کا سلسلہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں شروع ہوا۔ اس

بشیر النساء بشیر حیدر آباد کی مایہ ناز شاعرہ تھیں، وہ ایک حساس قلم کار تھیں، ان کی شخصیت میں سیاسی وسماجی شعور بدرجہ اتم موجود تھا، ان کی تحریریں عصری آگھی اور فن کاری کا بہترین امتزاج ہیں، انھوں نے شاعری کے علاوہ مضامین بھی تحریر کیے' لیکن زیادہ تر توجہ شاعری پر ہی مرکوز رکھی، انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی' اور ہر صنف کو اپنا خون جگر دے کر ادبی شاہکار بنادیا، بشیر النساء بشیر' صاحبِ دیوان شاعرہ تھیں، ان کا دیوان' آبگینہ شعر' کے عنوان سے 1948 میں ادارہ ادبیات اردو' حیدر آباد سے شائع ہوا۔

سلسلے سے حیدرآباد آگئے تھے۔ وہ حکومتِ نظام کے محکمہ سیاسیات میں مددگار کے عہدے پر فائز تھے۔ انھیں اردو، فارسی اور عربی زبان میں خاصی مہارت حاصل تھی۔ بشیر کی والدہ شمس النساء بیگم کا تعلق حیدرآباد سے تھا۔ وہ مرزا صادق علی بیگ' تعلقدار کی بھانجی تھیں۔ شمس النساء بیگم کی پرورش ان ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ مرزا صادق علی بیگ نے گھر پر اپنی نگرانی میں شمس النساء بیگم کی تعلیم کا انتظام کیا تھا۔ وہ عربی اور فارسی میں خاصی مہارت رکھتی تھیں اور ان کا ادبی ذوق بھی بلند تھا۔ علاوہ ازیں خطاطی اور خوش نویسی میں بھی مہارت حاصل کر لی تھیں۔ وہ خطِ نستعلیق میں بڑی خوبصورت تحریر لکھتی تھیں۔ اس خصوصیت کی بناء پر انھیں 'شمس رقم' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔4 شمس النساء بیگم کا شمار اس وقت کی بیدار مغز خاتون میں ہوتا تھا۔ چونکہ خطابت کے فن سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھیں' اسی لیے میلاد کی زنانہ محفلوں اور محرم کی مجالس میں خاص طور پر مدعو کی جاتی تھیں۔ بہترین خطابت کی وجہ سے وہ کافی مشہور ہوگئی تھیں۔5

بشیر نے اپنے والدین کے انتقال پر جو نظمیں لکھی ہیں ان کے اشعار میں محبت وعقیدت کے بے پناہ جذبات کی فراوانی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنی والدہ کی رحلت پر نظم 'ورقِ غم' اور والد کی یاد میں ایک نظم بہ عنوان ''یادش بخیر'' لکھی تھی۔ دونوں نظموں کی ایک جھلک ملاحظہ کیجیے ۔

(الف)

اے میری غم خوار مادر تجھ کو میں پاؤں کہاں
عہدِ طفلی میں تری آغوش تھی میرا مکاں
کتنے جوکھم میں رہی ہے میری جانِ ناتواں
بات کرنے سے بھی واقف نہ تھی میری زباں
ہم نے تیرے شیر سے جوشِ نمو حاصل کیا
تو نے گاڑھے وقت میں حلِ عقدِ مشکل کیا
فکر سے، غم سے، مصیبت سے ہمیں غافل کیا
تو نے کن کن محنتوں سے ہم کو اس قابل کیا
(نظم ورقِ غم)6

(ب)

مرعوب تیرے سامنے ہر با کمال تھا
وہ تیری بارگاہ میں جاہ و جلال تھا
وابستہ تیرے نام سے میری حیات ہے
تیرا ہی التفات مری کائنات ہے
تجھ سے مری نگاہ کو ذوقِ نظر ملا
تیرے کمال ہی سے جلالِ ہنر ملا
تیری شعاعیں جذب ہیں میری حیات میں
تیرے تاثرات ہیں ضم میری ذات میں
(نظم یادش بخیر)7

بشیر النساء بشیر کی تعلیم باقاعدہ طور پر اسکول میں انجام نہیں پائی' بلکہ علمی استعداد انھیں گھر پر ہی حاصل ہوئی۔ اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم گھر پر دی گئی۔ نامور شعرا اور ادیبوں کی نگارشات کے مطالعے اور گھر کے ادبی ماحول کے نتیجے میں ان میں ابتدائی عمر سے ہی ادبی ذوق پیدا ہوگیا تھا۔ بعد کے برسوں میں ادب کے وسیع مطالعے اور زندگی کے مختلف رموز کے مشاہدات نے ان کی فکر کو گہرائی وگیرائی عطا کی۔ کم عمری سے ہی ان کے مشقِ سخن کی ابتدا ہوگئی تھی' لیکن اس میں مزید نکھار ان کی شادی کے بعد آتا گیا۔ بشیر کی یہ خوش قسمتی تھی کہ انھیں والدین کے علاوہ سسرال میں بھی ادب دوست ماحول نصیب ہوا۔ سسرال کے سازگار علمی وادبی ماحول میں بشیر کی شاعرانہ صلاحیتیں حد درجہ نکھرتی گئیں۔ ان کے شوہر مرزا ضامن علی غازی اور سسر' اکرام علی صفوی' کی حوصلہ افزائیوں نے بشیر کو ادبی وسماجی سطح پر کارہائے نمایاں انجام دینے کے قابل بنایا۔

بشیر اپنے سسر کے کہنے پر صادق حسین غبار کے علاوہ' علی حیدر نظم طباطبائی اور ابوظفر عبدالواحد عاقل سے بھی مشورۂ سخن کرتی رہیں اور اپنے ذوقِ ادب کو جلا بخشتی رہیں۔ بشیر کے دل میں اپنے سسر کی بہت عزت تھی۔ بشیر کی ادبی نگارشات کو سب سے پہلے سننے اور سراہنے والوں میں ان کے سسر ہی ہوا کرتے تھے۔ نظم 'رودادِ دلخراش' میں اکرام علی صفوی کے لیے بشیر کے جذبات اور بشیر کی ادبی زندگی میں ان کے اہم مقام کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ نظم بشیر نے اپنے سسر کی رحلت پر لکھی تھی۔ ایسی مثال اردو ادب میں شاید ہی دیکھنے کو ملے۔

ہائے کیا کیجیے بیاں' لطفِ بیاں جاتا رہا
اب کہاں قدرِ سخن جب قدر داں جاتا رہا
لوگ کہتے ہیں مجھے ذوقِ سخن اب کیوں نہیں
ذوق کیا باقی رہے جب ذوق داں جاتا رہا
داد دے گا کون اب سن کر میرے اشعار کی
شمع محفل اور چراغِ خاندان جاتا رہا
پھول گلشن میں کھلیں لاکھوں مگر اب کیا فائدہ
سب بہاریں ہیچ ہیں جب باغباں جاتا رہا8

بشیر النساء بشیر کے شاعرانہ کمالات:

بشیر کا دیوان 1944 میں مرتب ہوچکا تھا' لیکن اس کی اشاعت 1948 میں عمل میں آئی۔ اس دیوان کی اشاعت سے قبل ان کی دو طویل نظمیں علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہوئی تھیں۔ نظم 'رافتِ سلطانی' نواب میر عثمان علی خاں کی تخت نشینی کے پچیس برس کی تکمیل پر 'جشنِ سیمیں' کے موقع پر لکھی گئی' اور 'انجمن سراج الخواتین' کی جانب سے 1355ھ مطابق 1936 میں منعقدہ ایک باوقار تقریب میں پڑھی گئی' جبکہ 'جانباز ملت' قائدِ ملت بہادر یار جنگ کی رحلت پر لکھی گئی نظم ہے' جو 1363ھ مطابق 1943 میں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ دونوں نظمیں معمولی رد وبدل کے ساتھ ان کے دیوان 'آبگینۂ شعر' میں بھی شامل ہیں۔ 'آبگینۂ شعر' میں 1927 سے لکھا گیا کلام شامل کیا گیا ہے اور مختلف عنوانات کے تحت سنہ وار ترتیب دیا گیا ہے۔ عنوانات کچھ اس طرح ہیں۔ حضورِ یزداں میں، نذرِ رسالت، افکار و اذکار۔ حدیثِ دکن، خانوادہ آصفی، سازِ غزل، یادِ رفتگاں، سوز وساز۔ کلام کی اس طرزِ ترتیب سے ان کے فکر وخیال اور طرزِ اظہار کے ارتقا کو بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ بشیر 'آبگینۂ شعر' کی ابتدا ان اشعار سے کرتی ہیں۔

مرا ضمیر ہے بے تابِ جستجو اس میں
جھلک رہی ہے مرے دل کی آرزو اس میں
بشیر کیا کہوں کیا شئے ہے 'آبگینۂ شعر'
مری سرشت ہے خود میرے روبرو اس میں

بشیر النساء بشیر کے دیوان میں متنوع موضوعات اور مختلف اصنافِ شاعری موجود ہے۔ دیوان میں فکر انگیز اور درد بھری نظمیں، شخصی غم واندوہ سے بھرے مرثیے، عقیدت میں ڈوبے حمد، نعت اور منقبت، بہترین قطعات و رباعیات اور تغزل اور سوز وگداز سے بھری غزلیں شامل ہیں۔ ان کا کلام زبان وبیان کی دلکشی، خیال کی بلندی اور جدت آفرینی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ان کے کلام میں عام فرد کی زندگی سے جڑے موضوعات کا اتنا زیادہ تنوع موجود ہے کہ وہ مختلف سطحوں پر انسانی فکر کو ایک طرف مہمیز کرتا ہے تو دوسری طرف اس کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔

بشیر النساء بشیر نے غزل گوئی میں غالب اور مومن کے رنگ کو کسی حد تک اپنایا' لیکن ان کے کلام کے مطالعے سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علامہ اقبال کی شاعری اور ان کی فکری جہات سے بہت زیادہ متاثر تھیں۔ انھوں نے علامہ اقبال کے کلام سے خوب اکتساب کیا ہے۔ اقبال کا رنگ ان کی نظموں اور غزلوں دونوں میں موجود ہے۔ انھوں نے اقبال کی طرز میں غزلیں بھی کہی ہیں اور کائنات میں انسان کے وجود کی اہمیت سے متعلق فکر وخیال سے اپنی نظموں کو بھی خوب سجایا ہے۔ ایک پر

دردِ نظم میں اقبال کا رنگ ملاحظہ فرمائیے۔

حقیقت میں وہی انسان ہیں جو کچھ کام کرتے ہیں
سراپنا دے کے اپنی سرزمیں کا نام کرتے ہیں
یوں ہی گر بےعمل بیٹھے رہیں ہم آشیانوں میں
''ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں''
(نظم شعبۂ نسواں) 9

بشیر نے نظموں کی بہ نسبت غزلیں کم کہی ہیں' لیکن ان کی غزلیں بھی عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ نظموں کی طرح بشیر نے غزلوں میں بھی روایتی موضوعات سے پرہیز کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں بھی وہی فلسفۂ زندگی نظر آتا ہے' جو مثبت سوچ وفکر کا حامل ہے۔ ان کی غزلوں کی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے کہکشاں تبسم لکھتی ہیں:

''ان کی غزلوں میں انسانی ہمدردی، قومی جذبات، نسائی وقار وعظمت کے ساتھ فکر وخیال کی بلندی اور پاکیزگی بھی نمایاں ہے۔ لہجہ پرلطف اور پرسوز ہے۔''10

بشیر النساء بشیر کی شاعری میں نسائی حسیت

بشیر النساء بشیر کی شاعری میں خواتین کی پست حیثیت کے متعلق فکرمندی اور حقوقِ نسواں کی حصول یابی کی تڑپ کا پہلو نمایاں نظر آتا' ہے۔ سماج میں خواتین کی ارزاں حیثیت، ان کے وجود کی اہمیت وعظمت اور ان کے متعلق سماجی نظریات کے موضوع پر بشیر نے کئی فکر انگیز نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں 'نظامِ ہستی اور ہم 1938، حدیثِ نسواں، فریضۂ امہات (1942)، عورت (1943) بیداریِ اناث 1944، قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر نظموں' جیسے نذرِ دکن، غنچۂ نورس، شعبۂ نسواں، تاسیس مدرسۂ بالغات، رافتِ سلطانی وغیرہ میں بھی تعلیم وترقی نسواں کے متعلق ان کے فکر وخیال اور تدبر کے کئی عکس نظر آتے ہیں۔ بشیر کائنات میں عورت کے متعلق اگرچہ کوئی انقلابی فکر نہیں رکھتی تھیں لیکن وہ اس کے تقدس اور خاندان وسماج میں اس کی عظمت واہمیت سے واقف تھیں اسی لیے اپنے کلام میں اس کی وضاحت کرتی ہیں۔

قائم وجودِ زن ہی پہ غیرت ہے قوم کی
ان ناتواں ہاتھوں میں عزت ہے قوم کی
عورت سے ہے مکان مکانوں سے شہر ہے
شہروں سے ملک' ملک سے قائم یہ دہر ہے
روزی معاش' رزق کمانے میں کچھ نہیں
عورت ہی جب نہیں تو زمانے میں کچھ نہیں 11

خواتین کی فلاح وبہبود میں بشیر نے جو کچھ لکھا' وہ تمام ادبیات کسی نہ کسی زاویے سے دعوت غور وفکر دیتی ہیں۔ بشیر نے حقوقِ نسواں کی جہدکار کی طرح سماجی سطح پر انقلابی نعرے نہیں لگائے لیکن اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے بڑی خاموشی سے خواتین میں اپنے مقام ومرتبے اور حقوق کے متعلق بیداری پیدا کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی۔ بشیر کی فکرانگیز نظمیں سن کر محفل میں موجود خواتین اپنے وجود کی اہمیت اور فعال سماجی زندگی کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ ہندوستانی سماج میں عورت کے وجود کی ارزانی اور قومی ترقی کے لیے اس کی بھرپور حصے داری کی ضرورت کا بھرپور احساس تھا۔ تاریخی ادوار میں عورت نے جو اہم کردار ادا کیے تھے ان پر وہ فخر کرتی تھیں اور دوبارہ اسی مقام ومرتبے کو حاصل کرنے کے لیے خواتین کو آمادہ کرتی تھیں۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

صنفِ نازک جسے کہتے ہیں یہ اربابِ نظر
ہے اسی ذات پہ قوموں کی ترقی کا مدار
لازمی ہے کہ بنے قابلِ خدمت یہ بھی
کام کیوں کر وہ کرے جس کا ہو بازو بے کار
اپنی تاریخ پہ جس وقت نظر پڑتی ہے
ہم پہ ہوتے ہے عیاں اپنے نمایاں کردار
کس قدر زودِ فراموش ہے بے حس دنیا
آج کہتی ہے ہمیں' ناقص وعضو بے کار'
تھا قدم عالمِ اسلام میں پہلا کس کا
کس کی جراءت پر تھے انگشتہ دنداں کنار
چاند بن کر کیا دنیا کو منور کس نے
کس نے اکبر کے مقابل میں اٹھائی تلوار
کس کے افسانے سے توقیر ہے جھانسی کی سوا
سطوتِ نور جہاں سے ہے کسی کو انکار
یاد رکھو کہ ہے یہ عالمِ ہستی ہم سے
ہم جو مٹ جائیں تو مٹ جائیں گے یہ لیل ونہار 12

بشیر اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھیں کہ مرد اساس سماج کی قید وبند کے نتیجے میں عورت پسماندگی کا شکار ہو گئی۔ اسے اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے اور سماج میں باشعور وفعال فرد کی طرح زندگی گزارنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اسے ہمیشہ بےعقل، محکوم اور کمزور سمجھا گیا۔ ان نظریات کو عورت نے بھی قبول کرلیا تھا اور خودآگہی سے دور چلی گئی تھی۔ ان خیالات کو بشیر نظم' حدیثِ نسواں (دورِ عثمانی میں خواتین دکن کی ہرجہتی ترقی کی اجمالی روئداد)' میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

علم وخرد سے عاری ہمارا کلام تھا
تعلیم کا خیال نہ کچھ انتظام تھا
محکوم سب کے ہم تھے، یہی اپنا کام تھا
اور 'ناقصات العقل' ہمارا ہی نام تھا
ہم سب کے سر کا بوجھ تھے دنیا پہ بار تھے
خود اپنی ہی نظر میں ذلیل اور خوار تھے 13

وقت کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سماج میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور عورت کی تعلیم اور ترقی کے نظریات عام ہونے لگے۔ اس ضمن میں مختلف کوششیں کی گئیں' جس کے نتیجے میں تعلیم نسواں کا فروغ ہوتا گیا۔ چونکہ مملکت آصفیہ میں بھی عرصے تک تعلیم نسواں کا کوئی باقاعدہ نظم نہیں تھا۔ گھریلو سطح پر لڑکیوں کی تعلیم ہوا کرتی تھی۔ لیکن نظام ششم نواب میر محبوب علی خان کے دور میں سربراہانِ حکومت کے ساتھ ساتھ ذی شعور افراد نے اس اہم مسئلے کی جانب توجہ دی اور لڑکیوں کے لیے مدارس قائم کرنے شروع کیے۔ پھر نظام ہفتم میر عثمان علی خاں کے عہد میں تعلیم اور ترقیِ نسواں کے ضمن میں مختلف النوع کوششیں کی گئیں' جس کے نتیجے میں خواتین کی تعلیمی وسماجی حیثیت میں ایک انقلاب آفریں تبدیلی آتی گئی۔ جس کا حوالہ بشیر النساء بشیر کی اسی نظم' حدیثِ نسواں' میں ملتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

علم وادب سے آج ہر اک گھر ہے بوستاں
فنی، تمدنی، ہوئیں حاصل ترقیاں
یہ اک کرشمہ شہ عثمان ہے اب یہاں
لڑکوں کی طرح پاتی ہیں اسناد لڑکیاں
بنیاد عہد شہ میں ہوئی گرل گائیڈ کی
اس دور میں زنانہ کلب کی بنا ہوئی
قائم ہوئی ہیں انجمنیں اور بھی یہاں
جلسے کہیں ہیں اور کہیں بزمِ سخنوراں
محرومِ علم اب نہ تو لڑکے نہ لڑکیاں
گھر گھر سے اب ترقی تعلیم ہے عیاں
ممنون ومطمئن نظر آتے ہیں آج ہم
سرکار کے طفیل سے کرتے ہیں راج ہم 14

بشیر النساء بشیر کی مذکورہ نظم سماج میں عورت کے بدلتے موقف کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ تاریخ رقم کرنے میں کئی سو صفحات درکار ہوتے ہیں' لیکن بشیر نے اس نظم میں سادہ زبان اور رواں اسلوب میں انتہائی چابکدستی سے دورِ عثمانی کی مکمل معاشرتی تاریخ رقم کردی ہے۔ اس نظم کے آئینے میں ماضی تا حال دکن کی خواتین کے بدلتے موقف کے ساتھ ساتھ ترقی نسواں کی تمام تر سرگرمیوں کی واضح تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ اس نظم کا عنوان ہی بشیر نے ''خواتینِ دکن کی ہرجہتی ترقی کی اجمالی روئداد'' دیا ہے اور اس عنوان سے پورا انصاف کیا ہے۔ زیرِ بحث نظم

کے حوالے سے نہ صرف بشیر کے سماجی شعور کا پتہ چلتا ہے' بلکہ طبقہ نسواں کی پسماندگی پر ان کی تڑپ اور تعلیم و ترقی نسواں سے متعلق ان کی حد درجہ دلچسپی کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بشیر نے تعلیم و ترقی نسواں کے لیے صرف قلم کا ہی سہارا نہیں لیا' بلکہ عملی طور پر بھی انھوں نے حصے داری نبھائی۔ وہ ادارہ ادبیاتِ اردو کے 'شعبۂ نسواں'' سے وابستہ تھیں۔ یہ شعبہ 1939 میں قائم کیا گیا۔ اس شعبے کے تحت 'مدرسہ بالغات' کی شروعات کی گئی تھی اور ایسی لڑکیوں و خواتین کے لیے تعلیم کے حصول کا نظم کیا گیا تھا جنھوں نے کسی وجہ سے تعلیم ترک کردی تھی۔ شعبے کی سر گرمیوں میں وہ بھر پور حصہ لیا کرتی تھیں۔

بشیر النساء بشیر نے 'نہ صرف اپنے فکر انگیز کلام سے اردو ادب کے سرمایے میں گونا گوں اضافہ کیا' بلکہ مختلف علمی و ادبی موضوعات پر نثری تحریروں سے بھی اردو زبان کو سر فراز کیا۔ اگر چہ انھوں نے نثر پر کم توجہ دی اور شاعرانہ اظہار کو اپنی فکر کے اظہار کا ذریعہ بنائے رکھا لیکن جو مضامین لکھے وہ اعلیٰ معیار کی نثر میں شمار ہوتے ہیں۔ خواتین کے جلسوں میں انھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ مضامین بھی پیش کیے۔ ان کے مضامین موقر رسائل میں شائع بھی ہوئے۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین ریڈیو سے بھی نشر ہوئے۔ بقول خواجہ حمید الدین شاہد' وہ ایک اچھی انشا پرداز ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کے مضامین شائع ہو چکے ہیں''15 جبکہ ڈاکٹر حفیظ قتیل ان کی نثر کے متعلق لکھتے ہیں:

''بشیر النساء بشیر اچھی انشا پرداز بھی ہیں۔ کئی مضامین، کتابوں کے مقدمے، اور ریڈیو کے لیے تقریریں لکھتی رہی ہیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ مرتب ہو چکا ہے۔''16

الغرض بشیر النساء بشیر نے اپنی شاعری اور نثری تحریروں سے اردو زبان کے سرمایے میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ اس کے معیار اور خاص کر نسائی ادب کے حوالے سے خواتین کے وقار کو بلند کرنے کا باعث بنیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بشیر جب تک حیات تھیں تب تک وہ مسلسل مشقِ سخن کرتی رہیں۔ آخر کے چند برسوں میں وہ فریش رہیں لیکن ماباقی برس ذہنی وجسمانی طور پر بہتر تھیں۔ حیدر آباد کی اس دانشور خاتون اور باکمال شاعرہ کا کلام رسائل میں شائع ہوتا رہا لیکن ان کے دیوان (اشاعت 1948) کی اشاعت کے بعد کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی' جبکہ وہ 1972 تک زندہ رہیں۔ انھوں نے اس پورے عرصے میں بہت کچھ لکھا اور اردو زبان و ادب کو مالا مال کیا۔ جیسا کہ ڈاکٹر رضیہ صدیقی بصیر لکھتی ہیں:

''آبگینہ شعر' کے علاوہ ان کا غیر مطبوعہ کلام کافی تعداد میں موجود ہے۔ اس غیر مطبوعہ کلام کا ذخیرہ اتنا زیادہ ہے کہ اگر اسے کاٹ چھانٹ کر بھی چھاپا جائے تو کم از کم دو تین مجموعے اور نکل سکتے ہیں۔ ایک خالص مقالہ دو حصوں میں بعنوان 'اقبال ہماری نظر میں اور ہم اقبال کی نظر میں' لکھا گیا ہے۔ جس پر کچھ اضافہ کے ساتھ پی ایچ ڈی کی ڈگری مل سکتی ہے۔ اس کی نثر بڑی مسجع اور بڑی عرق ریزی سے تیار ہوئی ہے۔''17

یہ حیرت کا مقام ہے کہ بشیر النساء بشیر کے انتقال کو کئی برس گذر گئے لیکن ان کے غیر مطبوعہ کلام یا ان کے مضامین کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہو سکا۔ کسی ادارے یا انجمن نے اس جانب پہل نہیں کی اور نہ ان کے افرادِ خاندان میں کسی نے یہ کوشش کی۔ اس ضمن میں مزید تلاش و تحقیق کے نتیجے میں یہ حقیقت بھی کھلی کہ اب ان کا غیر مطبوعہ کلام یا ان کے مضامین کسی کے پاس بھی دستیاب نہیں ہیں۔ ان کی نگارشات کو محفوظ نہیں رکھا گیا۔ افسوس کہ ایک ایسی شاعرہ اور ادیبہ جو ساری عمر اپنے وطن اور ہم وطنوں پر محبت وعقیدت کے پھول نچھاور کرتی رہی اور اپنے فکر و دانش بھرے افکار سے نہ صرف معاشرے کی رہنمائی کرتی رہی بلکہ گنج ہائے گراں مایہ ادبیات سے اردو کا دامن بھرتی رہی' اس خاتون کو بھلا دیا گیا۔ اردو کی عاشق اور بے لوث خدمت گذار کی خدمات کو اردو کے وطن میں ہی وقت کی آندھی کے سپرد کردیا گیا۔ بشیر کے انتقال پر سعید شہیدی نے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کتنا صحیح لکھا تھا۔

اے بشیر خوش بیانِ روح و روانِ علم وفن
تیری شمع فکر سے روشن تھی ہر ایک انجمن
تیرے ماتم میں ہے اردو کا گریباں تار تار
ہوگئی رخصت بہار اور رہ گئی یادِ بہار

بشیر النساء بشیر نے 'نہ صرف اپنے فکر انگیز کلام سے اردو ادب کے سرمایے میں گوناگوں اضافہ کیا' بلکہ مختلف علمی وادبی موضوعات پر نثری تحریروں سے بھی اردو زبان کو سر فراز کیا۔ اگر چہ انہوں نے نثر پر کم توجہ دی اور شاعرانہ اظہار کو اپنی فکر کے اظہار کا ذریعہ بنائے رکھا لیکن جو مضامین لکھے وہ اعلیٰ معیار کی نثر میں شمار ہوتے ہیں۔ خواتین کے جلسوں میں انہوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ مضامین بھی پیش کیے۔

حواشی

1 بشیر النساء بشیر، 'آبگینۂ شعر'، ادراہ ادبیاتِ اردو۔ حیدرآباد، 1948، ص 147,148
2 محی الدین قادری زور (ڈاکٹر)، 'دیباچہ۔ آبگینۂ شعر'، ادراہ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد، 1948
3 خواجہ حمید الدین شاہد، حیدرآباد کے شاعر، آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی، حیدرآباد، 1958
4 محمد محمود حسین، مضمون 'خاک میں کیا ہوں گی' مشمولہ ماہنامہ سب رس (بشیر النساء بشیر نمبر)، جولائی 1972، ص 40-39
5 محمد محفوظ علی: مضمون، بشیر النساء بشیر۔ ایک نجی جائزہ، مشمولہ ماہنامہ سب رس (بشیر النساء بشیر نمبر)، جولائی 1972، ص 58-59
6 بشیر النساء بشیر، 'نظم ورقِ غم۔ آبگینۂ شعر'، ادراہ ادبیاتِ اردو۔ حیدرآباد، 1948، ص 166-165
7 سید بشیر احمد: سخنورانِ حیدرآباد، ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2007، ص 165-160
8 نظم 'رودادِ خراش' مشمولہ، 'آبگینۂ شعر'، ادراہ ادبیاتِ اردو۔ حیدرآباد، 1948، ص 170
9 نظم شعبہ نسواں، 'آبگینۂ شعر'، ادراہ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد 1948
10 کہکشاں تبسم، نسائی شعری آفاق، بھاگل پور، 2015، ص 41
11 نظم 'فریضۂ امہات' مشمولہ، 'آبگینۂ شعر'، ادراہ ادبیاتِ اردو۔ حیدرآباد، 1948، ص 43
12 نظم 'نظامِ ہستی اور ہم'، ایضاً۔ ص 41 تا 42
13 نظم 'حدیثِ نسواں (دورِ عثمانی میں خواتینِ دکن کی ہر جہتی ترقی کی اجمالی روئداد)' مشمولہ نذرِ دکن۔ مرتبہ سکینہ بیگم، 1939، ص 99 تا 101
14 ایضاً۔
15 خواجہ حمید الدین شاہد، (مرتب) حیدرآباد کے شاعر، 1958، ص 52
16 حفیظ قتیل، راہ رو اور کارواں، حیدرآباد، 1955، ص 44
17 رضیہ صدیقی بصیر، مضمون 'بشیر النساء بیگم بشیر۔ دکن کی صاحبِ دیوان شاعرہ، مشمولہ رسالہ 'بزمِ ادب' حیدرآباد، 2020، ص 51

■

Prof. Ameena Tahseen
Dept. of Women Education
MANUU
Hyderabad- 500032 (Telangana)
Mob.:9885017560
Email.: amtahseen123@yahoo.com

ماہنامہ عفت پٹنہ

بہار کا پہلا جریدۂ نسواں

محمد ذاکر حسین ندوی

سماجی، سیاسی، ثقافتی، اقتصادی، ادبی اور تانیثی زندگی پر جس تیزی کے ساتھ صحافت کا مثبت اور منفی اثر پڑتا ہے، وہ آج کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ صحافت نے بڑی بڑی تحریکوں اور انقلابات کو جنم دیا ہے۔ عالمی سطح پر ایسے واقعات بار بار رونما ہوئے جب صحافت کی عظیم طاقت، اس کی مقبولیت اور اس کی جرح و تنقید سے مرعوب ہوکر اسے پابندی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ صوبہ بہار تحریکی اعتبار سے ہمیشہ سے سرگرم بلکہ بعض تحریکیں تو بہار ہی سے اٹھیں اور ملک کے طول وعرض میں پھیل گئیں۔ یہاں اردو صحافت کی ایک شاندار روایت رہی ہے۔ گرچہ اس کی شروعات اردو صحافت کے آغاز (1822) کے اکتیس برس بعد 1853 میں ہوئی۔ جولائی 1853 میں بہار کا پہلا رسالہ 'نور الانوار' آرہ سے جاری ہوا۔ اس کے بعد بہار کی سرزمین سے متعدد رسالے نکلے۔ لیکن دسمبر 1926 سے قبل جو بھی رسالے جاری ہوئے، وہ سب کے سب عام رسالے تھے، کسی صنف سے مخصوص نہیں تھے۔ ان میں سے ایک بھی رسالہ ایسا نہیں تھا جو طبقۂ نسواں کی ترجمانی کر سکے۔ اس کمی کو سب سے پہلے صالحہ خاتون نے محسوس کیا اور تعلیم و اصلاح نسواں کی مہم چھیڑ دی اور اس کے آرگن کے طور پر ایک رسالہ 'عفت' کے نام سے دسمبر 1926 میں جاری کیا۔ یہ رسالہ خالصتاً طبقۂ نسواں پر مرکوز تھا۔ اس طرح یہ بہار کا پہلا جریدۂ نسواں بھی ہے۔

رسالہ 'عفت' آستانہ گورگانواں ڈاکخانہ کھگول پٹنہ سے شائع ہوتا تھا اور صالحہ خاتون اس کی ایڈیٹر تھیں۔ صالحہ خاتون کے احوال وکوائف سے آگاہی نہیں ہو سکی ہے کیونکہ کسی نے ان کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ یہ بہار اور بنگال کا پہلا نسائی مجلّہ تھا۔ 'عفت' کے سرورق پر یہ وضاحت ملتی ہے کہ "بہار و بنگال کا واحد زنانہ ماہوار صحیفہ۔" یہ بھی مرقوم ہے کہ یہ "مسلم خواتین کی ادبی سہیلی" ہے۔ یہ رسالہ کب تک نکلا اور کب بند ہوا، اس سلسلے میں کوئی جانکاری نہیں ملتی۔ محترمہ خضر بانو خیری بہاری نے اپنے مضمون 'بہار کی صحافت' میں اس رسالے کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ "یہ رسالہ صوبہ بہار کا واحد زنانہ ماہوار مجلّہ تھا، خدا کرے پھر شائع ہو۔" (ندیم، بہار نمبر 1935)۔ گویا 1935 سے قبل ہی یہ رسالہ بند ہو چکا تھا۔ اس کے صرف تین شمارے: جلد 1/ شمارہ 1/ دسمبر 1926، جلد 1/ شمارہ 2/ جنوری اور جلد 1/ شمارہ 3/ فروری 1927 خدا بخش لائبریری میں موجود ہیں۔

ذمہ داران رسالہ عفت نے اس کے کچھ قواعد متعین کیے تھے۔ چنانچہ سرورق کی پشت پر قواعد کے ضمن میں سات ہدایات مندرج ہیں اور وہ اس طرح ہیں:

(1) رسالہ عفت ہر مہینے کے پہلے عشرہ میں شائع ہوا کرے گا۔ (2) عام شائقین سے سالانہ تین روپے، معاونین سے سالانہ دس روپے، ممالک غیر سے چھ شلنگ پیشگی قیمت علاوہ محصول ڈاک لی جائے گی۔ والیان ریاست اور سرپرستان عفت جو عطا فرمائیں بصد شکریہ قبول کیا جائے گا۔ (3) نمونہ کے پرچے کے لیے چار پیسہ کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔ (4) منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر اپنا نام اور پتہ صاف اور خوش خط تحریر کریں۔ (5) رسالہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی بیس تاریخ کے بعد اور بیس سے پہلے پہنچ جانی چاہیے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔ (6) خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں۔ (7) شرمناک اور فحش مضمون کا کوئی اشتہار کسی طرح درج رسالہ نہیں کیا جائے گا۔ ضمیمہ شائع کرنے کی اجرت اور رعایتی نرخنامہ اشتہارات خط وکتابت سے طے کریں۔

مضمون نگاروں کے تعلق سے بھی آٹھ ہدایتیں درج کی گئی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(1) مضمون ہر مہینہ کی پہلی تاریخ تک دفتر میں آجانا چاہیے۔ (2) نامکمل مضمون شائع نہیں کیا جا سکتا، اس لیے ہمیشہ مضمون پورا کرکے بھیجنا چاہیے۔ (3) مضمون کاغذ کی ایک ہی طرف خوش خط اور روشن سیاہی سے صاف صاف لکھنا چاہیے۔ (4) اگر مضمون کسی کتاب یا رسالہ سے ماخوذ، مقتبس یا ترجمہ ہو تو اس کا حوالہ ضرور دینا چاہیے۔ (5) مضمون کے ساتھ راقم مضمون کا نام اور پورا پتہ لازمی طور پر ہونا چاہیے۔ اگر اپنا نام شائع کرنا منظور نہ ہو تو اس کی اطلاع کر دی جائے۔ (6) ایسا مضمون جس میں کسی مذہبی فرقہ کی دل آزاری یا ذاتیات کا تعلق

ہو شائع نہیں کیا جائے گا۔ (7) جو مضامین رسالہ کے معیار کے مطابق نہ ہوں گے طلب کرنے پر واپس کر دیے جائیں گے۔ (8) عفتی بہنوں اور جملہ نامہ نگاروں کی خط و کتابت پورے احتیاط اور سختی کے ساتھ پوشیدہ رکھی جائے گی۔

اس کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ رسالہ 'عفت' ان لوگوں کے لیے جو پانچ سالانہ خریدار مہیا کرائیں گے، ان کی خدمت میں 'عفت' ایک سال تک مفت ملتا رہے گا۔ آخری صفحے پر اشاعت اور اہتمام کے تعلق سے یہ معلومات درج کی گئی ہے: باہتمام سید عبدالرحیم پرنٹر و پبلشر برقی پریس مراد پور پٹنہ میں چھپ کر دفتر عفت گورگانواں ڈاکخانہ کھگول پٹنہ سے شائع ہوا۔

ماہنامہ عفت پٹنہ کے صرف تین شمارے ہی دستیاب ہو سکے۔ ان تینوں شماروں کے مشمولات پر ایک نظر ڈالتے چلیں:

دسمبر 1926: نظم پروین/بیگم مرزا محمد مجتبیٰ۔ عرض حال/ ایڈیٹر۔ خواتین اسلام کا جذبۂ تبلیغ/ ماخوذ۔ خیر مقدم/مولانا تمنا عمادی۔ عورت کا زیور/بیگم ادریس۔ ام المومنین حضرت خدیجہ طاہرہؓ/ ثریا بیگم۔ دل کی پکار/ شہزادی بیگم۔ بیوی کے حقوق۔ گدگدیاں۔ نام کا پردہ/ مولانا سید مرتضیٰ حسن شفق۔ نحوست/ام العرفان۔ صنف نازک/سید شاہ منظور الرحمٰن۔ انمول موتی۔ حفظان صحت/ محمودہ خاتون۔ پرورش اطفال/ ماخوذ۔ حیرت انگیز ایجادات اور دلچسپ معلومات۔ مجلس عفت/ معاونین عفت۔ نقد و تبصرہ/ایڈیٹر۔

جنوری 1927: شذرات/ایڈیٹر۔ حضرت زینبؓ/ سیدہ بیگم مظفرالدین ندوی۔ شادی/ آغا حشر کاشمیری۔ بتول بنت الرسولؐ/سید مرتضیٰ حسن شفق۔ عفت اور عورت/ حافظ جمال صاحبہ۔ بوڑھی ماما/شکری پاشا۔ احسان خاص و عام/سید ابوالعاص۔ گدگدیاں۔ نام کا پردہ/بیگم مرزا محمد مجتبیٰ آفندی۔ آزادی کے گھر چرخہ۔ بیوی کے فرائض۔ نوحہ غمگین/خدیجہ الکبریٰ۔ حیرت انگیز ایجادات۔ کام کی باتیں۔ خیر مقدم کے مختلف طریقے۔ حفظان صحت۔ مجلس عفت۔ نقد و تبصرہ/ایڈیٹر۔ اشتہارات۔

فروری 1927: شذرات/ایڈیٹر۔ شمع رسالت کے پروانے/خواجہ سعید احمد۔ رقیہ بنت رسولؐ/سیدہ بیگم سید مظفرالدین ندوی۔ غریب الوطن/بلقیس بانو۔ زن و شو کے تعلقات/سید مظفرالدین ندوی۔ حاضر جوابی/شہر بانو۔ پرورش اطفال۔ پردہ/سید محمود شیر۔ فضول خرچی کا نتیجہ کارٹون۔ کام کی باتیں۔ اشتہارات۔

ان مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسالہ 'عفت'

جولائی 1853 میں بہار کا پہلا رسالہ 'نور الانوار' آرہ سے جاری ہوا۔ اس کے بعد بہار کی سرزمین سے متعدد رسالے نکلے۔ لیکن دسمبر 1926 سے قبل جو بھی رسالے جاری ہوئے، وہ سب کے سب عام رسالے تھے، کسی صنف سے مخصوص نہیں تھے۔ ان میں سے ایک بھی رسالہ ایسا نہیں تھا جو طبقہ نسواں کی ترجمانی کر سکے۔ اس کمی کو سب سے پہلے صالحہ خاتون نے محسوس کیا اور تعلیم و اصلاح نسواں کی مہم چھیڑ دی اور اس کے آرگن کے طور پر ایک رسالہ 'عفت' کے نام سے دسمبر 1926 میں جاری کیا۔

کی مدیرہ صالحہ خاتون نے یہ کوشش کی ہے کہ خواتین کے تعلق سے جو مفید اور کارآمد باتیں ہو سکتی ہیں، ان کو احسن طریقے سے پروسا جائے تاکہ خواتین ان کے مطالعے سے اپنی زندگی سنوار سکیں۔ اس تعلق سے چند مضامین پر نظر ڈالتے چلیں۔

محترمہ شہزادی بیگم نے اپنے مضمون 'دل کی پکار' میں نسائی تعلیم کے سلسلے میں قوموں کی سرد مہری کا شکوہ اور نسائی تعلیم کی افادیت اور اہمیت کا اظہار اور رہبرانِ قوم سے یہ اپیل کی ہے کہ:

''پس ایسے خود غرض اور حجت پسند بزرگان قوم سے میری سب سے پہلے التجا ہے کہ برائے خدا وہ اس طرح کے لغو اعتراضات اور فضول گویوں پر نیز نسائی تعلیم کے طے شدہ مسئلہ کے بحث و مباحثہ میں اپنے گراں قدر اوقات اور قوت عمل کو بیکار ضائع کر کے چلتی ہوئی گاڑی میں روڑے نہ اٹکائیں بلکہ خدا توفیق دے تو سبھوں کے ساتھ متحد و متفق ہو کر باہمی جوش و خروش سے اس مبارک و مسعود تحریک کو کامیاب بنانے کی سعی فرمائیں۔

دو دل یک شود بہ شکند کوہ را
پراگندگی آرد انبوہ را

'خواتین اسلام کا جذبۂ تبلیغ' کہیں سے ماخوذ ہے۔ چار پانچ سطروں میں اس تعلق سے کارآمد تحریر پیش کی گئی ہے۔ 'گدگدیاں' کے تحت دو سبق آموز قصے درج کیے گئے ہیں۔ 'نحوست' میں دنوں اور چیزوں کو نحس سمجھنے پر تنبیہ کی گئی ہے اور اسلام کی رو سے اس کی تردید کی گئی ہے۔ 'حفظان صحت' کے ضمن میں مکھیوں کے مضر اثرات کو سائنسی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ دسمبر 1926 کے شمارے میں 'نقد و تبصرہ' میں مولوی سید معین الدین احمد قیس رضوی عظیم آبادی کی کتاب 'گلشن حیات' کا تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ کتاب شاد عظیم آبادی کی حیات و خدمات پر مشتمل ہے۔ اور جنوری 1927 کے شمارے میں معارف، امارت، المبشر، غریب نواز، اتحاد، ادبستان، الاکرام اور مسیحا جیسے اردو رسائل کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اور فروری 1927 کے شمارے میں نقد و تبصرے کا کالم نہیں ہے۔ 'گلشن حیات' پر رسالہ عفت کی مدیرہ نے جو تبصرہ کیا ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اس کتاب گلشن حیات میں حضرت شاد مد فیوضہ کے خاندانی حالات، تعلیم و تربیت، آغاز شاعری اور علمی مشاغل اور شاعری کے عروج کے عنوانات کے جو مضامین ہیں، وہ بے حد مفید اور سبق آموز ہیں۔ بالخصوص مولانا شاد کی اصلاحیں تو اپنی جگہ بے مثل ہیں اور ہر وہ شخص جو ادب اردو سے شغف و دلچسپی رکھتا ہے خاطر خواہ بہرہ ور اور لذت اندوز ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس کتاب کی قدر کرنا نہ صرف اس کے مصنف کا حوصلہ بڑھانا ہے بلکہ زبان اردو کی نشو و نما میں مدد کرنا ہے۔ یہ مفید علمی کتاب اس لائق ہے کہ اسے نصاب تعلیم میں داخل کر لیا جائے تو زبان اردو کے لیے بے حد منفعت رساں ثابت ہوگی۔ (دسمبر 1926)۔

مدیرہ صالحہ خاتون نے اس کا بھی التزام کیا ہے کہ مضمون نگاروں کا تعارف پیش کیا جائے۔ چنانچہ ہر تخلیق اور نگارش سے پہلے وہ صاحب تخلیق و نگارش کا تعارف پیش کرتی ہیں پھر تخلیق و نگارش کا آغاز ہوتا ہے۔ حضرت تمنا عمادی مجیبی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتی ہیں:

''حضرۃ المکرّم جناب حسان الہند مولانا محی الدین صاحب تمنا پھلواروی ابنائے سخن میں اس قدر مشہور و معروف ہیں کہ آپ کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کے دل میں طبقۂ نسواں کی جو ہمدردی بدرجہ اتم موجود ہے، اس پر ہم جس قدر بھی فخر و مباہات کا اظہار کریں تھوڑا ہے۔ آپ نے عفت کے اجرا کی خبر پا کر جس خوش خلوص کے ساتھ اس کو خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے قیمتی

نصائح سے خاکسار مدیرہ کو سرفراز فرمایا ہے، اس کا شکریہ ہمارے زبان قلم سے ادانہیں ہوسکتا۔ ہماری آرزومندانہ امید ہے کہ آپ اپنے پرتنویرافکار اور نصائح عالیہ سے عفت کے صفحات کو اسی طرح برابر زینت بخشتے رہیں گے"۔

محترمہ سیدہ بنت قمر بیگم مظفرالدین صاحب ندوی، ایم،اے کا تعارف اس انداز میں پیش کرتی ہیں:

"محترمہ مقالہ نگار کا اسم گرامی محتاج تعارف نہیں، آپ متعدد کتب کی مصنفہ اور بہار کی مشہور انشا پرداز خاتون ہیں۔ ارباب ذوق نے آپ کے مضامین اردو کے زنانہ رسائل علی الخصوص 'حور' میں کثرت سے دیکھے ہوں گے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ نے ہماری دعوت پر فوراً لبیک کہا اور آئندہ قلمی امداد کی امید دلائی۔"

جہاں تک اداریے کا تعلق ہے تو دسمبر 1926 کے شمارے میں 'عرض حال' کے عنوان سے مدیرہ صالحہ خاتون نے اردو رسائل کی صورت حال اور جریدۂ نسواں کی کمیابی پر اظہار خیال کیا اور رسالہ 'عفت' کے جاری کرنے کے کیا اسباب تھے اور اس سے کون سے فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں، اس کا بیان کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"اس رسالہ کو محض مضامین کا پشتارے کی طرح پیش کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ہماری دلی خواہش وتمنا یہ ہے کہ مثل بہترین رسالوں کے اس کو مفید اور دل نواز بنائیں۔ حتی الوسع اس میں تصویریں بھی ہوں۔ ہندوستان اور بیرون ہند کے اخبارات و رسائل کے مفید اقتباسات خاص طور پر ترجمہ کر کے درج کیے جائیں۔ غرض یہ کہ دلچسپ ہونے کے علاوہ ہر حیثیت سے 'عفت' کا وجود کار آمد ومفید ثابت ہوں۔"

جنوری 1927 کا اداریہ 'شذرات' کے نام سے ہے۔ یہ اداریہ بایں طور اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی اور حضرت شاد عظیم آبادی کی وفات کا ذکر ہوا ہے اور اسی ضمن میں ان دونوں حضرات کے علمی وادبی کارنامے پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

"دسمبر کا عفت پریس سے نکل جانے کے بعد یکا یک ہمیں اپنے واجب الاحترام ادیب اور مایہ ناز مورخ جناب مولانا عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی کے بعارضہ فالج 17 جمادی الثانی 1345ھ جمعہ کے دن انتقال فرمانے کی روح فرسا خبر ملی۔ اس حادثہ عظیم کی زہرہ گداز خبر سے ہمارے دل پر کیا گزری زبان وقلم اس کے اظہار سے قاصر ہے۔ اس دور قحط الرجال میں آپ جیسی بلند پایہ اور مغتنم شخصیت کا اٹھ جانا ہماری سخت بد نصیبی اور بلا شبہ ایک شدید قومی نقصان ہے۔ آہ! آج دنیائے شعر و ادب تاریک ہے کہ اپنے وقت کے مجدد اعظم اور اردو لٹریچر اور اسلامی تاریخ کے ایک مستقل مدرسہ کا بانی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گیا اور افسوس کہ اس کی جگہ پُر کرنے کے لیے بظاہر اس کا کوئی صحیح جانشیں نظر نہیں آتا۔"

"لیجیے ابھی خلد آشیاں جناب شرر مرحوم کی جانکاہ موت پر ہماری آنکھیں خونبار ہی تھیں کہ پیر فلک نے ہمارے خرمن دل پر ایک اور بجلی گرائی۔

آہ! آج خانہ اردو بے چراغ اور سنسان ہے کہ غالب ومومن اور میر کی آخری یادگار بہار کا مشہور ادیب، ہندوستان کا نامور شاعر خان بہادر سید علی محمد شاد 83 سال کی عمر میں 8/جنوری 1927 سنیچر کا دن گزار کر بوقت شب گیارہ بج کر اٹھارہ منٹ پر چل بسا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دل مچل مچل کر تڑپتا اور طبیعت رہ رہ کر بگڑتی ہے۔ جب یہ خیال آتا ہے کہ 'عفت' کے پچھلے نمبر میں ہم نے مرحوم کی سوانح عمری 'گلشن حیات' پر تبصرہ کیا تھا۔ ھیھات! آج ہمارا قلم اس جلیل القدر اور عالی مرتبت ہستی کی اندوہناک جدائی پر وقف ماتم ہے۔ مولانائے مرحوم کی ذات سے ہماری بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ آپ نے 'عفت' کے اجرا پر دلی ابتہاج اور خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے غایت شفقت کے ساتھ ہماری امداد کا وعدہ فرمایا تھا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔"

فروری 1927 کا اداریہ رسالہ 'عفت' کے ممبر شپ کے تعلق سے جن خواتین وحضرات نے مدد فرمائی، ان کا شکریہ ادا کیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ شکوہ بھی کیا گیا ہے کہ:

"کیا یہ افسوس وشرم کی بات نہیں ہے کہ وہ حضرات جو زبان اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے آہ و واویلا مچاتے اور اپنی عورتوں کی تعلیم واصلاح کے لیے ٹسوے بہاتے ہیں، ان کے ہاں ان کی خاص طلبی... ایک خط کے ساتھ عفت کا پرچہ نموناً بھیجا جاتا ہے اور درخواست کی جاتی ہے کہ اگر خریداری قبول ہو تو قیمت بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں اور اگر خریداری قبول نہ ہو تو ایک امتناعی کا لکھ دیں... مگر اس تاکید کے باوجود بھی۔۔ ایک مہینہ تک کوئی جواب نہیں آتا۔"

رسالہ 'عفت' کی پذیرائی میں ارباب سخن نے کوئی کنجوسی نہیں کی بلکہ اس اقدام کو خوب سراہا گیا۔ مولانا تمنا عمادی اتنے متأثر ہوئے کہ 'خیر مقدم' کے عنوان سے نظم بغرض اشاعت بھیجا جس میں رسالے اور اس کی مدیرہ صالحہ خاتون کی دیدہ وری اور دور اندیشی کی تعریف کی گئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہو۔

بہار آنے کو آئی ہر چمن میں ہر گلستاں میں
اداسی ہی مگر تھی طبقۂ محصوم نسواں میں
اسی طبقے میں سے اک شخص یہ کہتی ہوئی اٹھی
نہ رکھوں گی اٹھا کر ہو جو کوشش حد امکاں میں
مبارک صالحہ تجھ کو مبارک صالحہ رجھ کو
صدا یہ گونج اٹھی گنبد گردوں گرداں میں

محترمہ بیگم مرزا محمد مجتبی آفندی صاحبہ نے بھی رسالہ عفت کے اجرا کے تعلق سے ایک نظم لکھی۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

یہ رسالہ دیار مشرق میں
روح عصمت ہے جانِ عفت ہے
صائب الرائے صالحہ خاتون
نکتہ رس نکتہ دانِ عفت ہے
کیا صفات حمیدہ کا ہو بیاں
کوکب آسمان عفت ہے

رسالہ اردو، اورنگ آباد دکن کے جنوری 1927 کے شمارے میں رسالہ عفت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

"یہ ماہانہ رسالہ عورتوں کی اصلاح وفلاح کی غرض سے گورگانواں ڈاکخانہ کھگول پٹنہ سے شائع ہوا ہے۔ صالحہ خاتون صاحبہ اس کی ایڈیٹر ہیں۔ بہار کا غالباً یہ پہلا رسالہ ہے جو اس مقصد کے ساتھ نکلا ہے۔ مضامین کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مقصد اس کے پیش نظر ہے، اس میں ضرور کامیاب ہوگا۔ لکھنے والوں میں زیادہ تعداد خواتین کی ہے۔ ایسی مجلسیں اور انجمنیں، اخبار اور رسالے جن کی غرض تعلیم واصلاح نسواں ہے، ان میں جب تک عورتیں خود شریک نہ ہوں، ان کے فرائض انجام نہ دیں گی، کبھی کامیابی نہ ہوگی۔ اس رسالے کے چلنے اور کامیابی کی توقع اس لیے ہوتی ہے کہ اس کی کارپرداز اور لکھنے والی زیادہ تر عورتیں ہیں (ص72)"

جمیل اختر صاحب اپنی کتاب 'اردو جرائد نسواں کی تاریخ' کی پہلی جلد میں اس رسالے کے متعلق لکھتے ہیں:

"مضامین کا انتخاب معیاری ہے اور حصول مقصد کی شہادت دے رہا ہے۔ تربیت واصلاح کا جذبہ صادق ہے۔ لکھنے والے تمام کے تمام اپنے عہد کے نامور لوگ ہیں۔ ایک معیاری رسالے کے تمام گُن اس کے اندر ہیں" (ص288)۔

■

Dr. Mohd Zakir Husain Nadwi
Khuda Bakhsh Library
Patna- 800004 (Bihar)

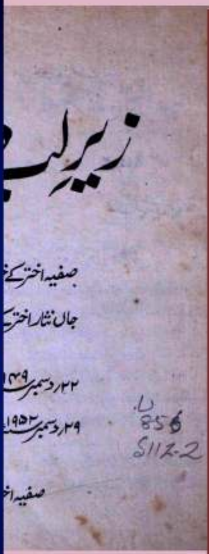

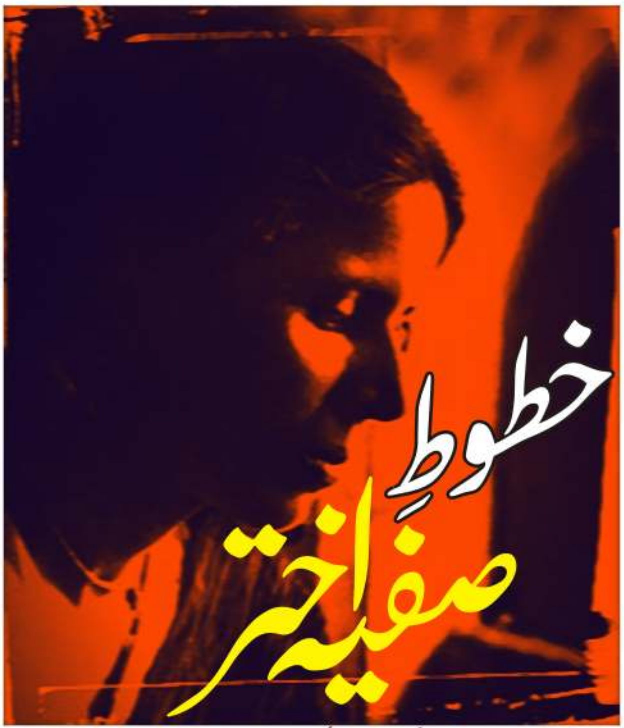

خطوطِ صفیہ اختر

نسائی ادب کا گراں قدر سرمایہ

(Letters of Safiya Akhtar:A Valuable Asset of Women's Literature)

شاداب تبسم

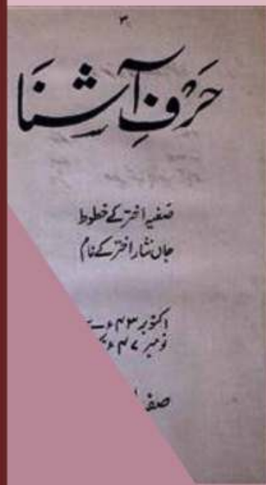

دیگر عالمی زبانوں کی طرح اردو میں بھی خطوط نگاری ایک صنف کی حیثیت سے شامل ہے۔ اردو ادب میں مشاہیر کے خطوط کا ایک ذخیرہ موجود ہے۔ مرزا محمد قتیل، غلام امام شہید، غلام غوث بے خبر، رجب علی بیگ سرور، واجد علی شاہ، غالب، حالی، سرسید، شبلی، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، مہدی افادی، اکبر الہ آبادی، ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال اور عبدالحق کے علاوہ دیگر خواتین و حضرات خطوط نگاروں کی بھی طویل فہرست ہے جن کے خطوط، مجموعوں اور رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق اردو کا پہلا دستیاب شدہ خط ایک خاتون کا تحریر کردہ ہے جن کا نام فقیرہ بیگم تھا۔ 1803 میں تحریر کردہ یہ خط کتاب 'واقعات اظفری' میں درج ہے۔ فقیرہ بیگم کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔

خواتین مکتوب نگاری کی فہرست صفیہ اختر کے خطوط کو شامل کیے بغیر مکمل نہیں کی جاسکتی۔ صفیہ اختر 25 جنوری 1918 کو لکھنؤ کے قصبہ ردولی میں پیدا ہوئیں۔ صفیہ اختر نے علی گڑھ اور لکھنؤ سے تعلیم حاصل کی۔ وہ شاعر اسرار الحق مجاز اور ادیبہ حمیدہ سالم کی حقیقی بہن، مشہور شاعر جاں نثار اختر کی بیوی اور موجودہ دور کے مشہور شاعر جاوید اختر کی والدہ تھیں۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور بھوپال کے حمیدیہ کالج میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ ان کا انتقال 18 جنوری 1953 کو لکھنؤ میں ہوا۔

صفیہ اختر کی شہرت دراصل ان کے خطوط کے منظر عام پر آنے کے بعد ہوئی۔ جو ان کے انتقال کے بعد ان کے شوہر جاں نثار اختر نے 'حرفِ آشنا' (21 ستمبر 1958) اور 'زیرِ لب' (1954) کے عنوان سے شائع کرائے۔ 'حرف آشنا' میں وہ خطوط شامل ہیں جو صفیہ اختر نے اکتوبر 1943 اور نومبر 1947 کے درمیان علی گڑھ، لکھنؤ اور نینی تال سے تحریر کیے تھے۔ 'حرفِ آشنا' میں وہ خط بھی شامل ہے جو صفیہ اختر نے شادی سے قبل جاں نثار اختر کو اپنی نسبت کے تعلق سے ارسال کیا تھا۔ 22 دسمبر 1949 اور 29 دسمبر 1952 کے درمیانی عرصے میں بھوپال، نینی تال اور لکھنؤ سے تحریر کیے گئے خطوط 'زیرِ لب' میں شامل ہیں۔ یہ خطوط اس وقت تحریر کیے گئے جب صفیہ اختر بھوپال میں تنہا تھیں اور جاں نثار اختر نے سیاسی حالات کے باعث اپنی گرفتاری سے بچنے کے لیے ممبئی کی راہ اختیار کی تھی۔ راقمہ کے پیش نظر کتاب 'صفیہ کے خطوط۔ جاں نثار اختر کے نام' ہے۔ اس کتاب میں دونوں مجموعے 'حرفِ آشنا' اور 'زیرِ لب' شامل ہیں۔

صفیہ اختر کے خطوط ایک عورت کی آنکھ سے ٹپکا ہوا وہ لہو ہے جس میں رفیق زندگی کے لیے والہانہ محبت، بے اختیارانہ یاد اور اذیت ناک جدائی کا رنگ گھلا ہوا ہے۔ خطوط کا ایک ایک لفظ روح کی گہرائی سے نکلا ہوا ہے جو جذبات کی شدت، محبت کی پاسداری و وسعت اور صداقت کا آئینہ دار ہے۔ یہ خطوط کیونکہ ایک مشرقی عورت کے ذریعے اپنے شوہر کے نام تحریر کیے گئے ہیں اس لیے ان میں ہندوستانی گھرانے کی تصویر ملتی ہے۔ ان خطوط میں بچوں، نوکروں، گاؤتکیوں، فرش پر بچھی ہوئی چاندنی، تخت پوشوں، بلاؤزوں اور ساڑیوں اور بچوں کی معصوم شرارتوں کا ذکر ملتا ہے۔ ساتھ میں ایک شوہر پرست بیوی کے متلاطم جذبات ہلکورے لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ صفیہ اختر کے خطوط پڑھنے کے بعد کرشن چندر، جاں نثار اختر کے نام ایک خط میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے معلوم ہوتا ہے جیسے صفیہ کی یہ نازک نسائی تحریریں ڈاک سے نہیں بھیجی گئی ہیں۔ بادل کے ٹکڑوں پر اتاری گئی ہیں۔ شفق کی موہنی، برسات کی السائی ہوئی شام، آنسوؤں کی طرح چپ چاپ گرتی ہوئی بوندیاں اور

محبوب کی یاد، صفیہ کے خطوں میں یہ محسوسات ہمارے پرانے کلچر کی حسین ترین یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔ ہمارے پرانے ادب اور کلچر میں تم جانتے ہو عورت بے زبان اور گونگی نہیں ہے اس کا اپنا کردار ہے اور وقار ہے، جس طرح زندگی کے دوسرے کاموں میں وہ برابر کی حصہ دار ہے، اسی طرح عشق میں بھی وہ برابر کی حصہ دار ہے اور مرد کو اپنا محبوب تصور کرتی ہے۔ اور اس کے اظہار کو گناہ نہیں سمجھتی بلکہ انہیں جذباتی زندگی کی معراج سمجھتی ہے۔ صفیہ نے اس جذبے کو اپنے خطوں میں جس خلوص پاکیزگی اور نسائی خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔ وہ اس کے رفعتِ احساس کی دلیل ہے۔''[1]

فراق گورکھپوری رقمطراز ہیں:

''ذاتی تعلقات اور گھریلو زندگی سے متعلق شوہر کے نام بیوی کے خطوط میں انسانیت کی اتنی قدریں، مانوسیت اور ہم آہنگی کی اتنی پاکیزہ مثالیں، اسلوب بیان کی بے تکلفی، خلوص صداقت، نیک مزاجی و بلند کرداری کی اتنی جھلکیاں ظرافت کا نمک صحیح معنوں میں جیون ساتھی کا لب ولہجہ جس طرح یہ قدر اول کی چیزیں اس کتاب میں موجود ہیں۔ شاید ہی اردو یا کسی بھی زبان میں شوہر کے نام بی بی کے خطوط کے کسی دوسرے مجموعے میں نظر آئیں۔''[2]

فراق گورکھپوری کی محولہ بالا رائے سے صفیہ اختر کے خطوط پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ 'حرف آشنا' اور 'زیرلب' کا ہر خط صفیہ کا ہی نہیں بلکہ ہر مشرقی عورت کے جذبات کی ترجمانی اور احساسات لطیف کا جیتا جاگتا مرقع ہے۔ ان خطوط میں ہندوستانی عورت کی ایک ایسی تصویر نظر آتی ہے جو گھر کی چاردیوری سے نکل کر اپنے شوہر کی زندگی اپنے سماج اور معاشرے میں ایک ذمے دار فرد کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ صفیہ اختر کے نزدیک شوہر کا تصور ایک حکمراں یا دیوتا کا نہیں بلکہ ایک دوست کا تصور ہے۔ اس بات کا اظہار 'حرف آشنا' کے دوسرے ہی خط میں اس طرح کرتی ہیں:

''شوہر کا تصور اب میرے لیے ایک دیوتا کا تصور نہیں۔ ایک دوست کا تصور ہے، لیکن ایک ایسے دوست کا جو مجھ سے بہت سی باتوں میں فوقیت رکھتا ہو۔ خیالات میں، ارادوں میں، عمل میں اور پھر اس فوقیت کو تسلیم کرنے میں مجھے ایک ابدی سکون حاصل ہوتا ہے۔''[3]

صفیہ اختر نے اپنے خطوط میں مرد اور عورت کی دوستی کے تصور کو بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے خطوط میں لفظ 'دوست' ایسا لفظ ہے جس میں ساری محبتیں اور نزاکتیں سموگئی ہیں۔ شوہر کے لیے لفظ 'دوست' کا استعمال جگہ جگہ ملتا ہے۔ لکھتی ہیں:

''آؤ تمہاری تھکی تھکی آنکھوں کو پیار کرلوں۔ خیریت معلوم کرنے کے لیے بے چین رہوں گی دوست''[4]

''میرے لیے تم ہی سب کچھ ہو، میری عزت کے محافظ، میرے بچوں کے نگراں، میرے دوست، ساتھی اور پھر ایک ہندوستانی عورت کے ساجن۔''[5]

محبت کئی قسم کی ہوتی ہے۔ ماں کی محبت بے لوث، بے غرض، جو سب کچھ دے کر ہی سب کچھ پالیتی ہے۔ بہن کی محبت پیار اور لگاؤ کے بدلے پیار اور لگاؤ چاہتی ہے۔ بیوی کی محبت سب کچھ دیتی ہے اور سب کچھ پانے کی دعویدار اور خواہشمند ہوتی ہے۔ صفیہ اختر کے خطوط میں پیار کے سارے رنگ یکجا ہوتے نظر آتے ہیں اور اس امتزاج سے ایک نیا رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ ایک عورت جو اپنے شوہر کی دوست ہے۔ اس کی ہمراز ہے۔ اس پر جملے کستی ہے۔ کبھی ماں کی ممتا جتاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کبھی بہن کا پیار دکھاتی ہے۔ کبھی بھائی کی طرح بازوؤں میں بازو ڈال کر چلتی ہے۔ کبھی ایک عجیب انداز سے شفیق باپ کی طرح سمجھاتی ہے۔ 'زیرلب' میں شامل ایک خط میں لکھتی ہیں:

''آؤ تمھاری پیشانی پر ایسا پیار کرلوں جس میں ماں کی شفقت، بہن کا فخر، بیوی کا ایثار اور دوست کی ملائمت سب کچھ شامل ہو میری جان۔''[6]

خطوط میں ماں کی بے لوث محبت پیار اور دوست کا جذبہ جھلکتا ہے۔ لکھتی ہیں:

''اچھا آؤ معصوم بچوں کی طرح ہر آلودگی سے پاک ہوکر میرے سینے پر سر رکھ دو اختر! میں کبھی کبھی تمھیں وہ محبت بھی دے سکتی ہوں جو بچے کو ماں سے ملتی ہے۔ تاکہ وہ پروان چڑھ سکے۔''[7]

مذکورہ بالا تحریر کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں تراشے گئے جملے جاں نثار اختر کے 'گھر آنگن' کی رباعیوں کے محرک بنے۔ جاں نثار اختر کی رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

ہر مصیبت سے بچانے کو تمھیں
ہر طرح کی بات خود پر لے سکتی ہوں
کہتی ہے کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے
میں ماں کا بھی پیار تم کو دے سکتی ہوں[8]

صفیہ اختر نے اگر یہ خطوط نہ تحریر کیے ہوتے تو جاں نثار کی شاعری ان رباعیوں سے محروم رہ جاتی۔ ایک خط میں لکھتی ہیں:

''اختر میری عادت ہوچکی ہے کہ تم فیصلہ کرو اور میں اس پر عمل کروں اس میں مجھے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ اگر کبھی اپنی مرضی تم سے منوالیتی ہوں تو احساس جرم کی کھٹک سی باقی رہتی ہے۔''[9]

جاں نثار اختر کی رباعی میں اس خیال کی آواز بازگشت اس طرح سنائی دیتی ہے۔

میں وہی کروں جو وہ کہیں وہ چاہیں
مجھ کو بھی تو اس بات میں چین آتا ہے
منوا بھی لوں ان سے اپنی مرضی جو کبھی
ہفتوں کو میرا سکون چھن جاتا ہے[10]

تمام خطوط میں جذبات کی شدت، وفا کا گہرا جذبہ اور ایثار ہی ایثار نمایاں ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ خودسپردگی، بے پناہ محبت اور اپنا سب کچھ قربان کردینے کی شدید آرزو، چاہنے اور چاہے جانے کی تمنا لفظوں میں سمٹ کر صفحۂ قرطاس پر بکھر گئی ہے۔ لکھتی ہیں:

''میں تمھاری' ہوں اور تمھاری ہر مشکل میری ہے۔ میں ہر مشکل کو راحت میں تبدیل کردوں گی اور ہر دشواری کو تمھارے لیے آسان بناؤں گی۔ مجھ پر بھروسہ کرو اور خود پر بھی۔ پھر یہ شکست کا احساس تم میں نہ ابھرے گا، ساتھی۔''[11]

صفیہ اختر کے خطوط کو پڑھتے وقت ناول یا افسانے کی لذت کا احساس ہوتا ہے۔ اس حیثیت سے بھی یہ خطوط منفرد ہیں۔ خطوط کے مطالعے سے ان کی شخصیت کی یہ خوبی بھی اجاگر ہوتی کہ ان کی نظر زندگی کے روشن پہلوؤں پر تھی۔ زندگی کی ہزاروں پریشانیوں کا سامنا کرکے مسلسل علیل رہنے اور شوہر کی بے اعتنائی کے باوجود صفیہ اختر نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ یہی آہنی عزم اور استقلال ایک عورت کے بلند کردار، صبر اور قوت برداشت کا ثبوت ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

''تم اس طرح جینے کے مفہوم کو بعض اوقات محدود نہ کرلیا کرو۔ خود کے لیے نہیں دوسروں کے لیے جیوں، پھر غم تمھارے پاس نہ پھٹکے گا۔'[12]

''مجھے تمہاری محبت، سرپرستی، تمھارا اعتماد سبھی کچھ حاصل ہے اور تمھیں میری پوری زندگی پھر ہم اپنے کو ہارے ہوئے انسانوں میں کیوں سمجھیں؟ تھک مت جاؤ۔ ساتھی۔''[13]

صفیہ اختر کے خطوط میں چاہنے اور بے پناہ محبت کرنے والی بیوی کی طرف سے اپنے شوہر کے لیے محبت بھرے جذبات کا اظہار ہی نہیں ملتا بلکہ اپنے دونوں بیٹوں جادو (جاوید اختر) اور اولیس (سلمان اختر) کی شرارتوں، کپڑوں، اسکول کی تعلیم، ان کی بیماری کا ذکر بھی جگہ جگہ ملتا ہے۔ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود صفیہ اختر اپنے خطوط میں انسانی رشتوں کے لیے بے چین نظر آتی

ہیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ انسانی اقدار کی قائل تھیں۔خطوط کے مطالعے سے تمام فرائض بخوبی انجام دینے والی ذمے دار عورت اور چراغ خانہ ہونے کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔اپنے بیٹے کی علالت کا ذکر ایک خط میں اس طرح کرتی ہیں:

''اچھا اختر دعا کرو میرا بیٹا اچھا ہوجائے۔میری دولت تو یہی ہے میری زندگی انھیں بیساکھیوں پر قائم ہے۔''14

صفیہ اختر کے خطوط میں عورت کی طرف سے جو گرم جوشی، محبت اور تصور عشق کا جذبہ ہر لفظ میں اپنی تمام رنگینیوں، وسعتوں، سرمستی اور سوز وگداز کے ساتھ نظر آتا ہے۔اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ہندی شاعری میں تو عورت کی طرف سے فریفتگی اور خود سپردگی کا اظہار ملتا ہے۔لیکن فارسی اور اردو شاعری میں عورت کی طرف سے اظہار محبت مختصر اور بڑی حد تک تخیلی ہے۔صفیہ اختر نے محبت کے جذبے کو جس خلوص، پاکیزگی اور نسائی خوبصورتی سے ادا کیا ہے اس پر شاعری کو بھی رشک آجائے۔

صفیہ اختر کے نزدیک ذہنی وابستگی ازدواجی زندگی کی محبت اور پاکیزگی کی سب سے اہم اور بڑی بنیاد ہے۔ذہنی وابستگی کے بغیر دو زندگیوں کا تصور بے معنی ہے۔ایک خط میں لکھتی ہیں:

''اب تم زندگی کے خارجی مناظر میں ایک رفیق کا اضافہ کر چکے ہو، یہ رفاقت ذہنی دنیا کے لیے بھی تو ضروری ہے۔اگر میری ذات تمہارے لیے Intellectual Companion نہ بھی ہو تو پھر یہ ظاہری رفاقت جلد ہی تمہارے لیے وبال دوش بن جائے گی۔''15

صفیہ اختر کے خطوط سادگی، سلاست، بے ساختگی اور ساتھ ساتھ رنگینی و رعنائی الفاظ کے حسن انتخاب کے ایسے نمونے ہیں جو ادب نوازی اور ادب شناسی کی پوری طرح غمازی کرتے ہیں۔خطوط میں جگہ جگہ اشعار کا حوالہ نکھرے ہوئے ادبی ذوق، طبیعت و مزاج کی لطافت و موزونیت کا ثبوت ہیں۔اشعار کے علاوہ تنقیدی شعور بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اجاگر ہے۔سرور اور احتشام حسین کی تنقید نگاری پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''سرور صاحب کا حال تو بس یوں بھی ہے اور یوں بھی والا ہے۔احتشام صاحب شریف نقاد۔دراصل ہمارے ادب کو ایک بلنسکی کی ضرورت ہے۔نقاد کا Attitude مصنف کی طرف ہمدردانہ ہونا چاہیے۔لیکن تنقیدی اصولوں کو نرم کرنے کی چھوٹ تو نہیں دی جاسکتی۔''16

خطوط میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے جواہر پارے مل

یہ خطوط کیونکہ ایک مشرقی عورت کے ذریعے اپنے شوہر کے نام تحریر کیے گئے ہیں اس لیے ان میں ہندوستانی گھرانے کی تصویر ملتی ہے۔ان خطوط میں بچوں، نوکروں، گاؤتکیوں، فرش پر بچھی ہوئی چاندنی، تخت پوشوں، بلاؤزوں اور ساڑیوں اور بچوں کی معصوم شرارتوں کا ذکر ملتا ہے۔ ساتھ میں ایک شوہر پرست بیوی کے متلاطم جذبات ہلکورے لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

جاتے ہیں۔جوان کی علمی معلومات اور فکر کی گہرائی کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جن میں انھوں نے اپنی عزیز ترین ہستی یعنی جاں نثار اختر پر بھی انگلی اٹھانے سے گریز نہیں کیا ہے۔

30اپریل 1952 کو صفیہ اختر علاج کی خاطر بھوپال سے لکھنؤ سے روانہ ہوگئیں۔کافی علاج ہوا لیکن 'مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی' جسم کی کھال خشک اور سکڑتی رہی۔بیماری کی وجہ سے قلم ہاتھ سے پکڑا نہیں جاتا تھا۔اس لیے زندگی کے آخری دور میں اپنی بہن حمیدہ سالم سے خط لکھوایا کرتی تھیں۔لکھتی ہیں:

''آخر یہ خاموشی کیوں تمہارا تغافل کل کا مرتا آج ہی مار ڈالے گا تم میری حالت آکر تو دیکھو۔میرے خط جلدی نہیں ملتے تو روٹھ جاتے ہو۔میری جان میرا جسم اکڑ کر رہ گیا ہے۔انگلیوں کا حال یہ ہے کہ قلم تک نہیں پکڑا جاتا۔نہ جانے کیسے کر کے چند سطریں لکھ لیتی ہوں۔اختر اب حمیدہ سے خط لکھوایا کروں گی۔تم اس تجویز سے ناراض نہ ہونا۔''17

صفیہ اختر کے خطوط میں ہجر و وصال کا ذکر رنگین ہے، محبت کی فراوانی ہے۔خطوط کی زبان عام فہم اور سادہ ہے۔ان میں مختلف قسم کے مسائل ہیں لیکن تلخی اور غیظ و غضب کہیں نہیں ہے۔خطوط میں کسی فلسفے کا اظہار نہیں ہوتا اور نہ ہی تصنع اور بناوٹ ہے۔صاف گوئی، وقار، ٹھہراؤ، تہذیب، اور سچی محبت کی جلوہ گری کے ساتھ خطوط میں جذبات کا بہاؤ ہے تو فکر کا ٹھہراؤ بھی موجود ہے۔بقول فراق گورکھپوری:

''یہ خطوط ایک ایسا انسانی نوشتہ یادستاویز (Human document) ہیں جس کی مثال بسا اوقات اچھے اور کامیاب ادب میں بھی نہیں ملتی۔ان خطوط کی ادبیت اگر تابناک ہے تو ان کی انسانیت تابناک تر ہے۔ہر خط میں ایک من موہنی شخصیت کا دل دھڑکتا ہوا سنائی اور دکھائی دیتا ہے۔آپ بیتی اور جگ بیتی کا سنگم ہر خط میں نظر آتا ہے۔کاش اردو میں ایسی کتابیں دستیاب ہوتیں، لیکن آئے دن ایسی کتابیں کہاں شائع ہوتی ہیں۔''18

صفیہ اختر اردو ادب میں ایسے اسلوب نگارش کی نمائندگی کرتی ہیں جو بقول ''باقر مہدی درد کی آنچ اور شبنم کی خنکی کا امتزاج ہے۔'' مطالعہ وسیع اور شعور پختہ ہے۔ساتھ ہی ان اقدار کی نمائندگی بھی کرتی نظر آتی ہیں۔جو آج کی عورت کی منزل ہے۔جو آج کی Feminist تحریک کی بنیاد ہے۔خود اعتمادی، اپنے مسائل کا مقابلہ کرنے کی جرأت، اور مرد کے شانہ بہ شانہ چلنے کی سکت ساتھ ہی نسائیت کی ملائمت اور نفاست، ممتا کا جذبہ، ایثار ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ صفیہ اختر کے خطوط اردو مکتوب نگاری میں گنج گراں مایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حواشی

1 صفیہ کے خطوط: جاں نثار اختر کے نام، ترتیب پبلشرز، میاں مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ اردو بازار، لاہور، ص 215
2 ایضاً، ص 207
3 ایضاً، ص 23
4 ایضاً، ص 152
5 ایضاً، ص 152
6 صفیہ کے خطوط، ص 230
7 ایضاً، ص 348
8 گھر آنگن: جاں نثار اختر، مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی، 1971، ص 83
9 صفیہ کے خطوط، ص 312
10 گھر آنگن: جاں نثار اختر، ص 85
11 صفیہ کے خطوط، ص 348
12 ایضاً، ص 349
13 زیرلب، ص 82-180
14 حرف آشنا، ص 189
15 ایضاً، ص 41
16 ایضاً، ص 414
17 ایضاً، ص 445
18 ہم ساتھ تھے۔حمیدہ سالم۔انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، 1999، ص 208

Dr. Shadab Tabassum
R/O, 23/14, Zakir Nagar, Okhla
New Delhi- 110025
Mob.: 09999149012

منظور احمد گنائی

ترنم ریاض کی شاعری میں نسائی ابعاد

1980 کے بعد ترنم ریاض کی غزلوں میں مخصوص تانیثی فکر و فلسفے اور اندازِ بیان کے ساتھ ساتھ مرد کی محکومیت اور جبر و استحصال کے خلاف احتجاجی مظاہرہ بھی مل جاتا ہے۔

نسائی لہجے کی شاعرہ ڈاکٹر ترنم ریاض ایک اہم شاعرہ کے طور پر ادبی دنیا میں متعارف ہیں۔ ان کے ادبی کارناموں میں غزل، نظمیں، ناول، افسانے اور دیگر تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کا اصل نام فریدہ ترنم تھا لیکن ادبی دنیا میں وہ ترنم ریاض کے قلمی نام سے جانی جاتی ہیں۔ان کی پیدائش سرینگر کے کرن نگر علاقے میں اگست 1963 میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم کرن نگر سرینگر میں ہی حاصل کی لیکن اعلیٰ تعلیم کے لیے کشمیر یونیورسٹی کا رخ کر کے پہلے وہاں سے ایم اے ایجوکیشن اور بعد میں ایجوکیشن میں ہی ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔آپ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کہانیوں سے کیا، سب سے پہلے 1973 میں آپ کی پہلی کہانی روزنامہ 'آفتاب' میں شائع ہوئی۔مزے کی بات یہ ہے کہ آپ نے 1983 میں پروفیسر ریاض پنجابی سے شادی کر لی جس سے وہ فریدہ ترنم سے ترنم ریاض بن گئیں۔ترنم ریاض ایک فعال اور کامیاب افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اہم شاعرہ بھی تھیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں عورتوں کے مسائل کو جس بے باکانہ انداز میں بیان کیا ہے وہ چونکانے والا ہے۔ان کے پہلے شعری مجموعے 'پرانی کتابوں کی خوشبو' کے فلیپ پر بلراج کومل کے یہ الفاظ درج ہیں:

''ترنم ریاض کی شاعری کائنات میں مناظر فطرت سے لے کر انسانی مسائل اور انسانی رشتوں کی گوناگوں کیفیات کی فنکارانہ تجسیم سے وابستہ ہے لیکن اس عمل میں نہ تو وہ موضوعات کی میزان سازی کرتی ہیں اور نہ ہی کوئی اشتہاری اعلان نامہ تیار کرتی ہیں۔ ان کی نظمیں اپنے متنوع دائرہ کار میں انسانی ردِعمل کی انتہائی نرم و نازک مثال ہیں۔ ان کی شاعری انسانی ہمدردیوں سے معمور ہونے کے علاوہ محبت اور امن کا پیغام دیتی ہیں۔''

(پرانی کتابوں کی خوشبو، فلیپ سے، بلراج کومل، ص15)

ان کے کل چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں پرانی کتانوں کی خوشبو، زیرِ سبزہ محوِ خواب، بھادوں کے چاند تلے (ماہیوں کا مجموعہ) اور 'چاند لڑکی' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جہاں تک ان کی غزل گوئی کا تعلق ہے۔ان کی غزلوں میں پرانی روایات سے انحراف نہیں ملتا ہے بلکہ وہی عشق و عاشقی کے قصے جنھیں غزل میں عام طور پر برتا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں عشق و عاشقی کو نت نئی خوبیوں کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح اس کے سارے امکانات اور وسعتوں کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ان کے پہلے شعری مجموعے 'پرانی کتابوں کی خوشبو' کو ناقدین ادب نے جس طرح سمجھا اور جو نتائج اخذ کیے ہیں اسی بنیاد پر ان کی شعری کائنات میں موجود فکری شعور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ اکیسویں صدی کی ایک اہم تانیثی آگہی کی پختہ شاعرہ اور فکشن نگار تسلیم کی جاتی ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف آخر کے بعد اردو ادب بہت ساری تحریکات ور جحانات سے متعارف ہوا، جس میں جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات پس ساختیات کے علاوہ تانیثیت وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دوسری تحریکات ور جحانات کی طرح ہمارے یہاں تانیثیت کا تصور بھی مغرب سے ماخوذ ہے۔مغرب سے پہنچنے والے اس رجحان نے مشرقی افکار وخیالات میں بھی بہت جلد اپنے گہرے نقوش مرتسم کیے ہیں۔ یہاں کے ادیبوں نے اس نئی فکر کو بہت جلد محسوس کر کے اس کے واضح محرکات کو پیش کیا۔ گویا اس مشرقی تہذیب

ومعاشرت نے اس نئے مغربی تصور کو کچھ نئے تحفظات کے ساتھ قبول کیا۔ 1980 کے بعد ترنم ریاض کی غزلوں میں مخصوص تانیثی فکر وفلسفے اور اندازِ بیان کے ساتھ ساتھ مرد کی محکومیت اور جبر واستحصال کے خلاف احتجاجی مظاہرہ بھی مل جاتا ہے۔ جس میں انھوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ عورت معاشرے میں کسی سے کم نہیں ہے اور نہ اس کے شعوری عرفان میں کسی قسم کی کمی ہے بلکہ عورت ابتدا سے ہی تغیر پذیر رہی ہے اس لیے انھوں نے احتجاجی ادب کی طرف بھی خصوصی توجہ مرکوز کی۔ مندرجہ ذیل اشعار میں ترنم صاحبہ نے مرد کی حاکمیت، صنفِ نازک کی دلی ہمدردی اور اپنی فکری بلندی کو جس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے وہ چیزے دیگر معلوم ہوتی ہے۔

شجر کو دیتی ہوں پانی وہ آگ اگلتا ہے
میں فصل خار کی چننے کو پھول بوتی ہوں
میں درد جاگتی ہوں زخم زخم سوتی ہوں
نہنگ جس کو نگل جائے ایسا موتی ہوں
وہ میری فکر کے روزن پہ کیل جڑتا ہے
میں آگہی کے تجسس کو خون روتی ہوں
فضا میں پھیل گیا ہے، تری زبان کا زہر
میں سانس لینے کی دشواریوں پہ روتی ہوں

اپنے شعری مجموعے 'زیرہ سبزہ محو خواب' کے دیباچے میں ترنم ریاض نے کائنات کی اصل محافظ اور معمار اول عورت کو قرار دیا ھے-ان کے نزدیک عورت مرد کے مقابلے میں نرم دل،جذبہ محبت سے سرشار اور تعمیری سوچ کی حامل مخلوق ھے-

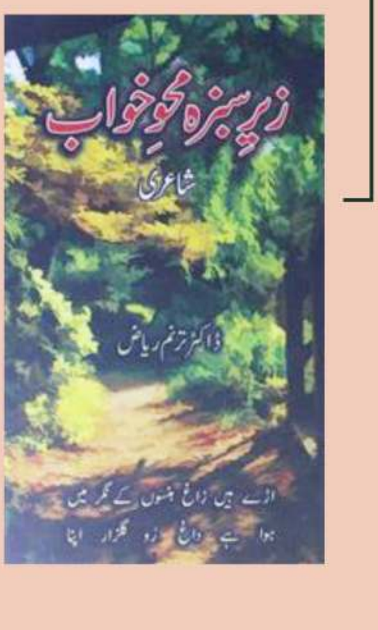

اردو کی مشہور شاعرات میں بالخصوص ترنم ریاض کے یہاں یہ تصور ایک نئے سیاق میں پیش ہوا ہے۔ انھوں نے عورت کی جبلی اور فطری خصوصیات کو تانیثیت کی رو سے دیکھا اور پیش کیا۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں خاص طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ اپنے شعری مجموعے 'زیرہ سبزہ محو خواب' کے دیباچے میں انھوں نے کائنات کی اصل محافظ اور معمار اول عورت کو قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک عورت مرد کے مقابلے میں نرم دل، جذبہ محبت سے سرشار اور تعمیری سوچ کی حامل مخلوق ہے۔ وہ ہمیشہ کائنات کے نظام کو خوب سے خوب تر بنانے کی سعی میں مصروف رہتی ہیں۔ موصوفہ کے مطابق:

"جن ماؤں کے احساسات زیادہ شدید تھے رفتہ رفتہ ان ہی کی نسلیں بڑھتی رہیں اور محفوظ رہیں۔ اُن میں یہ اشرف المخلوق بھی پائی جاتی ہے۔ گویا قدرت نے حیات کے تحفظ کا کام عورت کو سونپ دیا اور انا پرست مرد نے یہ سمجھ لیا کہ وہ ہتھیار بنا کر جب چاہے زندگی ختم کرنے کا پورا اختیار رکھتا ہے۔ اس نے بستیوں کو اجاڑنا اپنا پیدائشی حق سمجھ لیا۔ اور اس شوق کی تسکین کے لیے نت نئے ہتھیار تخلیق کرنا اپنے اولین فرائض میں شمار کرلیا۔"

(دیباچہ، 'زیر سبزہ محو خواب' از ترنم ریاض، ص 7)

ترنم ریاض کی شاعری کا خاص موضوع عشق رہا ہے۔ اس کے عشق کا کوئی عاشق یا محبوب کوئی خیالی محبوب نہیں رہا ہے، بلکہ اسی کرہ ارضی پر چلنے والا خالقِ لم یزل کا تخلیق کردہ بنی نوع انسان ہی ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ محبوب کی خاموشی کو برداشت نہیں کرسکتی۔ انھوں نے محبوب کی جدائی کو صحراؤں کی خاموشی سے تعبیر کیا ہے۔ ان کے اس جذبے کو مندرجہ ذیل اشعار سے بڑی خوبی کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے۔

کہیں خلوص پہ آئے نہ عشق کی تہمت
میرے حواس پہ چھاؤ نہ خوشبوؤں کی طرح
تمھاری چپ سے نہ ہم پہ سکوت چھا جائے
اندھیری رات کے ویران مقبروں کی طرح

متذکرہ شاعرہ نے محبوب کی جدائی اور زندگی کی شکست وریخت کا تذکرہ جگہ جگہ کیا ہے۔ بلکہ محبوب کی بے رخی، بے وفائی اور خود غرضانہ رویے کا تذکرہ بھی اپنے اشعار میں برملا کیا ہے۔ شاعرہ اپنے محبوب کو دعاؤں میں مانگا کرتی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ جس طرح ایک شعر کے اندر دو مصرعے آپس میں مفاہمت اور ربط رکھتے ہیں اسی طرح شاعرہ اپنی زندگی کو محبوب کے ساتھ بتانا چاہتی تھیں۔ ذیل کے کچھ اشعار سے شاعرہ کی چاہت کی عکاسی موثر انداز میں کی گئی ہے۔

گم نہ ہوجانا سرابوں کی طرح
تم کو مانگا ہے دعاؤں کی طرح
خود میں وہ اور ہیں اندیشوں میں گم
ساتھ میں شعر کے مصرعوں کی طرح

ترنم ریاض نے زندگی کے نشیب وفراز میں بہت سارے دُکھ، درد، احساسِ کمتری اور مایوسی کے کئی کٹھن راستوں کو عبور کیا ہے۔ زندگی کے نشیب وفراز میں وہ اپنے نصیب کو ہمیشہ برا بھلا کہتی رہی ہیں، اور اپنی زندگی کے سارے بھید اشاروں اور کنایوں میں بیان کرنے کی دلکش تحریک چلائی ہے۔ انھیں اس بات کا مصمم یقین تھا کہ میری دعائیں اور التجائیں بے اثر اور نامراد ہوکر ہی رہ جاتی ہیں۔ ان کے مطابق درختوں اور دیگر پودوں کی آبپاشی کرنے سے حسن وسرسبزی نکل آتی ہے لیکن بدلے میں درخت وہاں سے آگ اگلتے ہیں۔ پھول جیسے حسین وجمیل اور خوشبو دینے والے بیج بونے کے بعد وہاں سے پھول نہیں بلکہ کانٹے نکل آتے ہیں۔ زندگی سے اس حد تک بیزاری اختیار کرنا قنوطیت سے ہی تعبیر کیا جائے گا، اس کے علاوہ شاعرہ کے مطابق زندگی کی اس بے وفائی کی آلودگی میں سانس لینا بھی کارِ دارد والا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ نیز انھوں نے صنفِ نازک کے ساتھ دقیانوسی تصور رکھنے والوں کو بھی اس بات سے آگاہ کیا ہے کہ اکیسویں صدی کی خواتین تغیر وتبدل کی راہ میں مثالی کردار ادا کرنے میں کسی سے کم نہیں ہیں، بلکہ عصری زندگی کے مطالبات سے بھی ہم آہنگ ہونے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔

مری دعا میں نہیں معجزوں کی تاثیریں
نصیب کھوجنے والی میں کون ہوتی ہوں
شجر کو دیتی ہوں پانی وہ آگ اگلتا ہے
میں فصل خار کی چننے کو پھول بوتی ہوں
فضا میں چھوڑ دیے ہیں زباں کے رنگ اس نے
میں سانس لینے کی دشواریوں پہ روتی ہوں

ترنم ریاض کے مطابق انسان امن ومحبت کا ایک قیمتی ذخیرہ ہے۔ لہٰذا انسانوں کے درمیان ہمیشہ امن وآشتی، محبت، خلوص، بھائی چارہ، یگانگت، اتحاد واتفاق اور ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہونے کو ہی اولین ترجیح دی ہے۔

وہ اپنی غزلوں میں ہمیشہ اس بات پر زور دیتی رہی ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مستحکم رشتے بننے سے امن وآشتی کا ماحول نکھر کر آ سکتا ہے۔ ان کے کئی اشعار میں جدید دور کے مشینی کلچر سے منافرت اور بیزاری کی فکر بھی عیاں ہے کیوں کہ ان کے مطابق جدید زہریلی

”ترنم ریاض مرد اور عورت کے مقام ومنصب کی بات ہمیشہ کرتی آئی ہیں۔اُن کا ماننا ہے کہ مشرقی عورت کو تانیثیت جیسے تصور سے حد درجہ احتیاط برتنا چاہیے۔“

ادویات اور مشینوں سے نکلنے والا دھواں، زہریلی گیس اور کیمکلس سے مناظرِ فطرت پر کافی حد تک اثر پڑ سکتا ہے۔ ان کے مطابق جدید سائنسی مصنوعات سے انسانی، نباتیاتی اور حیواناتی زندگی کافی حد تک متاثر نظر آنے لگی ہے۔ اس طرح ان جدید مصنوعات سے نہ صرف انسانی زندگی متاثر ہوئی بلکہ ان چیزوں کے استعمال نے جانوروں اور پرندوں کے آشیانوں کو جلا کر راکھ کے ڈھیر بنا دیے ہیں۔

وحشتوں نے دیکھ ڈالا عظمتوں کا آگے گھر
کچھ سر مقتل ہیں کچھ سہمے ہوئے ہیں آجکل
اس جگہ پیڑوں کے جھرمٹ آشیاں چڑیوں کے تھے
کچھ دوکانیں، گاڑیاں، کچھ گھر کھڑے ہیں آجکل

ان کے ماہیوں کا ایک مجموعہ 'بھادوں کے چاند تلے' بھی منظرِ عام پر آیا ہے جس میں انھوں نے زندگی کو دیگر راستوں اور مشاہدات کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس مجموعے میں بھی اکثر اس بات کا گماں غالب نظر آرہا ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر انھیں انسانی زندگی سے محبت تھی اور وہ ہمیشہ بنی نوع انسان کو شفقت آمیز اور محبت شعار رہنے کی تلقین کرتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے اشعار میں زندگی کی تلخ سچائیوں کے ساتھ ساتھ زمانے کی کرب ناکی کا اظہار بھی کھل کر کیا ہے۔ اس بارے میں میر بشیر احمد لکھتے ہیں:

”ایک طرف ترنم ریاض روایات کا رنگ نہیں چھوڑ رہیں اور اس خوشبو سے مالا مال ہیں تو دوسری طرف انھیں زمانے کا کرب بہت ستا رہا ہے۔ انھیں دشمنوں کی بھی فکر ہے اور سرحدوں کی بھی۔ نظموں میں جو عکس ابھرتے ہیں وہ آفاقی ہیں اور اکثر شاعری میں انھوں نے انسانی کرب کو موضوع بنایا ہے۔ تخلیقی زبان سے لطف اٹھایا جاسکتا ہے اور نئی تراکیب واسالیب سے ترنم واقف کرواتی نظر آتی ہیں۔ انتہائی سادگی اور اختصار کے ساتھ ایک فنی معجزہ تیار کرنا ترنم کی عظمت ہے۔“

(ترنم ریاض، شعری مجموعہ، بھادوں کے چاند تلے، ص 223)

موصوفہ اپنی تخلیقی نگارشات میں مرد کو ہدفِ تنقید نہیں بناتی ہیں اور نہ ہی مرد کی ذات کے تئیں کسی قسم کی منافرت دیکھنے کو ملتی ہے۔ بلکہ ان کی تخلیقات میں ایک طرح سے مرد کی اصلاح کا عنصر پوشیدہ نظر آرہا ہے۔ وہ مرد اور عورت کے مقام ومنصب کی بات ہمیشہ کرتی آئی ہیں۔ اُن کا ماننا ہے کہ مشرقی عورت کو تانیثیت جیسے تصور سے حد درجہ احتیاط برتنا چاہیے، لیکن اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے مشرقی مرد اساس سماج اور پدرانہ معاشرے کے سامنے ہاتھ کھڑے کر دیے ہیں۔ وہ عورت کو آزاد اور مضبوط ہونے کا احساس بار بار دلاتی ہیں۔ اسے مجبور ومقہور زندگی گزارنے سے بیدار کرتی ہیں۔ اس کی عظمت اور احساس برتری کے لیے گن گاتی ہیں اور دنیا کے تمام شعبوں میں اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے میں آہنی طاقت کا حوصلہ دلاتی ہیں۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

بہت اب بھی ہے باقی سنگھرش اس کا
ہیں تازہ ہوائیں ہی سنکلپ اس کا
جو آبرو اٹھے تو سمجھنا وراثق
جو ٹوٹے گا کنگن، بنے گی کٹاری

جو مجھ کو آنکھ دکھائے گا تہذیب پہ داغ لگائے گا
پتھر کے دور کا انساں بھی پانی پانی ہو جائے گا
یا تم مجھ سے وفا کرو، یا میں ہرجائی بن جاؤں
مجھ سی ہو جاؤ ورنہ پھر تم جیسی ہو جاؤں گی

ترنم ریاض کو اپنے دو شعری مجموعوں 'پرانی کتابوں کی خوشبو' اور 'زیرِ سبزہ محو خواب' کی وجہ سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ ان مجموعوں نے انھیں عہدِ حاضر کے شاعرات میں نمایاں مقام عطا کیا۔ ان کی شاعری میں تحرک، امید، صبحِ نو کی تلاش اور آزادانہ زندگی کے قیمتی جوہر مل جاتے ہیں۔ ترنم صاحبہ ایک حساس، شائستہ، مخلص اور خلق عظیم سے مزین جیسی پیکر رکھنے والی صفات اور انفرادی لب ولہجہ جیسی شاعرات میں شمار کی جاتی ہیں۔ ان کے یہاں فکر وشعور کی جو داستان ملتی ہے اس میں متعدد مضامین وموضوعات کو ڈھونڈا جاسکتا ہے۔ عورت کی جبلت میں ودیعت ایزدی کے طور پر بہت سارے روپ پیوست کر دیے گئے ہیں۔ موصوفہ کا تعلق طبقۂ نسواں سے تھا اس لیے انھیں عورتوں کے جذبات ومحسوسات کو سمجھنے میں کسی قسم کی دقت نہیں آئی ہوگی۔ انھوں نے اپنی ایک مرتب کردہ کتاب میں اس بات کا تذکرہ بخوبی کیا ہے:

”خواتین فطرتاً قصہ گو اور شاعرات ہوتی ہیں۔ اپنے بچوں کو اصلی یا فرضی قصے کہانیاں سنانا، شعروں کو لوریوں کی مدھم دھنوں میں سمو کر دھیرے دھیرے بچوں کو سنا کر سلانا، دنیا کی ہر عورت کا، خواہ وہ کسی بھی خطے سے تعلق رکھتی ہو، محبوب مشغلہ ہے۔ اس لحاظ سے ہر عورت کو ایک فطری کہانی کار یا شاعرہ تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی لیے عورت کو غالباً 'ام القصص' بتایا جاتا ہے۔“

(ترنم ریاض، 'بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب' ساہتیہ اکادمی دہلی 2004، ص 7)

ان کی شاعری میں ہمیں متنوع موضوعات مل جاتے ہیں جن میں فطری، معاشی، سماجی، سیاسی اور ملکی غرض ہر طرح کے مضامین مل جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزل گوئی میں دورِ حاضر میں پیدا شدہ مسائل کو بھی سلیقہ مندی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی زندگی تغیر وتبدل سے مملو ہے اس لیے ان کی شاعری بھی وقتی تغیرات سے آراستہ وپیراستہ ہے۔ انھوں نے الفاظ کی ترتیب وتزئین میں اپنے تخیل کی بلند پروازی سے ایسا حسن پیدا کیا ہے جس کی مثال خال خال ہی ملتی ہے۔ ان کی شاعری عہدِ نو کی شاعری ہے جس نے انھیں اردو کی دنیائے شاعری میں یگانہ وقار عطا کیا۔

ایک طرف ترنم ریاض روایات کا رنگ نہیں چھوڑ رہیں اور اس خوشبو سے مالا مال ہیں تو دوسری طرف انھیں زمانے کا کرب بہت ستا رہا ہے۔ انھیں دشمنوں کی بھی فکر ہے اور سرحدوں کی بھی۔ نظموں میں جو عکس ابھرتے ہیں وہ آفاقی ہیں اور اکثر شاعری میں انھوں نے انسانی کرب کو موضوع بنایا ہے۔ تخلیقی زبان سے لطف اٹھایا جاسکتا ہے اور نئی تراکیب واسالیب سے ترنم واقف کرواتی نظر آتی ہیں۔ انتہائی سادگی اور اختصار کے ساتھ ایک فنی معجزہ تیار کرنا ترنم کی عظمت ہے۔

■

Manzoor Ahmad Ganie
Academic Counsellor Urdu (IGNOU)
Govt Womens Degree College
Anantnag - 192124 (Kashmir)
Mob.: 6005903959
Email:mganie283@ gmail.com

> ”مظہر امام صرف شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ ایک باخبر فرد اور ادبی حلقوں کی فعال شخصیت تھے۔ تحریک سے نظریاتی طور پر متفق بھی تھے اور متاثر بھی مگر اس کے باوجود ان کے ابتدائی دور کی غزل نے صرف اسلوب اور لفظیات ہی نہیں بلکہ موضوعات کے اعتبار سے بھی اپنا رشتہ شعر کی اسی دنیا سے استوار رکھا جس میں روایتی عشق کو مرکزیت حاصل تھی۔“

نجمہ رحمانی

نئے رستے بنانے والا شاعر مظہر امام

کلاسیکی دور سے عصر حاضر تک غزل نے ایک طویل سفر طے کیا۔ معتوب بھی ہوئی اور معشوق بھی رہی۔ تحریکات و رجحانات سے انفرادی آوازوں تک اس کی محبوبیت پر کوئی سوالیہ نشان (چند آوازوں کے استثنا کے ساتھ) نہیں لگا۔ وہ جنھوں نے غزل کے روایتی مزاج پر پے درپے وار کیے، وہ بھی اس کی کشش سے مسحور ہوئے بنا نہیں رہ سکے۔ سخت ترین تنقید کے باوجود حالی کی غزل میں اس روایتی رنگ کی کھنک سنائی دیتی ہے۔

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

نیم وحشی صنف سخن اور جاگیردارانہ تہذیب کی ترجمان ہونے کا الزام لگنے کے باوجود اس صنف نے مجروح جیسا ’سجیلا غزل گو‘ اور فیض جیسا کلاسیکی رچاؤ والا شاعر اردو کو دیا۔ غزل کی روایت نے سماج میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو موضوعاتی اور اسلوبیاتی دونوں سطحوں پر قبول کیا۔

ان تبدیلیوں کا اثر مظہر امام کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ ان کی غزلوں کی کلیات ’پالکی کہکشاں کی‘ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ ادوار کی اس تقسیم سے ان کے شعری سفر کے ارتقا کو باآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ روایت کی جس پاس داری کا ذکر کچھ دیر پہلے کیا گیا، 1943 سے 1961 کے درمیان کا عرصہ روایت سے اسی وابستگی کی مثال ہے۔ یہ اس ابتدائی دور کی غزل ہے جو ترقی پسند تحریک کے شباب کا زمانہ ہے۔ اس تحریک نے شاعری کو نئے موضوعات تو دیے مگر اس وقت تک ان موضوعات کے اظہار کے لیے نئی لفظیات تلاش نہیں کر سکی لہٰذا کلاسیکی شعری اسلوب ولفظیات ہی نئے معنی کے ساتھ ان موضوعات کے اظہار کا وسیلہ بنیں۔ لہٰذا ترقی پسند شعرا کے یہاں شمع، چراغاں، قفس، جنوں، خوش نوا وغیرہ لفظیات، استعاروں کی اسی تحدید کا نتیجہ تھی۔

جاؤ تم اپنے بام کی خاطر ساری لویں شمعوں کی کتر لو
زخم کے مہر و ماہ سلامت جشن چراغاں تم سے زیادہ
ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ
چاک کیے ہیں ہم نے عزیزو چار گریباں تم سے زیادہ

(مجروح)

قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہر خدا آج ذکر یار چلے
جنھیں خبر تھی کہ شرط نواگری کیا ہے
وہ خوش نوا گلۂ قید و بند کیا کرتے

(فیض)

البتہ معنی کی جدت نے اس کو محض تقلید کے الزام سے بچا کر روایت کی توسیع بنا دیا۔ ہر ادیب و شاعر خواہ اس کی نظریاتی وابستگی تحریک سے ہو یا نہ ہو، اس سے متاثر ضرور رہا۔ مظہر امام صرف شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ ایک باخبر فرد اور ادبی حلقوں کی فعال شخصیت تھے۔ تحریک سے نظریاتی طور پر متفق بھی تھے اور متاثر بھی مگر اس کے باوجود ان کے ابتدائی دور کی غزل نے صرف اسلوب اور لفظیات ہی نہیں بلکہ موضوعات کے اعتبار سے بھی اپنا رشتہ شعر کی

اسی دنیا سے استوار رکھا جس میں روایتی عشق کو مرکزیت حاصل تھی۔ غزل کا مخصوص مترنم اور رواں لہجہ اس دور کی غزل کا امتیاز ہے۔

ترا جمال نظر آفریں رہے اے دوست
مری نگاہ کا کیا ہے رہی رہی نہ رہی
پھر آپ نے دیکھا ہے محبت کی نظر سے
گزرے نہ کہیں گردش دوراں بھی ادھر سے
جب آپ خود ہی اپنی ادائیں نہ گن سکے
میں اپنے داغ دل کا کروں کس طرح شمار
کبھی انداز تغافل میں بھی لطف آیا ہے
کبھی طرز محبت بھی گراں گزری ہے
دل نازک تک آنچ آئی ہے
شعلۂ غم تری دہائی ہے
جب ہجر کی راتیں آتی تھیں خوابوں کے کنول جل اٹھتے تھے
شبنم کی سی نرمی ہو جس میں اس آگ کو ٹھنڈا کیوں کرتے
زخموں میں تازہ ہیں اب تک اس دست حنائی کی یادیں
جو ٹیس بھی ہے وہ رنگیں ہے اس رنگ کو پھیکا کیا کرتے

مگر پرانے رستوں پر چلتے ہوئے آنے والی تبدیلی کی ایک ہلکی آہٹ بھی کہیں کہیں سنائی دے جاتی ہے۔ حسن کو عشق کے کوچے میں دیکھ کر اس خیال کا آنا کہ کسی نئی روایت کی داغ بیل پڑ رہی ہے خود ان کی شاعری کے بدلتے ہوئے رنگ کی تمہید بھی ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ تبدیلی اچانک وارد ہونے کے بجائے آہستگی سے آئی ہے۔ یہ دور 1961 سے 1975 کے درمیان کا ہے۔ جب ایک عہد ساز تحریک اپنا کام اور اپنا وقت پورا کر کے تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ ایک نیا رجحان پنپنا شروع ہو گیا تھا۔ یہ رجحان جس نے اپنے سے پہلے ہر رجحان کو مسترد کیا اور ایک بالکل نئی زمین، نئی فضا، نیا ماحول، نئے موضوع اور نئی لفظیات کے ساتھ ادبی دنیا پر چھا گیا۔ گو کہ اس نسل کے شعرا کی جڑیں بھی اسی پرانی زمین میں پیوست تھیں مگر اس کے برگ و بار نئے تھے۔ یہاں ایک سوال یہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ جڑیں اسی پرانی زمین میں پیوست ہیں تو ہم نیا پن کسے کہیں گے۔ ظاہر ہے کہ غزل کی بنیادی ضرورت اس کا وہ سانچا ہے جس کے بنا اس صنف کی علاحدہ شناخت کی جانی ممکن نہیں ہے۔ تو پھر یہ تبدیلی خیال اور لفظ کی سطح پر ہی ممکن ہے۔ محمود ایاز کے مطابق:

''شاعری میں ہر نیا عہد، ہر نئی تحریک اپنے ذخیرۂ الفاظ، اپنی علامات اور اپنے استعاروں سے پہچانی جاتی ہے۔ ہر اسلوب اور ہر طرز بیان علامات اور استعارات کا ہر نظام مخصوص ذہنی ضروریات اور فکری پس منظر کے ساتھ وجود میں آتا ہے (محمود ایاز، جدید نظم نمبر، سوغات)

خیال کے ساتھ لفظ کے معنی کی یہ تبدیلی ترقی پسند تحریک کے ساتھ بلکہ اس سے قبل رونما ہو چکی تھی۔ مگر غزل کی زبان کے نئے سانچوں کی تشکیل اس نئے رجحان کی مرہون منت ہے، جسے ہم جدیدیت کے رجحان کے عنوان سے جانتے ہیں۔ اس رجحان نے اظہار کے نئے سانچے ہی فراہم نہیں کیے بلکہ غزلیہ شاعری کی پوری دنیا ہی بدل ڈالی۔

شہر سنسان ہے کدھر جائیں
خاک ہو کر کہیں بکھر جائیں

(ناصر کاظمی)

میں راکھ ہو گیا دیوار سنگ تکتے ہوئے
سنا سوال، نہ اس نے کوئی جواب دیا
جارہے تھے سر جھکائے سب کہیں
میں بھی ان میں تھا عجب اسرار تھا

(زیب غوری)

ہوئی رات میں اپنے اندر گرا
مری آنکھ سے پھر سمندر گرا
اکیلا تھا کسے آواز دیتا
اترتی رات سے تنہا لڑا میں
میں نوحہ گر ہوں بھٹکتے ہوئے قبیلوں کا
اجڑتے شہر کی گرتی ہوئی فصیلوں کا

(محمد علوی)

یہ تبدیلی اتنی تیز اور اتنی حیران کن تھی کہ بہتوں کے قدم ڈگمگا گئے۔ لیکن مظہر امام نے توازن کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس اعتراف کے ساتھ کہ

ساتھ بہتے ہوئے دھارے کے نہیں بہہ سکتے
میر کے رنگ میں ہم شعر نہیں کہہ سکتے

انھوں نے آہستہ خرامی کے اس نئے رنگ کے کچھ شیڈس کو استعمال کیا، اسی لیے ان کی اس دور کی غزلیہ شاعری ایک ملا جلا رنگ لیے ہوئے ہے اور وہ بیزاری، اکیلا پن، زرد اداسی، خلا اور ایک آسیبی فضا جس کے لیے جدیدیت کا نام بھی ہوا اور بدنامی بھی، مظہر امام کے یہاں اس شدت سے نظر نہیں آتی۔ البتہ لہجے میں تبدیلی اتنی واضح ہے کہ اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ابھی سے ٹوٹتے لمحوں کی گرد اڑنے لگی
یہ راستہ تو بہت دور جانے والا تھا
یہ تو سچ ہے کہ اسے پیار نہیں تھا یارو
میں بھی کچھ ایسا وفا دار نہیں تھا یارو
دشت میں تھے تو یہ زنجیر ملاقات نہ تھی
ہم ترے شہر میں پہنچے تو گرفتار ہوئے
جو اَب مڑے تو نگاہیں بھی نور کھو دیں گی
کہ اپنی پشت پہ گرد پس سفر بھی ہے
میں دیوار تمنا سے اترتی ہوئی دھوپ
اپنی تنہائی کے آنگن میں بٹھا لو مجھ کو
اپنی ہی چیخ چار طرف سے ابھر گئی
آواز دوستو کو لگائی جو کو بہ کو
چیخوں کے اژدہام میں تنہا ہے آدمی
اے زندگی بتا کدھر جا رہی ہے تو

یہ رنگ جدیدیت کی لہر سے متاثر ہے مگر اس کے ساتھ ہی رنگ قدیم بھی چپکے چپکے ساتھ چل رہا ہے۔ بلبل و گل و خار سے دامن چھڑانا یوں بھی آسان نہیں ہے اسی لیے اس دور میں نئے اور پرانے کی آمیزش سے کہیں کوئی نیا رنگ

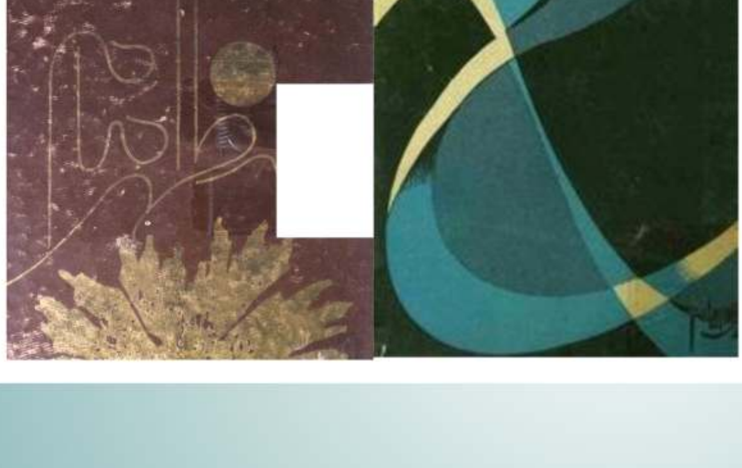

مظہر اما م کی شاعری میں الفاظ کی شعبدہ گری نہیں ہے اسی لیے اظہار کی لاچاری بھی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے ان کی غزل کے نکھار میں جو رنگ غالب ہے وہ ارضی اور انسانی عشق کا سنجیدہ اور باوقار رنگ ہے۔ یوں تو یہ رنگ ان کے یہاں ابتدائی دور سے ہی نمایاں ہے، مگر اس دور کی غزل میں اس عشق کی تازہ کاریاں جا بہ جا اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ نئے زمانے کے نئے عشق کی واردات میں بدن بھی ہے اور روح بھی، بے خودی بھی ہے، خواب بھی اور ان خوابوں کی گمشدگی کا افسوس بھی۔ مگر یہ افسوس، افسوس کی حد سے گزر کر نوحہ نہیں بنتا۔

بنایا گیا ہے اور کہیں طرز کہنہ کو براہ راست اختیار کیا گیا ہے۔ خاص طور پر پنبہ در گوش، تندیِ صہبا، برگ نسترن اور خاک چمن جیسی تراکیب اور الفاظ کے استعمال میں یہ روایتی انداز صاف نظر آتا ہے۔

کچھ اور سلسلہ ہے ہمارا گلوں کے ساتھ
مثلِ نسیم، خاک چمن چھانتے نہیں

پنبہ در گوش ہیں سب حال سناتے ہو عبث
بوجھ الفاظ کا ہونٹوں پہ اُٹھاتے ہو عبث

وہاں تھی تندیِ صہبا یہاں شکستہ وجود
یہ سنگ صبح ہے وہ شب کا آبگینہ تھا

دھلی ہوئی ہے فضا برگ نسترن کی طرح
لباس درد بھی بے داغ ہے کفن کی طرح

موضوعات کے معاملے میں بھی وہ سنبھل سنبھل کے قدم اٹھاتے ہیں۔ عقیدوں کی شکست و ریخت پر ماتم کناں ہونے کے بجائے اکثر اس کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔ نئی نسل کی تشکیک اور ہر شے کو پرکھنے پر اصرار انھیں شاید پسند ہے اس لیے اس نوع کے اشعار میں کہیں کوئی شکوہ یا تنقید نہیں بس ایک بیان ہے۔ کبھی کبھی ناسٹلجیا کی کیفیت سے گزرنے کے باوجود خوش خیالی اور خوش خوابی کو عزیز رکھتے ہیں کہ یہ خواب ہی ان کی پناہ گاہ بھی ہیں۔

عصر نو مجھ کو نگاہوں میں چھپا کر رکھ لے
ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا سرمایہ ہوں

اب لوگ صرف آنکھ سے پہچانتے نہیں
چھو کر جسے نہ دیکھیں اسے مانتے نہیں

نئے مکاں میں عقیدے کی کوئی جا ہی نہیں
خدا تو ہے پہ کہیں بندۂ خدا ہی نہیں

دیار خواب ہے آؤ یہیں قیام کریں
یہاں سے یوں بھی نکلنے کا رستہ ہی نہیں

دن کا سورج آگ اگل کر آخر خود بھی راکھ ہوا
سوکھی پیاسی رات پہ اپنے سپنوں کی برسات کروں

وقت کے ساتھ داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر ارتقا کی منزلیں طے ہوتی ہیں۔ دوسرے دور میں دو رنگوں کی یہ جھلملاہٹ ان کے تیسرے اور چوتھے دور کی شاعری میں کچھ اور کھل کر سامنے آئی ہے۔ انھوں نے اپنے وقت کے ماحول کا اثر قبول تو کیا مگر اپنے کلام پر کسی خارجی دباؤ کو اس حد تک حاوی نہیں ہونے دیا کہ اس کے بوجھ تلے ان کی انفرادیت دبنے لگے۔ ان کی سچائی کسی دوسری سچائی سے متصادم نہیں ہے۔ کبھی غزل کا تمام حسن زبان کی صنعت گری میں تھا، آج موضوع کو زبان پر اور اسلوب کو لفظ پر فوقیت حاصل ہے۔ تخلیق کار کے وجدان اور قاری کے درمیان اکثر ایک خلیج حائل رہتی ہے۔ بعض اوقات قاری اس خلیج کو عبور کر کے فن پارے کی روح کو پا لیتا ہے مگر اکثر وہ اپنے معنی کے کنارے سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔ یہ خیال کہ ایک بار اپنے قاری تک پہنچنے کے بعد فن پارے پر فنکار کا حق نہیں رہ جاتا ہے۔ وہ اس سے جو معنی چاہے اخذ کرے، اس حد تک تو درست ہو سکتا ہے کہ پڑھنے یا سننے والا اپنے خیال یا کیفیت کے مطابق اس کی تعبیر کر لے مگر فن پارہ کس تخلیقی وفور کے زیر اثر وجود میں آیا وہ صرف تخلیق کار جانتا ہے۔ یوں معنی کی مکمل تفہیم وتیریا کا دعویٰ بہت سچا نہیں ہو سکتا۔ یہ پیچیدگی خاص طور پر فن کے گنجان اور علامتی اظہار میں پیش آتی ہے۔ غزل کی شاعری میں تعبیر و تفہیم کے الجھاؤ اکثر اظہار کی ناکامی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ مظہر امام کی شاعری میں الفاظ کی شعبدہ گری نہیں ہے اسی لیے اظہار کی لاچاری بھی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے ان کی غزل کے نکھار میں جو رنگ غالب ہے وہ ارضی اور انسانی عشق کا سنجیدہ اور باوقار رنگ ہے۔ یوں تو یہ رنگ ان کے یہاں ابتدائی دور سے ہی نمایاں ہے، مگر اس دور کی غزل میں اس عشق کی تازہ کاریاں جا بہ جا اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ نئے زمانے کے نئے عشق کی واردات میں بدن بھی ہے اور روح بھی، بے خودی بھی ہے، خواب بھی اور ان خوابوں کی گمشدگی کا افسوس بھی۔ مگر یہ افسوس، افسوس کی حد سے گزر کر نوحہ نہیں بنتا۔ عشق کے بنتے بگڑتے دائروں کے درمیان جذبوں کے لرزتے عکس سے مزین ان اشعار میں دل اور دنیا دونوں شامل ہیں۔

سپردگی کا نشہ بھی عجیب نشہ تھا
وہ سر سے پاؤں تلک التماس لگتا تھا

تم کو پتا ہوگا کہ ہمراہ تمھیں تھے
دنیا مرے خوابوں کو کدھر لے کے گئی ہے

یوں نہ مرجھا کہ مجھے خود پہ بھروسہ نہ رہے
پچھلے موسم میں ترے ساتھ کھلا ہوں میں بھی

جسم کی آگ پہ پھول کھلتے ہوئے
ایک گھر تیز بارش میں جلتا ہوا

تھا دیکھنے میں سادہ رو مگر بڑا ذہین تھا
مجھے گناہگار کر کے وہ ثواب لے گیا

یہ تجربہ بھی کروں یہ غم بھی اُٹھاؤں میں
کہ خود کو یاد رکھوں اس کو بھول جاؤں میں

جانے کس سمت چلوں کون سے رخ مڑ جاؤں
مجھ سے مت مل کہ زمانے کی ہواہوں میں بھی

گو کہ چوتھا اور آخری حصہ جس میں 1989 سے 2000 تک کی غزلیں شامل ہیں ان میں رجائیت کا یہ رنگ اڑتا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔

اور کیا ہے بس اک کاسۂ انا کے سوا
وہ دن کہ رقصِ گِل کوزہ گر سے رغبت تھی

گرتی ہوئی دیوار کو سب دیکھ رہے تھے
اس شہر میں کچھ اور تماشا بھی نہیں تھا

وہ اپنے نقش قدم پہ فریفتہ تھا بہت
نئے خیال نئی آواز پا سے ڈرتا تھا

کیسا خیال کس کا تصور، کہاں کی یاد
کن بے خیالیوں میں گزرنے لگی ہے شام

ان کی شاعری میں بہت سے رنگوں کی آمیزش اسے یک رنگی ہونے کے الزام سے بچا لیتی ہے۔ اس غزل کا ایک اختصاص اس کا رجائی پہلو بھی ہے۔ مظہر امام کا شمار شعرا کی اس نسل میں ہوتا ہے جن کے سامنے ادبی افق پر کئی

رنگ ابھر کر ڈوب گئے اور جنھوں نے ان سب رنگوں سے استفادہ کیا مگر کسی ایک رنگ کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ یہی قوس قزح ان کی انفرادیت بھی ہے۔

غزل پر بات کرنے کے لیے اسے دو سطحوں پر دیکھنا ہوتا ہے۔ ایک ہیئت اور دوسرا اسلوب و الفاظ۔ غزل کی ہیئت میں تبدیلی کی گنجائش تقریباً نہیں کے برابر ہے کہ یہ ہیئت ہی ہے جس کے سبب اس کی دوسری اصناف شاعری سے علاحدہ شناخت قائم ہوتی ہے۔ گو کہ ماضی قریب میں اس کی ہیئت پر تجربے کرنے کی کوشش کی گئی آزاد غزل کا تجربہ تو خود مظہر امام صاحب نے کیا بلکہ انھیں آزاد غزل کا موجد بھی قرار دیا جاتا ہے حالانکہ کچھ ناقدین نے اس دعوے پر سوالیہ نشان بھی لگاتے۔ بہر حال اس وقت اولیت کا معاملہ زیر بحث نہیں ہے۔ مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس تجربے کو خود مظہر امام صاحب بہت دور تک ساتھ لے کر نہیں چل سکے۔ ان کی کلیات 'پالکی کہکشاں کی' میں آزاد غزلوں کی مجموعی تعداد دس ہے جو 1945 سے 1993 تک کہی گئیں۔ غزل کی ہیئت کے تجربوں کی ناکامی کا یہ مدلل ثبوت ہے کہ خود موجد بھی اپنے کلام میں اسے اپنے مخصوص اسٹائل کے طور پر استعمال نہیں کرتا۔ جیسا کہ ابھی کہا گیا کہ نظم کے برخلاف غزل کے خاکے میں کوئی بڑی تبدیلی ممکن بھی نہیں اسی لیے زیادہ سے زیادہ ارکان کی کمی بیشی سے کوئی نئی صورت تشکیل دی جا سکتی ہے۔ مظہر امام نے خود بھی اس فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''آزاد غزل اور پابند غزل کی ہیئت میں بنیادی فرق ایک ہی ہے یعنی مصرعوں کے ارکان میں کمی بیشی ورنہ تمام لوازمات قدرے مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی بحر، ردیف، قافیہ، اشعار کی تعداد وغیرہ'' اس ضمن انھوں نے ایک اور دل چسپ بات لکھی ہے ''مسلسل غزل کی طرح مسلسل آزاد غزل بھی ہو سکتی ہے۔ اگر مسلسل غزل کو نظم کا نام دیا جا سکتا ہے تو مسلسل آزاد غزل کو بھی آزاد نظم کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔'' (آتی جاتی لہریں، ص 69-68)

اب ذہن میں سوال اُٹھنا لازمی ہے پھر آپ آزاد غزل اور آزاد نظم میں فرق کیسے اور کیوں کریں۔ اور پھر یہ ایک نیا تجربہ کیوں کر کہا جائے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے کہ:

''کسی بھی روایت میں توسیع یا تبدیلی یا اضافہ اسی وقت ممکن ہے جب خود شاعر اس روایت پر پوری طرح حاوی ہو پھر دوسری بات یہ ہے کہ روایت میں توسیع یا تبدیلی سے مراد یہ نہیں ہے کہ کوئی اینڈا بینڈا شعر کہہ دیا جائے اور یہ دعویٰ کیا جائے کہ صاحب ہم نے تو روایت میں تبدیلی یا توسیع و اضافہ کیا ہے۔ تبدیلی ہو یا توسیع و اضافہ اس کی شرط یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی نہج پر روایت کے ساتھ ہم آہنگ ہو اس میں کھپ سکے یعنی جو تبدیلی ہو وہ روایت سے متغائر و متحارب نہ ہو اس سلسلے میں تبدیلی سے زیادہ تبدیلی کو برتنے کا طریقہ یعنی شاعر کا اسلوب اہم ہے۔''

قطع نظر اس کے کہ آزاد غزل واقعی کوئی کامیاب تجربہ تھا یا نہیں یہ بات تو طے ہے کہ مظہر امام نے ارکان اس کمی بیشی کے باوجود غزل کے مخصوص مزاج کو تجربے کی نذر نہیں کیا۔

اس قدر مسحور تھے اس کے حسن بیان سے
اس کے لفظوں کی طرف ہم نے دیکھا ہی نہیں
شاخ در شاخ گلابوں کی دھنک پھوٹی ہے
اک پرندہ تھا یہیں رہتا تھا
خاک اڑتی ہوئی دیکھی تو دلوں کی یاد آئی
کیا یہاں کوئی حسیں رہتا تھا

> **آزاد غزل اور پابند غزل کی ہیئت میں بنیادی فرق ایک ہی ہے یعنی مصرعوں کے ارکان میں کمی بیشی ورنہ تمام لوازمات قدرے مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی بحر، ردیف، قافیہ، اشعار کی تعداد وغیرہ'' اس ضمن انھوں نے ایک اور دل چسپ بات لکھی ہے ''مسلسل غزل کی طرح مسلسل آزاد غزل بھی ہو سکتی ہے۔ اگر مسلسل غزل کو نظم کا نام دیا جا سکتا ہے تو مسلسل آزاد غزل کو بھی آزاد نظم کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔**

یوں بھی جی لیتے ہیں جینے والے
کوئی تصویر سہی آپ کا پیکر نہ سہی

آزاد غزل کی یہ مثالیں کم از کم لفظیات کی سطح پر روایت سے ان کی وابستگی کی نشان دہی تو ضرور کرتی ہیں۔ ان اشعار میں روایت کی توسیع ہو یا نہ ہو مگر اس کی پاس داری ضرور ہے۔

آزاد غزل کے ذاتی تجربے یا بازیافت کے ساتھ وقتاً فوقتاً کیے جانے والے شعری تجربوں کو بھی انھوں نے کم از کم چھونے کی حد تک ضرور برتا۔ اینٹی غزل نے ایک دور میں مقبولیت تو خیر حاصل نہیں کی مگر شعری اور تنقیدی حلقوں میں موضوع گفتگو ضرور رہی۔ اب خدا جانے اس میں کوئی کشش تھی یا محض ذائقہ بدلنے کی خاطر مگر مظہر امام نے یہ تجربہ کیا گو کہ اس کی مثال میں ان کی کلیات سے ایک آدھ مثال ہی پیش کی جا سکتی ہے۔ ذہنی طور پر متحرک تخلیق کار ہر نئے رنگ کو ایک بار تجربے کی کسوٹی پر ضرور پرکھنا چاہتا تھا۔ مظہر امام تو یوں بھی تجربوں کے شوقین ہیں۔ ہر تیز رو کے ساتھ تھوڑی دور چل لینے کے شوق میں انھوں نے بھی چند مہمل شعر اس اعتراف کے ساتھ کہہ ڈالے

چند مہمل سے شعر بھی کہیے
شاعری کے نئے تقاضے ہیں

اینٹی غزل کے تجربے کے طور پر ان کی کلیات میں ایک ہی غزل شامل ہے۔

اک انجانی لاش کے آگے
پاگل کتا بھونک رہا تھا
فٹ پاتھوں پر نیند پڑی تھی
سورج سر پر آن پڑا تھا
سایہ سایہ آگ لگی تھی
پتہ پتہ ہانپ رہا تھا

مگر روایت سے تربیت پانے والے شاعر ایسے تجربوں کے ساتھ ذہنی مطابقت نہیں رکھتے۔ سو وہ بھی اس مختصر سے تجربے کے ساتھ دور تک نہیں چل سکے اور اپنی راہ پر لوٹ گئے اور مظہر امام ہی کیا، جن شعرا نے خاصے طمطراق کے ساتھ اس غیر شاعرانہ غزل کی وکالت کی تھی کچھ وقت بعد وہ خود بھی اس سے تائب ہوئے۔

مظہر امام کی غزلیہ شاعری کے ان رنگوں میں ان کی شاعری کی جو تصویر بنتی ہے وہ رنگ خاص نہ سہی مگر ایک ایسی دھنک کا تصور ضرور پیش کرتی ہے جس میں یکسانیت کے بجائے ایک نوع کی رنگینی ہے۔

■

Prof. Najma Rahmani
Dept of Urdu, Faculty of Arts
Delhi University
Delhi- 110007

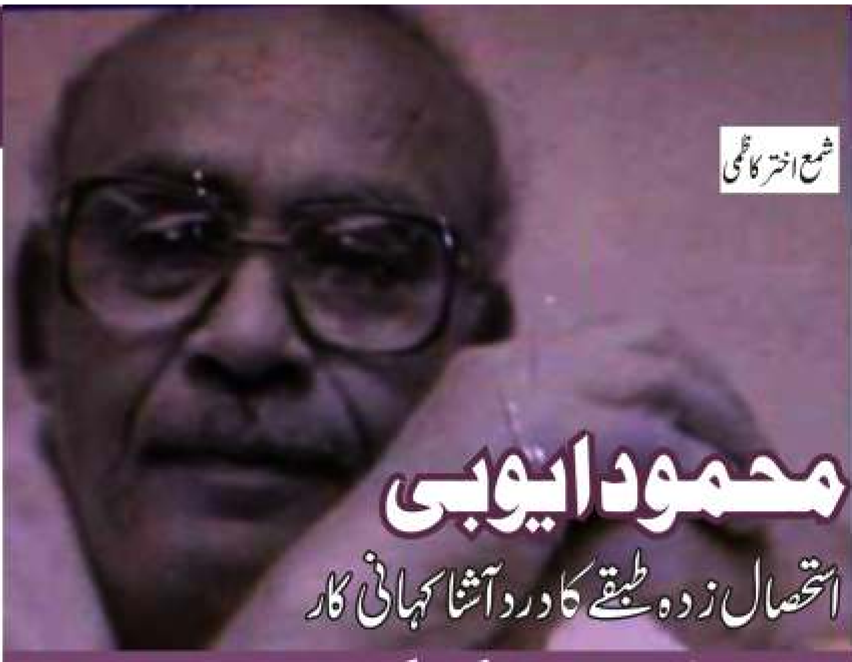

شمع اختر کاظمی

محمود ایوبی

استحصال زدہ طبقے کا درد آشنا کہانی کار

> **صحافت کا پیشہ دراصل اپنے ارد گرد دیگر مصروفیات میں سرکھپانے کی نہ مہلت دیتاہے اور نہ افسانوی ادب اور ادبی وفنی کارنامے کو پورے طور پر منصہ شہود پر آنے کا موقع۔**

محمود ایوبی اردو دنیا میں افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔ واقعات کو افسانے میں ڈھالنے کے ہنر آشنا ایوبی صاحب کا وژن اور زاویہ نگاہ بھی معاصرین سے خاصا مختلف ہے۔ ان کے یہاں موضوع بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ زیادہ تر کہانیاں عام فہم زبان و بیان اور انسانی نفسیات کے گہرے مطالعے کے ساتھ وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی افسانے کا بنیادی ڈھانچہ سفاک حقیقت نگاری کی ترسیل کی ناؤ پر سوار ہوتا ہے۔ زبان بہت سادہ، دل آویز جس میں تصنع اور بناوٹ کا شائبہ تک نہیں۔ تکنیکی مہارت کے لوازمات سے پرے زبان کہانی کی تخلیق کے ساتھ از خود ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ ایوبی صاحب کو مختلف طبقوں کی زبان، ماحول، طرز زندگی اور اس کے تخلیقی اظہار پر قدرت حاصل ہے۔ وہ پیش کردہ مسائل، کرداروں کی نفسیات، حالات کے پیچ وخم، فضا آفرینی اور لاشعور کے وسیلے سے حقیقت کا ادراک یہ ایسی خصوصیات ہیں جو قاری کی توجہ مبذول کر لیتی ہیں۔

ایوبی صاحب ریاست بہار کے ضلع مونگیر میں 10 فروری 1939 کو پیدا ہوئے۔ ایسے درویش صفت انسان کی خوش اخلاقی وخوش مزاجی کا ہر شناسا قائل ہے۔ جس محفل میں جاتے اپنی بذلہ سنجی، برجستگی اور شگفتہ جملوں سے اہل محفل کا دل جیت لیتے۔ محفل کو لالہ زار بنادیتے۔ فطرت کی بے نیازی ایسی کہ افسانے کو زندگی کا ترجمان بناتے رہے اور گرد شہرت کو بھی دامن سے لپٹنے نہ دیا۔

معروف شاعر، ادیب ومبصر رفیق جعفر نے لکھا...

''محمود ایوبی کے افسانوں کے موضوعات عصری مسائل پر منحصر ہیں۔ ان کے افسانوں میں ابہام اور علامت نام کو نہیں۔ زبان سادہ اور طرز بیان اثر انگیز ہے۔ قاری افسانے کی بنائی ہوئی فضا میں کھوسا جاتا ہے اور اختتام پر چونک اٹھتا ہے۔''

ایوبی صاحب زمین سے جڑے اس تہذیبی روایت کے پاسدار ہیں جس پر پریم چند اور راجندر سنگھ بیدی کے نقش پا مرتسم تھے۔ کہانی کی ایسی بنت کاری کہ کردار زندہ وجاوید، زندگی کی حقیقتوں سے بھرپور اور طرز تحریر حقیقت بیانی کا مرقع معلوم ہونے لگی۔ لفظوں اور سوچوں کے دریا میں ڈوبتا ابھرتا قاری ان کے ست گن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

عام انسانوں کی مجبوریوں اور مسائل پر ان کا نہ صرف دل دھڑکتا بلکہ نگاہیں مظلوموں کو تلاش کرتیں۔ سیدھی سادی مہذب زندگی کے ساتھ انسان دوستی کے قائل اور امن وامان پسند سماج پر وہ مائل رہے۔ تاعمر قلم کی مزدوری کی۔ فطری طور پر فکشن رائٹر رہے، ساتھ ہی ایک ایماندار وبیباک صحافی بھی، مگر صحافتی ذمے داریاں اس طرح دامن گیر رہیں کہ افسانوی ادب کو تنگ دامنی کا شکوہ ہی رہا۔ وہ نہ بسیار نویس رہے نہ نام ونمود کی خاطر افسانے لکھے۔ جتنا لکھا اس میں انسانی دکھ درد کی ترجمانی اور سماجی مسائل کی بیباک ومعیاری ماجرا سازی کی۔ کسی سنجیدہ تخلیق کار کا فنی حسن بھی یہی ہے کہ کہانی قاری کے ذہن ودل میں نقش ہوجائے۔ کہانیوں میں کیے تجربات کی نظیر دیگر ہم عصر فنکاروں میں بمشکل ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

موصوف نے اپنی روحانی تسکین اور ضمیر کی آواز پر صحافت کا پیشہ اپنایا۔ فکر وشعور کے اس سفر کو پوری ذمے داریوں سے نبھایا۔ اخبار کے دفتر میں خبروں کی خبر لیتے، املے جملے درست کرتے، خبروں میں خبر تلاش کرتے، روزانہ سیکڑوں صفحات سیاہ کرتے کہ یہی ذریعۂ معاش اور غم روزگار رہا۔ جس سے برسوں نباہ کیا۔ صحافت کا پیشہ دراصل اپنے ارد گرد دیگر مصروفیات میں سر کھپانے کی نہ مہلت دیتا ہے اور نہ افسانوی ادب اور ادبی وفنی کارنامے کو پورے طور پر منصۂ شہود پر آنے کا موقع۔ ایک صحافی کی مصروفیات ہمیشہ ایک افسانہ نویس پر حاوی رہیں جس نے قلم کی جولانی کو مہمیز کیا اور ادب سے بھرپور لگاؤ میں بھی رخنہ انداز بنی۔

اپنی طویل صحافتی زندگی میں انھوں نے صحافت کے تین باہم شعبوں میں کام کیا۔ ادب، صحافت اور افسانہ نویسی۔ مختلف اخبارات اور رسائل میں لکھے ان کے اداریے، شذرات اور مضامین پوری علمی شان رکھتے ہیں۔ اپنی ان نثری تحریروں سے وہ ایک متوازن ومتنوع سوچ مبصر اور مضمون نگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

محمود ایوبی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد کلکتہ چلے آئے۔ ایک عرصہ تک روزنامہ 'آزاد ہند' سے منسلک رہے۔ بعد ازاں غلام سرور کی ادارت میں پٹنہ سے نکلنے والے روزنامہ 'سنگم' میں بحیثیت نیوز ایڈیٹر بحالی ہوئی۔ ایوبی صاحب کی صحافتی، ذاتی اور شخصی خوبیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے انگریزی، ہندی اور اردو ہفت روز بلٹز کے مدیر اعلیٰ آر کے کرنجیا نے انہیں ہفت روزہ بلٹز کے اردو ایڈیشن کا سب ایڈیٹر اور پھر ڈپٹی ایڈیٹر سے ایگزیکیٹو ایڈیٹر مقرر کردیا۔ اپنے دور کا انتہائی با اعتبار اور معیاری صحافت کا ترجمان یہ اخبار رہا۔

ایک زمانہ ایوبی صاحب کی صلاحیتوں کا معترف رہا۔ مزاج اور منہاج کے زاویے سے حقیقت پسند صحافی وافسانہ نگار۔ ادبی زندگی کا آغاز رسالوں کی ادارت سے ہوا۔ ادب میں کلاسیکی روایتوں کے پرستار رہے۔ سفر حیات کا مطالعہ وتجزیہ کرنے والے اس بات سے واقف ہوں گے کہ موصوف بنیادی طور پر ایک سچے، مخلص انسان اور تجربہ کار صحافی اور زندگی کی حقیقتوں کو افسانے میں اجالتے تخلیق کار رہے۔ زندگی اسی دشت کی سیاحی میں گزاری۔ اپنی کہانیوں میں نہ تکنیکی تجربے کیے، نہ تخیل کی اونچی اڑانیں بھریں، نہ علامت نگاری کی اور نہ استعارہ سازی سے اپنی تحریر کو بوجھل کیا بلکہ عام لوگوں کے حالات وواقعات پر عقابی نظر رکھا۔ پہلا افسانوی مجموعہ 'دوسری مخلوق' 1990 اور 'پری کتھا' 2009 میں شائع ہوا۔ 'پری کتھا' افسانوی مجموعے میں گیارہ کہانیاں شامل ہیں۔ 'دوسری مخلوق' میں شائع افسانہ 'جنازہ' کا آسامی، ہندی، مراٹھی اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ چھپا، ساتھ ہی ایک اور افسانہ 'بن باس' پر ٹیلی فلم بنی۔ جوگندر پال نے لکھا... ''آپ کی سبھی کہانیاں میں نے بڑی دلچسپی اور انہماک سے پڑھی ہیں اور آپ کے اعجاز کار سادگی، دردمندی اور بے چینی سے از حد متاثر ہوا ہوں۔ آپ کی کہانی 'جنازہ' تو دل ودماغ میں اتنی رچ بس گئی مانو اسے فضلو ہی کے مانند جی لیا ہو۔''

محمود ایوبی صاحب کے بلٹز سے ایگزیکٹیو ایڈیٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہونے کے بعد افسانوی مجموعہ 'دوسری مخلوق' شائع ہوا تو ادب کے قارئین ان کے افسانہ نگار ہونے پر حیرت زدہ رہ گئے کہ ایسے متحرک زندہ دل صحافی مگر اتنے لاپرواہ وہ بھی اپنی کہانیوں کے تعلق سے۔ بلٹز سے پچیس سالہ وابستگی کے دوران ان کے اندر کا صحافی، افسانہ نگار پر اتنا حاوی رہا کہ ان پچیس سالوں میں ان کے صرف تین افسانے بلٹز میں شائع ہوئے۔ کسی نے جانا تو کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ دل کے نہاں خانے میں سویا افسانہ نگار جب جاگتا تو وہ افسانے کی بساط سجا لیتے ورنہ کیا صحافت کے باڑے میں پھنسا انسان اتنی آسانی سے گلوخلاصی پا سکتا ہے۔

ایوبی صاحب جیسے دیدہ بیں فنکار نے اپنے افسانوی مجموعے کو ترتیب دیا تو بڑی غور و فکر کے بعد دس افسانوں پر مشتمل مجموعے کو مکمل کر دیا جو تخلیقی و تجزیاتی اعتبار سے انتہائی کامیاب سماجی و تمدنی زندگی کے عکاس و ترجمان ہیں۔ ان دس افسانوں نے ان کی افسانوی زندگی پر ایسا کامیاب اور مثبت اثر ڈالا کہ آج تک انہیں یاد کیا جاتا ہے۔

1970 کے بعد بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں اردو افسانہ نویسی کے افق پر چند افسانہ نگار نے نہ صرف ادب کے شائقین کی توجہ مبذول کی بلکہ ادب عالیہ میں اپنی منفرد شناخت بھی بنائی۔ اس سلسلے میں محمود ایوبی صاحب کا نام بڑا معتبر ٹھہرا۔ ان کے فکر و فن کی عظمت کا راز بے ریا و بیباک حقیقت نگاری، فنی نکتوں پر مضبوط گرفت، پلاٹ کی منظّم بنّت اور کردار نگاری بلاشبہ دل آویز ہے۔ ایوبی صاحب کا افسانہ خواہ وہ کسی بھی موضوع اور خیال کا احاطہ کرتا ہو مگر زیریں لہریں سماجی حقیقتوں کو منعکس کرتی ہیں۔ ساتھ ہی افسانے کا مزاج اور خاصہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے جسے آنکھوں دیکھا حال یا جھیلا ہوا سچ کہتے ہیں۔ خود گرداب میں پھنسے تو قاری کو بھی بھنور کا مزہ چکھا دیتے۔ بہرحال یہ سب زندگی کے مشاہدے اور تجربات کا حصہ رہے، جو زندگی سے بھرپور اور عصری حسیت سے لبریز ہے۔

محمود ایوبی کے افسانوں کا خاص وصف ان کی زبان اور برجستہ مکالمے ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں سماجی و عصری مسائل پر بھرپور توجہ دی جس میں احتجاج کی ایک زیریں لہر ابھرتی ہے اور افسانہ حقیقت سے ہم کنار ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں 'چیخ'، بن باس، سیوک، آتنک' فرسودہ روایات اور سیاسی جبر کے خلاف سینہ سپر ہونے والے افسانے ہیں تو وہیں 'ندیا بہے دھیرے دھیرے' تنہائی کے کرب اور بڑھتی عمر میں رفیقِ حیات کی ضرورت اور اہمیت پر کسک بھرا کامیاب افسانہ ہے۔ افسانے میں پُراثر مکالمے اور مزاح کی چاشنی نے موصوف کے فن کو بلندی عطا کی ہے۔

ایسا لگتا کہ کہانیاں لکھتے وقت ان کے اندر کا صحافی بیدار ہو جاتا تو افسانوی متن میں اخبار نویسی کی لفظیات اور طرزِ تحریر میں صحافتی زبان کی جھلک در آتی جسے بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ افسانہ 'سیوک' کا مطالعہ افسانہ نگار کی صحافتی طرزِ تحریر کی بہترین مثال ہے۔

"......گاؤں اب وہ گاؤں نہیں رہا تھا۔ وہاں کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ پچھڑی ذات کے لوگ جواب دلت کہلانے لگے تھے، کاشتکاروں کے بندۂ بے دام ہوا کرتے تھے۔ اب مقابلے پر اتر آئے تھے اور سرکار کے مقرر کردہ نرخ پر اجرت کا مطالبہ کرنے لگے تھے۔ انھیں اگر وہ مزدوری ملتی تو کام کرتے ورنہ کام کی تلاش میں یہ لوگ شہر بھاگنے لگے تھے۔ جو بھاگتے نہیں وہ اپنے حق اور عزت کی لڑائی لڑنے لگے تھے، ہتھیار بند لڑائی۔ سخت سے سخت سزا جھیل لینے والے اب خون خرابے پر اتر آئے تھے..."

افسانے کی ہیروئن سوننداا پنے شوہر کو بتاتی ہے کہ اس کے گاؤں سے آنے والا ولاس کس سماجی طبقے سے تعلق رکھتا ہے...... جو راست صحافتی اطلاع کی طرح شروع ہوتا ہے۔

"......مظلوم اور دلت عوام کے حقوق کی بات آئین میں بھی کہی گئی ہے بلکہ انھیں انصاف دلانے کے لیے آئین میں ترمیم بھی کی گئی ہے۔ تحریکیں بھی چلائی جا رہی تھیں اور کمیشن بھی بٹھائے گئے تھے۔ جن کا الیکشن کے زمانے میں زیادہ زور و شور سے ذکر ہوتا تھا اور وقت گزر جانے پر پھر سناٹا چھا جاتا تھا......"

محمود ایوبی نے شہری انتظامیہ، میونسپل آفیسرز اور کرمچاریوں پر بھی اپنی کہانیوں میں طنز برائے اصلاح کیا ہے، وہ بھی بالکل صحافتی انداز میں۔

"......ان کی اچھائیوں کے بارے میں، اگر کوئی اچھائی تھی تو، کچھ بتانے میں اخبار والوں کو بخار چڑھتا تھا......"

بنیادی طور پر وہ ایسے کہانی کار جو شکست اقدار، کرپشن اور انتظامیہ کی سرد مہری سے بے نیاز نہیں رہے۔ زندگی اور فن دونوں میں خلوص و سادگی کے قائل رہے۔ حقیقت نگاری پر مشتمل کہانی کے خالق فن کو تاثیر کی شدت سے محروم نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے فرقہ وارانہ فسادات، میڈیا کا رول، نئے شہر کے لیے مسائل اور اقتصادی بدحالی سے نبرد آزما ایک عام انسان، مزدوروں کے مسائل جسے ایک اصول پسند، حساس اور ایماندار صحافی کی عینک سے دیکھا کیے۔ مشہور افسانہ نگار سلام بن رزاق نے لکھا...

"محمود ایوبی نے پورے کمٹ منٹ کے ساتھ لکھا۔ ان کے افسانے سماجی سروکار کے افسانے ہیں۔ لہٰذا ان کے تقریباً سبھی افسانوں میں احتجاج کا رنگ حاوی نظر آتا ہے۔"

محمود ایوبی صاحب کی کہانیوں کے پس منظر کے تعلق سے قابلِ غور بات یہ بھی ہے کہ بیشتر کردار ہجرت نصیب ہیں۔ وہ جنھوں نے دور دراز علاقوں سے حصولِ روزگار کی خاطر دوسرے شہروں میں سکونت اختیار کی لیکن نئے کلچر، نئے طور طریق کا سامنا، اس پر شہر کے چھوٹے چھوٹے گھٹن بھرے ماحول میں کسک بھری زندگی جن کا مقدر بن جاتی ہے وہ ماضی اور حال سے سمجھوتہ نہیں کر پاتے۔ یہ ایسی ہجرت جو نہ کلی طور پر انھیں گاؤں سے الگ ہونے دیتی، نہ اپنی مٹی کی سوندھی خوشبو وہ بھول پاتے ہیں اور نہ شہر کی آب و ہوا انھیں راس آتی ہے۔ لہٰذا نفسیاتی کشمکش اور تہذیبی تصادم کے درمیان پستے انسان کی یہ ایسی کہانیاں جن میں افسانہ نگار نے اپنی ذات کو ان کے درمیان فرد واحد کی طرح تنہا پایا اور ان کا ذاتی دکھ درد انہی کمزور طبقے کی زبانی چھلک پڑا۔ اپنی ذہانت، بالیدہ گہری فکر، وسیع النظری، انسانیت سے سرفراز زندگی کے وہ قائل رہے۔ دیانتداری، غیر جانبداری کے ساتھ بیانیے کی سادگی اور سلاست نے کہانیوں کو ایک امتیاز بخشا۔ ادب کی دنیا میں خود کو کسی تحریک یا ازم سے وابستہ نہیں کیا۔ سماج کے استحصال زدہ طبقے کے فرد کو نوکِ قلم سے حیات دی تو کردار جاوداں ہوگئے۔ کہانیوں کے ذریعے اپنے عہد اور سماجی رویے پر سوال کھڑے کیے۔ موجودہ دور میں وہ سوال مزید پیچیدہ ہوگئے اور جواب آج بھی ندارد ہیں....؟

مجموعے میں شامل افسانہ جنازہ، اکھوا، آتنک، گھٹن، ڈگر، دوسری مخلوق، سیوک، انجام کار، جوکھم، بن باس ان کے علاوہ مجموعے کا پیش لفظ 'ہم پہ جو گزری' یہ بھی کسی افسانے سے کم نہیں۔ وہ قاری کو اپنا ہمسفر ہی نہیں ہم خیال بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ مشاہدات و تخیلات کی کرشمہ سازیاں ایسی کہ ہر کردار اپنی انفرادی شناخت کے ساتھ قاری کے ذہن و دل کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ نئے نئے کردار خلق کرنا اور انہیں یادگار بنانے میں انھیں یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ 'اکھوا' کا نصرو، 'آتنک' کا سعید بھائی، 'جنازہ' کا فضلو، 'سودا' کی لتا، 'وہ عورت' کی نور جہاں...طلاق شدہ عورت کے مسائل اور حلالے کے موضوع پر بھی انھوں نے کامیاب افسانے لکھے۔ لیکن کہانی 'جنازہ' کا پلاٹ انتہائی جامع اور گٹھا ہوا ہے۔ اس کے زندہ کردار فضلو اور مردہ کردار جملو کو پڑھ کر پریم چند کا افسانہ 'کفن' کی بدھیا یاد آتی ہے۔

■

Shama Akhtar Kazmi
Wing C, Flat No: 904, Archana Hill Town
N.I.B.M Road, Kausar Baugh, Kondhwa
Pune- 411048 (Maharashtra)
Mob.:9284690949

مبین نذیر

ڈاکٹر الیاس صدیقی

ایک ہمہ گیر شخصیت

ڈاکٹر الیاس وسیم صدیقی کا آبائی وطن ٹانڈہ اتر پردیش تھا۔ جہاں سے ان کے آبا و اجداد نے نقل مکانی کر کے مالیگاؤں میں مستقل سکونت اختیار کی۔ شہر مالیگاؤں میں یکم مارچ 1945 کو محمد حنیف اور زہرہ صدیقی کے یہاں ایک بچے کی ولادت ہوئی، جس کا نام محمد الیاس تجویز کیا گیا۔ یہی بچہ ادب کے افق پر نصف صدی سے زائد عرصے تک روشن رہا اور اپنی ضیا پاشیوں اور ضیا باریوں سے ایک جہان کو منور کرتا رہا۔ وہ آفتاب علم و فن جو معلم، محقق، ناقد، مبصر، شاعر اور افسانہ نگار تھا۔ اردو، عربی اور فارسی میں کامل دسترس رکھتا تھا۔ ایک ایسا قانون داں جو ادب کی باریکیوں، نزاکتوں اور لطافتوں سے نہ صرف واقف تھا بلکہ ان کا مبلغ اور مدرس بھی تھا۔ عروض کا ماہر اور شاستریہ سنگیت کا مزاج داں، جس کا اظہار کتاب 'قندیل حرف' سے ہوتا ہے۔ جس میں انھوں نے نہ صرف اردو اور ہندی زبان کا استعمال کیا ہے بلکہ میوزیکل نوٹیشن کو بھی درج کیا ہے، جو ماہر موسیقی رمضان فینس کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ نوٹیشن پنڈت بھات کھنڈے کے طریقے پر لکھے گئے ہیں۔

(قندیل حرف: ڈاکٹر الیاس صدیقی، 2013، ص 71)

ڈاکٹر موصوف نے بچوں کے لیے لوریاں بھی قلم بند کی ہیں اور ان کی دھنیں بنوا کر 'آجارے نندیا' کے نام سے ایک البم بھی ریلیز کیا تھا۔ لوریاں بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔ 'آجارے نندیا' کو مغنیہ 'جیوتسا راجوریہ' نے آواز اور 'شیو راجوریہ' نے میوزک سے آراستہ کیا ہے۔ ان کا نوٹیشن بھی کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ لوریاں ادب اطفال میں ان کا گراں قدر تعاون ہیں۔

بحیثیت شاعر انھوں نے حمد، نعت پاک، نظمیں، غزلیں، منقبت، سہرے، رخصتی، تہنیت نامے، اسکولی ترانے، استقبالیہ گیت والوداعی گیت وغیرہ سپرد قلم کیے تو افسانے اور کتابوں پر تبصرے بھی لکھے۔ جہاں انھوں نے اپنے ساتھی اساتذہ کی سبکدوشی پر الوداعی گیت لکھے ہیں تو وہیں اپنی ملازمت کی تکمیل پر بھی 'ہم تو چلے یاران محفل' کے ایک عنوان سے ایک نظم سپرد خامہ کی ہے۔ کہتے ہیں۔

ہم تو چلے یاران محفل ! سارے کام تمام ہوئے
جیسے کوئی پرندہ اپنے گھر لوٹے شام ہوئے

ہم ایک تھے، ہم ایک ہیں، ترانے کا اولین بند ملاحظہ فرمائیں۔

پھر حق و صداقت کا علم لے کے اٹھیں گے
بے خواب سی آنکھوں میں نئے خواب بنیں گے
مٹی کی محبت میں ہر الزام سہیں گے
دھرتی پہ لہو سے نئی تحریر لکھیں گے
ہر وادی پرخار کو گلزار کریں گے
ہم ایک تھے، ہم ایک ہیں، ہم ایک رہیں گے

غزلوں میں بھی حضرت وسیم کا رنگ انفرادیت کا حامل ہے۔ عصری حسیت، روایتی موضوعات، حسن و عشق کے قصے؛ لیکن جب یہی صدیقی صاحب کے جادوئی قلم سے نکلتے ہیں تو ان میں ایسا نور جلوہ فگن ہوتا ہے جو ہر ایک کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لیتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

خون بہاتا نہیں ہم جنوں کا کوئی حیواں
کام یہ وہ ہے جسے صرف بشر کرتے ہیں

مضمون پرانا ہے لیکن برتنے کے انداز نے اسے منفرد بنا دیا ہے۔ ایک اور شعر دیکھیے۔

یہ فیصلہ بھی نہ کر سکی تاریخ ہنوز
کتنا ذلیل کرتی ہیں انساں کو کرسیاں

اردو زبان کی زبوں حالی، اپنوں کی بے اعتنائی، غیروں کی بے وفائی پر بے شمار اشعار کہے گئے ہیں لیکن اس شعر میں یقیناً کچھ خاص ہے۔

کون سو سو بار ہو کر قتل بھی زندہ ہے آج
بار خاطر گر نہ ہو اردو زباں کہہ لیجیے

'قندیل حرف' کا ہر صفحہ ایسے ہی بامعنی اشعار سے روشن ہے۔ 'شعر فہمی اور فن شاعری' اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ 2007 میں انھوں نے شہر کے اہل علم کی فرمائش پر شعر فہمی کی کلاس شروع کی تھی، جس میں طلبہ، اساتذہ، ادبا و شعرا شریک ہوتے تھے۔ شعر کی خواندگی سے لے کر اس کی تفہیم و تشریح اور محاسن و معائب پر رہنمائی کیا کرتے تھے۔ اسی کلاس کے نوٹس کو مزید بہتر بنا کر افادہ عام کے لیے 'شعر فہمی اور فن شاعری' کے عنوان سے شائع کیا۔ جس کے متعدد ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ اسی طرز پر فارسی آموزی کی کلاس بھی جاری کی تھی، جس میں شرکا کو فارسی کی ابتدائی معلومات، اردو میں مستعمل فارسی الفاظ، تراکیب، گرامر اور مصرعوں اور محاوروں پر رہنمائی کیا کرتے تھے۔ مذکورہ دونوں کلاسوں سے ایک بڑی تعداد نے فیض حاصل کیا۔

طنز و ظرافت کے میدان میں صدیقی صاحب کا طوطی کچھ یوں بولتا تھا کہ زندہ دلان حیدرآباد کی طرز پر جب مالیگاؤں میں زندہ دلان مالیگاؤں کا قیام عمل میں آیا تو ذمے داروں نے ان کی غیر موجودگی میں انھیں اپنی انجمن کا صدر منتخب کیا تھا۔ اس بزم نے صدیقی صاحب کی زیر نگرانی ترقی کے مدارج طے کیے۔ سال بھر میں ایک دو عمدہ اور معیاری اور یادگار پروگرام انجمن منعقد کرتی تھی۔ ان پروگراموں کی گونج شہر میں ایک عرصے تک سنائی دیتی تھی۔ ان کے مضامین ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد میں

تواتر سے شائع ہوتے تھے۔شہری مسائل پر طنزیہ ومزاحیہ انداز میں لکھے ہوئے مضامین 'جاگ مرے شہر' کے عنوان سے ایک مقامی اخبار شامنامہ میں شائع ہوتے تھے،ان مضامین کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ مضمون کے لیے اخبار کا انتظار کیا کرتے تھے۔ جسے بعد میں اسی نام سے کتابی شکل دی گئی۔ اس کتاب کا اولین ایڈیشن اجرا کے موقع پر ہی ختم ہوگیا تھا۔ جاگ مرے شہریوں تو مالیگاؤں کے مسلم معاشرے کی سماجی اور معاشرتی برائیوں کی بیخ کنی کے ارادے سے لکھی گئی لیکن اس میں برصغیر کے مسلم معاشرے کی مکمل جھلک دکھائی دیتی ہے۔جاگ مرے شہر کی قہقہہ بردوش تحریریں زندگی کے بوجھل لمحوں میں تبسم بکھیرتی ہیں۔ 2015 میں 'ظرافت آمیز' کے عنوان سے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ منصۂ شہود پر آیا۔ان مضامین سے ان کی حس مزاح، مزاح نوازی اور مزاح شناسی کا اندازہ ہوتا ہے،ظرافت آمیز کا ہر مضمون اپنی مثال آپ ہے۔ صدیقی صاحب کی طنز وظرافت آمیز تحریروں کے تعلق سے مجتبیٰ حسین کی رائے ہے:

''میں بھی آپ کی تحریروں کا بہت عرصے سے مداح ہوں۔آپ کے مضامین شگوفہ میں پڑھتا رہا ہوں۔آپ کی تحریروں میں وہ شگفتگی بدرجہ اتم موجود ہے جو مزاحیہ ادب کی جان ہے۔''

(پس وپیش:مجتبیٰ حسین،مشمولہ ظرافت آمیز،ڈاکٹر الیاس صدیقی،ص10)

'ظرافت آمیز' کا پہلا مضمون 'گالی' ہے۔جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

''گالی ہماری زبان کا ایک خوبصورت لفظ ہے۔ اس کی فصاحت اور سلاست اظہر من الشمس ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ یہ لفظ اپنے معنی کی سیدھی ترسیل کرتا ہے۔اس لیے ترسیل کا کوئی المیہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔''

(ظرافت آمیز:ڈاکٹر الیاس صدیقی،ص17)

طنز ومزاح کے بعد جب ہم صدیقی صاحب کی سنجیدہ تحریروں کا رخ کرتے ہیں تو ہماری نگاہ سفر نامہ حج 'رب اغفر وارحم' پر ٹھہر جاتی ہے،جس میں انھوں نے سفر حج کی تیاریوں، اثرات، محرکات اور پیغامات کا ذکر اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔احرام سفر حج کا ایک لازمی جز ہے۔اس کو ایسے دیکھتے ہیں:

''سفید رنگ کے دو بظاہر معمولی کپڑوں کے ٹکڑوں نے احساس عمل میں کیسا انقلاب برپا کردیا ہے۔بالکل یوں معلوم ہوتا ہے کہ جہان رنگ و بو اور بیت اللہ کے درمیان احرام کا کپڑا (یا احرام یا جذبہ) دیوار بن کر حائل ہوچکا ہے۔ (رب اغفر وارحم:ڈاکٹر الیاس صدیقی، 2001 ص19)

اس مقدس سفر کے دوران انھوں نے اجتماعیت، اتحاد و یک جہتی کا مظاہرہ مسلمانوں کے اندر دیکھا کہ لسانی، علاقائی،تہذیبی، ثقافتی اور فقہی اختلافات کے باوجود سب ایک ساتھ 'ایک' کی عبادت میں مستغرق ہیں۔اسی 'ایک' سے لو لگائے ہوئے ہیں تو بے ساختہ ان کے دل نے اسی 'ایک' سے دعا کی کہ اپنے محبوب کی امت کو ان کے اپنے وطنوں میں بھی اسی طرح 'ایک' کردے۔

تخلیق کے ساتھ تنقید و تحقیق کے میدان میں بھی ان کی خدمات قابل رشک ہیں۔'مالیگاؤں میں اردو نثر نگاری' ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔جس پر ساوتری بائی پھلے پونے یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ سے نوازا۔عمر کے آخری پڑاؤ پر بغیر کسی مالی منفعت کے صرف اردو زبان و ادب سے لگاؤ،تنقید و تحقیق سے الفت اور اپنے شہر کی محبت نے انھیں اس موضوع پر تحقیق کے لیے اکسایا۔انھوں نے روایتی طور پر کام کر کے محض ڈگری نہیں لی بلکہ اس کا حق ادا کرنے کی مکمل سعی کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ اور کیوں نہ ہوتے کہ انھیں ڈاکٹر اشفاق انجم جیسا گائیڈ ملا تھا،جن کا ادبی قد کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ڈاکٹر الیاس صدیقی سے پہلے اور بعد میں بھی انھیں ایسا نکتہ رس،نکتہ سنج بزرگ اسکالر نہیں مل سکا۔اس کتاب میں انھوں نے شہر مالیگاؤں کے تقریبا 166 نثر نگاروں اور ان کی تخلیقات کا تجزیہ پیش کیا ہے۔یہ کتاب تقریبا ایک صدی کی ادبی تاریخ کی مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔معروف افسانہ نگار سلطان سبحانی ایک ایسا کارنامہ قرار دیتے ہیں جو ایک تاریخ کی شکل میں ہمیشہ روشن رہے گا۔رسائل اور ادبی انجمنوں کا جائزہ بھی اس کتاب کا حصہ ہے۔کسی علاقے کا ادبی جائزہ لینے کے خواہاں ریسرچ اسکالرس کے لیے یہ کتاب بے حد سودمند ہے۔مالیگاؤں کی سیاسی اور سماجی تاریخ 2005 میں منظر عام پر آئی۔جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے،اس میں شہر عزیز کی سیاسی اور سماجی تاریخ پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کتاب کا مراٹھی میں ترجمہ بھی بہت مقبول ہوا اور 2018 میں حکومت مہاراشٹر نے اس کے مراٹھی ترجمے کو ایوارڈ کے لیے منتخب کیا۔جس کے مترجم محمود شیخ ہیں۔

تنقید وتبصرہ کے میدان میں بھی آپ سالار کارواں تھے۔افسانوی ادب ہو یا غیر افسانوی ادب، دونوں پر آپ کو دسترس حاصل تھی۔آپ کے ہم عصر بلکہ سینئر، جونیئر اور نوآموز ادبا و شعرا آپ سے اپنی کتابوں پر پیش لفظ، مقدمہ اور تقریظ وغیرہ لکھوایا کرتے تھے۔اس نوع کے مضامین کو ترتیب دے کر اسے کتابی شکل میں شائع کیا ہے جس کا نام ہے،'ادبی تبصرات وتعارف'۔ یہ کتاب آپ کی تنقیدی بصیرت اور تبصراتی وتجزیاتی صلاحیتوں کی شاہد ہے۔ یہ تقریبا48 قلم کاروں اور ان کی تخلیقات کے جائزے پر محیط ہے،جس میں ان کے پی ایچ ڈی کے گائیڈ ڈاکٹر اشفاق انجم کی کتاب 'پس نوشت' کا تنقیدی جائزہ بھی ہے، جو ڈاکٹر الیاس صدیقی کی ادبی حیثیت کو مزید افتخار عطا کرتا ہے۔معروف ناظم مشاعرہ غلام مصطفیٰ اثر صدیقی،جمیل احمد جمیل،رمضان فیمس اور ہارون اختر وغیرہ کی کتابوں میں آپ کے تبصرے اور مضامین شامل ہیں۔ کتاب کے آخر میں تین مضامین رونق افروز، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور مقیم اثر بیاولی سے ہونے والی ادبی بحث پر مبنی ہیں۔یہ کتاب بھی طلبہ واساتذہ کے لیے رہنما ہے۔

ماہنامہ اخبار 'گلشن روزگار' ان کے فرزند اعجاز صدیقی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔یہ اخبار بھی ڈاکٹر الیاس صدیقی کی تخلیقی سوچ اور اپنوں کے تئیں دردمندی اور کچھ کرگزرنے کے جذبے کی دین ہے۔اس میں اداریہ نویسی کا فریضہ بھی آپ بحسن خوبی انجام دیا کرتے تھے۔یکم نومبر 2021 کے اداریے کا عنوان تھا 'زبان سنبھال کے صاحب'۔ آپ کے لکھے ہوئے اداریے بھی غور وفکر اور جدو جہد اور حرکت و عمل کی دعوت پر مبنی ہوا کرتے تھے۔

شہر میں ہونے والی ادبی تقاریب میں پابندی سے شریک ہونا، برمحل اور بے لاگ تبصرے کرنا آپ کا خاصہ تھا۔ تحریر کے ساتھ تقریر کے فن میں بھی طاق تھے۔محفل اور مجمعے کی نفسیات کو فورا جان لیتے تھے۔کسی محفل میں آپ کی شرکت کامیابی کی ضمانت ہوا کرتی تھی۔سیاسی جلسوں میں بھی خطابت کا جادو جگاتے تھے۔وہ شہر کے ایک ایسے فن کار تھے جن کو اہل اردو کی طرح اہل مراٹھی بھی اپنا سرپرست تسلیم کرتے تھے۔شہر مالیگاؤں میں 2021 میں ہونے والے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے کتاب میلے کی اولین میٹنگ کی صدارت آپ نے ہی کی تھی مگر افسوس کہ میلے کے انعقاد سے قبل ہی مورخہ 2 نومبر 2021 کو آپ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ڈاکٹر صاحب کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے شہر کا ادبی کنبہ اب تک محسوس کرتا ہے۔

آپ کی مطبوعہ کتب کے علاوہ غیر مطبوعہ کلام اور مضامین بھی کافی تعداد میں ہیں،جو اشاعت کے منتظر ہیں۔اہالیان مالیگاؤں اور ان کے اہل خانہ کی ذمے داری ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی غیر مطبوعہ تخلیقات کو ادبی دنیا کے سامنے پیش کریں کہ یہی ان کو سچا خراج عقیدت ہوگا۔

■

Dr. Mubeen Nazeer
Gulshan A Aaiesha, Momin Pura
Malegaon Dist. Nashik (M.S)
Mobile:8983152574

زبیر احمد بھاگلپوری

امیر خسرو
ہندوستانی ثقافت کا امین

ہندوستانی تاریخ میں چند ہی ایسی نابغہ روزگار شخصیتیں ہوئی ہیں، جنھوں نے اپنی بے پناہ خداداد صلاحیتوں کے سبب نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر اپنی امتیازی شناخت قائم کر کے ملک و قوم کا نام روشن کیا۔ ان میں ایک نمایاں نام ابوالحسن یمین الدین خسرو عرف امیر خسرو کا بھی شامل ہے جن کی پیدائش 1253 میں ایٹا ضلعے کے پٹیالی گاؤں میں ہوئی۔ ان کے والد امیر سیف الدین محمد تیرہویں صدی کی شروعات میں منگولوں کے ظلم سے تنگ آ کر ترکی سے ہندوستان آئے اور جلد ہی التمش کے دربار شاہی کے مقرب ہو گئے۔

اسلامی تصوف کے تناظر میں امیر خسرو کا نام بے انتہا محترم اور معتبر تصور کیا جاتا ہے لیکن یہ دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے کہ میدان تصوف سے، جس کے ابعاد (Dimentions) بذات خود طوالت زمانی کے متقاضی ہیں، کیسے ایک ایسا شخص ابھرتا ہے جو بیک وقت ایک کامیاب شاعر، موسیقار، ماہر لسانیات اور مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ دنیائے تصوف کا رمز شناس بھی ہے اور اتنا کچھ انھوں نے اس حال میں کیا جب قلم کاغذ اور پرنٹنگ پریس وغیرہ کا نام ونشان نہیں تھا۔ اپنی زندگی کے ان تمام پہلوؤں میں برتاؤ اور رچاؤ کے حوالے سے وہ پایۂ کمال کو پہنچے۔ بہ الفاظ دیگر ان کی تہہ دار زندگی کا کوئی گوشہ تشنہ نظر نہیں آتا۔ شاعری کی دلفریب دنیا میں قدم رکھا تو نہ صرف ہندوستان کی 'ہندوی' اور 'فارسی' کے عظیم ترین شاعر قرار پائے بلکہ اہل فارس کے ذریعے ہندوستان کے واحد مستند فارسی شاعر کا تمغۂ امتیاز بھی حاصل کیا۔ منطقۂ موسیقی میں داخل ہوئے تو جودت طبع اور بے پناہ خلاقی ذہانت کے سبب کئی آلات موسیقی کے موجد بن گئے اور بالواسطہ سہی، اپنی نگارشات میں جن تواریخی حقائق کا اندراج کیا۔ ان کے ذکر کے بغیر نہ صرف عہد وسطیٰ کی تاریخ نامکمل ہے بلکہ چند حوالوں کے تناظر میں صرف آپ کی تحریر ہی Source of information ہے۔ ان کی اسی فطری صلاحیت سے متاثر ہو کر مولانا ابوالکلام آزاد کو کہنا پڑا کہ ہندوستان نے سات سو برسوں کی طویل مدت میں امیر خسرو جیسا باصلاحیت اور بے مثال دانشور پیدا نہیں کیا۔ امیر خسرو کی عظمت کا اعتراف شبلی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

'' بلاشبہ فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی منظومات کے شہنشاہ تھے لیکن وہ اپنی متعینہ حد سے باہر نہیں گئے۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھے، سعدی قصیدے کے شعبے میں اختیار کلی حاصل نہیں کر سکے، انوری مثنوی اور غزل کو اپنے ماتحت نہیں کر سکے اور حافظ، عرفی و نظیری غزل کے حصار سے باہر نہیں نکل سکے لیکن خسرو کے دائرۂ اختیار میں سبھی سمٹ آئے ہیں۔''

ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے فروغ کے تناظر میں امیر خسرو کا مطالعہ ایک خوشگوار احساس کا سامان بایں سبب فراہم کرتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف سرزمین ہند کی ثقافت کو بام عروج تک پہنچانے میں بیش قیمتی خدمات پیش کیں بلکہ یہاں کی تہذیبی و ثقافتی بوقلمونی کے درمیان ایک توانا ہم آہنگی قائم کرنے کی مخلصانہ سعی بھی کی۔ معاشرتی خیرسگالی اور سماجی سمرستا کا جو قابل قدر سلسلہ 'صوفی تحریک' کی صورت میں عہد وسطیٰ میں برادرانہ تفریق اور مذہبی شدت پسندی کی بنیاد کا قلع قمع کرتے ہوئے ملک بھر میں محبت و اخوت کی ایک خوشگوار فضا قائم کرتا ہے، امیر خسرو اس کی ایک اہم کڑی کے بطور بھائی چارہ اور

مذہبی رواداری کے استحکام کے حوالے سے اپنی بھرپور موجودگی درج کرتے ہیں۔ یہ مذہبی رواداری انھیں اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیا سے وراثت میں ملی تھی، جس کی ایک مثال اس واقعے کے ذیل میں ملتی ہے جس میں ایک دفعہ اپنی خانقاہ کی چھت پر کھڑے حضرت نظام الدینؒ نے کچھ فاصلے پر غسل اور پوجا پاٹھ کرتے چند ہندو کے بارے میں خسرو کے استفسار پر برجستہ ایک مصرع ''ہر قوم راست دینے، راہے وقبلہ گاہے'' (ہر قوم کا اپنا دین، اپنی راہ اور اپنی قبلہ گاہ ہے) پڑھا۔ اس کے جواب میں خسرو نے فوراً مصرع ثانی 'من قبلہ راست کردم برطرف کج کلاہے' پڑھا۔

ترکی النسل خسرو کی زبان کے حوالے سے اردو محققین کا خیال یہ ہے کہ خسرو کی زبان اردو کی ابتدائی صورت کی مثال ہے جب کہ اہل ہندی کا گمان یہ ہے کہ خسرو نے ابتدائی ہندی زبان میں شاعری کی۔ بہت حد تک یہ درست بھی ہے کہ خسرو کی شعری زبان ابتدائی اردو اور شروعاتی ہندی کی مثال ہے۔

خسرو نے ترکی، فارسی، عربی اور سنسکرت کا علم رکھنے کے باوجود اپنے دور کی عام بول چال کی زبان 'ہندوی' میں شاعری کی جس کا بین ثبوت خسرو کے ان دو اشعار سے مل جاتا ہے۔

1 ترک ہندوستانیم من، ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

(میں ایک ہندوستانی ترک ہوں، میں ہندوی میں جواب دیتا ہوں۔ میرے پاس مصری شکر نہیں جو میں عربوں کی گفتگو کروں)

2 چوں من طوطیِ ہندم او راست پرسی
زمن ہندوی پرس تا نغز گویم

(اگر صحیح پوچھو تو میں طوطیِ ہند ہوں۔ اگر تم مجھ سے شرینی گفتار چاہتے ہو تو ہندوی میں بات کرو)

اس ضمن میں 'سنسکریتی کے چار ادھیائے' میں رام دھاری سنگھ دنکر، آچاریہ شیام سندر داس اور ڈاکٹر رام کمار ورما جیسے ہندی کے عظیم دانشور خسرو کی شعری زبان کو 'کھڑی بولی' قرار دیتے ہیں۔ بقول رام دھاری سنگھ دنکر— ''جب ہم کھڑی بولی کی تاریخ کو اٹھاتے ہیں تب یقینی طور سے ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ اس زبان کا قدیم ترین تحریری ادب خسرو کا ہی ہے۔'' اتنا ہی نہیں، دنکر مزید کہتے ہیں کہ ''کھڑی بولی' کو ادبی زبان کا درجہ دینے کا شرف مسلمانوں خصوصاً امیر خسرو کو ہی حاصل ہے۔ اسی طرح اردو کے معروف ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خان اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کا نظریہ اس ضمن میں یہ ہے کہ جدید اردو کی نشوونما کھڑی بولی، ہریانی اور برج بھاشا کے بطن سے ہوئی۔ یہاں ایک قابل غور نکتہ یہ ہے کہ خسرو کی شعری زبان 'کھڑی بولی' ہونے کے حوالے سے ہندی زبان کے ماہرین کی ادعائیت تسلیم کر لینے کی صورت میں خسرو کے ذریعے مستعمل زبان کو ہندی اور اردو دونوں کی مادر لسانی کے بطور قبول کر لینے کا مسئلہ از خود حل ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک بات ذہن نشیں کرنے کی یہ ہے کہ خسرو ''ہندوی'' کی بات کرتے ہیں تو اس سے کوئی ایک زبان نہیں، بلکہ ہندوستان کی اس وقت کی ساری علاقائی بولیاں مراد ہیں جیسا کہ خود ''نہہ سپہر'' میں خسرو خود لکھتے ہیں— ''ہندستان کے ہر ایک علاقے میں وہاں کی اپنی بولیاں ہیں، جن میں سندی (سندھی)، تیلنگی (تلگو)، گجر (گجراتی)، ماوری (مالاباری) اور گوڑی (گوڑوانے کی زبان) خاص ہیں بنگال اور اودھ میں وہاں کی اپنی بولیاں ہیں اور دلی کے آس پاس کے لوگوں کی بھی اپنی بولی ہے۔ یہ سبھی 'ہندوی' زبانیں ہیں۔''

خسرو کی زندگی کے متنوع تہذیبی وثقافتی پہلو پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے ہندوستان کی مروج علاقائی زبان میں اپنی شاعری کے ذریعے یہاں کی تہذیب وثقافت کے ارتقا کے ساتھ ساتھ سماجی ہم آہنگی اور قومی ایکتا کے قیام میں بھی اہم رول ادا کیا۔ ان کی ثقافتی کارپردازی کے چند نمونے:

1 **بحیثیت شاعر**— امیر خسرو کی فارسی شاعری باعتبار معیار انتہائی اعلیٰ اور معتبر تصور کی جاتی ہے۔ خسرو ہندوستان کے واحد فارسی شاعر ہیں جنھیں اہل ایران کے ذریعے محترم اور مستند قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی خالص فارسی شاعری کا معتد بہ حصہ تو موجود ہے ہی، فارسی شاعری میں ہندوستانی زبان کے امتزاج کے ذریعے جو انھوں نے ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ وہ صرف خسرو کا خاصہ ہے اور ان سے قبل اس نوع کی کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ مثلاً

زحال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں، نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چوں عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل و چشم جادو بصد فریبم بہ برد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چوں شمع سوزاں چوں ذرہ حیراں زمہر آں مہہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ رنگ چیناں، نہ آپ آوے نہ بھیجے پتیاں

'خسرو نے ہندوی' یا کھڑی بولی میں جو شعری نمونے چھوڑے ہیں، وہ ہندوستانی تہذیب کا بیش بہا اثاثہ ہیں۔ انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی جن میں دوہے، پہیلیاں، قوالی، کہہ مکرانیاں اور دوسخنے اور گیت وغیرہ شامل ہیں۔ مشتے نمونہ:

(الف) دوہے

1 خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرو من پیو کو دؤو بھئے اک رنگ

2 گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چھوں دیس

3 بھائی رے ملاح ہم کو پار اتار
ہاتھ کو دیونگی منورا گلے کو دیونگی ہار

4 وہ گئے بالم وہ گئے ندیا کنار
آپے پار اتر گئے ہم تو رہے ایہی پار

(ب) پہیلیاں

1 ایک گنی نے یہ گن کینی
پر تل پنجرے میں دے دینی
دیکھا جادو گر کا حال
ڈالے ہرا نکالے لال
(پان)

2 اک ناری کے سر پر نار
پی کی لگن میں کھڑی ناچار
سیسی چنے اور چلے نہ چور
رو رو کر وہ کرے ہے بھور
(شمع)

(ج) گیت

ا چھاپ تلک سب چھینی رے موسے نیناں ملائے کے
بات ادھم کہہ دینی رے موسے نیناں ملائے کے
گوری گوری بتیاں ہری ہری چوڑیاں
بئیاں پکڑ دھرلینی رے موسے نیناں ملائے کے

2 بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی
کیسے میں بھرلاؤں مدھوا سے مٹکی
پنیاں بھرن کو جو میں گئی تھی
دوڑ جھپٹ موری مٹکی پٹکی
بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی

(د) لوک گیت— امیر خسرو ہندوستانی میں روح کی گہرائی سے رچے بسے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے 1 کلاسیکی غزل اور دیگر اصناف سخن کے ساتھ ساتھ مقامی لوک گیت میں بھی طبع آزمائی کی۔ مثال

اماں میرے بابا کو بھیجیو ری کی ساون آیا
بیٹی تیرا بابا تو بوڑھاری کی ساون آیا

اماں میرے بھیا کو بھیجیو ری کی ساون آیا
بیٹی تیرا بھیا تو بالا ری کی ساون آیا
اماں میرے ماما کو بھیجیو ری کی ساون آیا
بیٹی تیرا ماما تو بانکاری کی ساون آیا

ان چند مثالوں سے امیر خسرو کے ہندوی کلام کے معیار و وقار کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خسرو ہندوستانی ثقافت کے نہ صرف پروردہ تھے بلکہ وہ عملی طور پر اس کے گرویدہ بھی تھے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس دور کی شاید ہی کوئی صنف سخن ہو جس پر خسرو نے اپنی جولانی طبع کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔

2 **بحیثیت موسیقار:** ہندوستانی فن موسیقی کو بھی بام عروج پر پہنچانے میں امیر خسرو کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ چونکہ خسرو کی پیدائش ہندوستانی ماں کے شکم سے ہوئی، مزامیر کے اسلام میں ناجائز ہونے کے باوجود وہ یہاں کی موسیقی سے نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ اسے عروج وکمال عطا کرنے میں انتہائی اہم رول ادا کیا۔ ہندوستانی موسیقی کے عنوان پر شائع مستند کتاب ''معارف النغمات'' میں محمد علی خاں امیر خسرو کی موسیقی کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

''سلاطین تغلق کے عہد میں امیر خسرو مشہور باکمال شاعر کی توجہ موسیقی ہند کی جانب مائل ہوئی۔ طبعی مناسبت اور خداداد ذہانت کے باعث اس فن میں انھوں نے ایسی مہارت حاصل کی کہ نائک گوپال، جو سرآمد روزگار تھا، ان کے کمال کا ثناخواں ہوا۔ اس نائک نے تغلق کے دربار کے تمام گویوں کو عاجز کردیا تھا۔ خسرو نے بادشاہ کے اصرار سے اس کے گانے کا طرز فارسی ترانے میں اسی کے سامنے ادا کرکے دکھایا۔ امیر خسرو نے عجمی و ہندوستانی موسیقی کے ملادینے کی کوشش کی اور بہت سے راگ ایجاد کیے جو آج تک مروج ہیں۔ غارا، سرپردہ اور زیلف وغیرہ ان کی طباعی کا نتیجہ ہیں۔''

تاہم ڈاکٹر ملک محمد کی کتاب 'امیر خسرو' میں شامل آچاریہ برہسپتی نایک گوپال اور امیر خسرو کے فنی تقابل کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''گوپال نایک سے ملاقات کے قبل خسرو کا نظریہ کچھ بھی رہا ہو لیکن گوپال نایک نے خسرو کو ہندوستانی موسیقی کا عظیم عقیدت مند بنادیا۔'' تاہم برہسپتی جی یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں: '' ایرانی بارہ سوروں کی بنیاد پر راگ درجہ بندی کے طریقہ کا آغاز امیر خسرو نے کیا اور اس لیے وہ عہد ساز ہیں''

امیر خسرو نے ایرانی اور ہندوستانی اصول موسیقی کے امتزاج سے نہ صرف کئی نئے راگ کی ایجاد کی بلکہ کئی آلات موسیقی کے موجد بھی ٹھہرے۔ موجودہ طبلہ اور ستار کو بنیادی طور پر ایجاد کرنے کا سہرہ بھی امیر خسرو کو جاتا ہے۔ کچھ ہندوستانی دانشور ستار کی ایجاد کو امیر خسرو کی بجائے مغل عہد کے خسرو خان سے منسوب کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں 18 ویں صدی کے معروف ہندوستانی موسیقار کیلاش چندر دیو عرف 'آچاریہ ورہسپتی' ڈاکٹر ملک محمد کے ذریعے مرتب کتاب 'امیر خسرو' میں شامل اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں: ''موجودہ ہندوستانی ستار کے موجد 'خسرو خان' تھے جو سدارنگ کے انج (چھوٹا بھائی) اور ادارنگ کے والد تھے۔ شاہ عالم کی کتاب 'نادرات شاہی' میں ستار کا ذکر پہلے پہل ملتا ہے۔ یہ کتاب 1798 میں مکمل ہوئی۔'' لیکن آچاریہ ویہسپتی کا یہ دعویٰ اس وقت باطل نظر آتا ہے جب ہم راجستھان کے جودھ راجہ کی 1725 میں شائع مشہور کتاب 'ہمیر راسو' میں ستار کا ذکر پاتے ہیں۔

دانشوروں کا وہ طبقہ جو ستار کو امیر خسرو کی ایجاد تسلیم نہیں کرتا، یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ خسرو نے اپنی تحریروں میں چنگ اور رباب وغیرہ جیسے آلات موسیقی کا تو ذکر کیا ہے لیکن انھوں نے کبھی بھی 'ستار' یا اس کی ایجاد کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ دلیل اس لیے کمزور ہے کہ ممکن ہے کہ جب یہ آلہ خسرو نے ایجاد کیا اس وقت چونکہ اس کی ابتدائی شکل تھی، اس کا کوئی اس وقت نام نہیں دیا گیا ہو۔ اس سلسلے میں عبدالحلیم جعفر خان نے اپنی کتاب Amir Khusru and Hindustani Music میں لکھا ہے کہ ستار، طبلہ اور ڈھولک بھی امیر خسرو کے اختراع کردہ آلات موسیقی ہیں۔ عبدالحلیم صاحب کی بات اس لیے بھی معنویت رکھتی ہے کہ وہ خود ایک کامیاب موسیقار رہے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ عہد وسطی کے عظیم مؤرخ پروفیسر حسن عسکری عظیم آبادی کی تحقیق کے مطابق خسرو کے عہد میں آلہ موسیقی 'ایکتارا' مروج تھا، جس میں ایک تار کا استعمال ہوتا تھا، جو آج بھی برصغیر ہندو پاک کے کئی علاقوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس میں امیر خسرو نے دو مزید تار کا اضافہ کرکے ایک نیا آلہ موسیقی ایجاد کیا جسے بعد میں لوگوں نے ستار کا نام دیا۔ ان کے مطابق ستار دراصل 'سہ تار' کا مخفف ہے۔ اس سلسلے میں وفاقی وزارت تعلیم اسلام آباد سے شائع ایک کتاب 'امیر خسرو اور موسیقی' میں شامل اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر وحید مرزا بھی ستار کے سلسلے میں ایک دلچسپ نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں— ''ترکی اور فارسی شاعری کے بہت دیرینہ ادوار میں یہ نام ہے جس سے ترشح ہوتا ہے کہ ستار اصل میں فارس یا بلکہ کاکیشیا میں مروج تھا اور ہندوستان میں اس کے بعد آیا۔ ستار کاکیشیا اور جارجیا کا آج بھی قومی ساز ہے۔ غالباً انہی خطوں سے یہ ساز مغربی ممالک میں گیا جہاں یہ 'زتھار' یا 'گٹار' کہلایا۔

اسی طرح 'قوالی' اور 'ترانہ' جو امیر خسرو کی ایجادات تصور کیے جاتے ہیں، کے حوالے سے بھی دانشوروں کی آرا مختلف ہیں۔ رشید ملک اپنی کتاب 'موسیقی اور امیر خسرو' میں لکھتے ہیں— '' قوالی اور ترانہ دونوں امیر خسرو سے پہلے کی چیزیں ہیں اور ہندوستان کی تاریخ میں بھی ہمیں ایسے شواہد ملتے ہیں جن کی بنیاد پر ہم قوالی کا موجد امیر خسرو کو نہیں کہہ سکتے۔'' رشید ملک اور ان کے ہم خیال مورخوں کا نظریہ غالباً اس 'سماع' کی بنیاد پر قائم ہے جو واقعی امیر خسرو سے پہلے ہندوستان میں مروج تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خسرو سے پہلے لفظ قوالی پڑھنے کو نہیں ملتا۔ قوالی امیر خسرو کی ایجاد ہے یا نہیں، یہ موضوع بحث ہوسکتا ہے لیکن یہ ایک متفق علیہ حقیقت ہے کہ 'خیال' اور دیگر اصناف گلوکاری کے ساتھ ساتھ امیر خسرو نے ایک صنف 'قول' کی ایجاد کی تھی، جس میں غالباً رسول اکرمؐ کے اقوال پیش کیے جاتے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ اس صنف کے گلوکاروں کو قوال اور ان کی گلوکاری کو بعد میں قوالی کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سماع کے اندر جو سادگی اور عدم انضباط تھا، اسے امیر خسرو نے منظم کرکے قوالی کا نام دیا ہو۔ بہرکیف ہندوستانی

سلاطین تغلق کے عہد میں امیر خسرو مشہور باکمال شاعر کی توجہ موسیقی ہند کی جانب مائل ہوئی۔ طبعی مناسبت اور خداداد ذہانت کے باعث اس فن میں انھوں نے ایسی مہارت حاصل کی کہ نائک گوپال، جو سرآمد روزگار تھا، ان کے کمال کا ثناخواں ہوا۔ اس نائک نے تغلق کے دربار کے تمام گویوں کو عاجز کردیا تھا۔ خسرو نے بادشاہ کے اصرار سے اس کے گانے کا طرز فارسی ترانے میں اسی کے سامنے ادا کرکے دکھایا۔ امیر خسرو نے عجمی و ہندوستانی موسیقی کے ملادینے کی کوشش کی اور بہت سے راگ ایجاد کیے جو آج تک مروج ہیں۔ غارا،سرپردہ اور زیلف وغیرہ ان کی طباعی کا نتیجہ ہیں۔

موسیقی کی ایجادات کے حوالے سے امیر خسرو کی خدمات پر تحقیق اور تفتیش کا سلسلہ ماضی میں جاری تھا اور مستقبل میں بھی جاری رہے گا۔

پنڈت جگدیش نارائن پاٹھک نے 'راگ درپن' میں لکھا ہے کہ ہندوستانی موسیقی کے بارہ راگ کے موجد امیر خسرو ہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ دور کی 'خیال گائکی' بھی امیر خسرو کی پیداوار تسلیم کی جاتی ہے۔ اس طرح شعبہ موسیقی میں امیر خسرو کے قد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بحیثیت مورخ: بطور مورخ امیر خسرو کی حیثیت یہ ہے کہ ان کے حوالے کے بغیر ہندوستان کے عہد وسطیٰ (Medieval period) کی تاریخ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

خواہ منظوماتی تخلیق ہو خواہ منثوراتی۔ دونوں میں تاریخی حوالے کثرت سے موجود ہیں۔ 1291 میں ان کا ایک شعری مجموعہ بعنوان 'غرۃ الکمال' تخلیق پذیر ہوا جس میں شامل مثنوی 'مفتاح الفتوح' میں خسرو نے سلطان علاء الدین خلجی کی فتوحات کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے سلطان قطب الدین مبارک کے حکم پر 718ھ میں مشہور مثنوی 'نہ سپہر' کی تخلیق کی جس کی نہ صرف تاریخی اہمیت ہے بلکہ اس میں اس وقت کی معاصر تہذیب وثقافت کے عناصر بھی ترجیحی بنیاد پر شامل کیے گئے ہیں۔ اس مثنوی میں سلطان قطب کی تخت نشینی سے لے کر شہزادہ محمد کی پیدائش تک کے تاریخی حوالوں کا تذکرہ ہے۔ خاص بات یہ کہ اس کے نو ابواب میں سے ایک میں ہندوستان کی عظمت کا بیان ہے۔ اس میں خسرو نے ہندوستان کو 'دنیا کی جنت' قرار دیا ہے۔ 'تغلق نامہ' کو ان کی آخری تاریخی مثنوی تصور کیا جاتا ہے جس میں انھوں نے سلطان غیاث الدین تغلق کی حیات اور فتوحات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

خسرو کی ایک نثری تحریر کا نمونہ 'خزائن الفتوح' کے نام سے 711ھ میں منصۂ شہود پر آتا ہے جس کا دوسرا نام 'تاریخ علائی' بھی ہے۔ اس میں انھوں نے علاء الدین خلجی کے دور کے کئی تاریخی واقعات قلم بند کیے ہیں۔ علاء الدین خلجی کی تاریخ کے حوالے سے یہ اہم ترین Source مانا جاتا ہے۔ 'خزائن الفتوح' اصلاً ایک اخبار ہے جس کی بنیاد پر خسرو کو اخبار نویس بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت تو ہے ہی، فارسی زبان کے اس اخبار کا اثر ہندوستانی سماج پر یہ پڑا کہ اس سے متاثر ہوکر مہاراشٹر کے حکمراں نے بھی مراٹھی اخبار نویسی کا سلسلہ شروع کیا۔ اس میں خصوصاً علاء الدین کی دیوگیری فتح کے لیے روانگی، اس کا نظام حکومت دہلی قلعے کی تعمیر نو، حوض ملتانی کی تعمیر، منگولوں کے خلاف اسلامی فوج کی جنگ اور فتح اور رنتھم بھور کی فتح وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ تاریخی حوالے سے مثنوی 'قران السعدین' کی بھی خاص اہمیت ہے، جسے خسرو نے تین ماہ کی عرق ریزی کے بعد 688ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اس مثنوی میں انھوں نے کیقباد اور بغرا خاں کے درمیان ہونے والی خط وکتابت کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ 'نہایت الکمال' اور 'وسط الحیات' بھی خسرو کی ان تخلیقات میں شامل ہیں جن کی تاریخی اور ادبی دونوں سطح کی اہمیت تسلیم شدہ ہے۔

4 **بحیثیت محبّ وطن:** امیر خسرو محبّ وطن تو تھے ہی، وہ قومی ایکتا اور فرقہ وارانہ خیر سگالی کی علامت بھی تھے۔ گرچہ وہ فارسی، ترکی، عربی وغیرہ کئی زبانون کے عالم تھے لیکن ہندوستان کی مقامی بولی ہندوی (جو بعد میں ہندی بنی) کے ساتھ جو روحانی اور قلبی برتاؤ ہے، وہ ان کی حب الوطنی کا ہی ثبوت ہے۔ انھوں نے اس وقت مقامی ہندی زبان کو نہ صرف عملی طور پر اپنی منظومات میں وسیع پیمانے پر استعمال کیا بلکہ تحریری طور پر بھی ہندی زبان کی کھلے دل سے تعریف کی۔ اپنی ایک مثنوی 'عشقیہ' میں وہ لکھتے ہیں:

''ہندی فارسی سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ جو لوگ ہندی کی اہمیت کم سمجھتے ہیں، وہ نادان ہیں۔ ہندی عربی کے مساوی ہے کیوں کہ ان دونوں میں کوئی مخلوط نہیں ہے۔ ذخیرۂ الفاظ اور خیالات کے نظریے سے بھی ہندی کم نہیں ہے۔ ہندی میں بہت سے ایسے لفظ ہیں جو چھوٹے ہونے پر بھی معنوی گہرائی رکھتے ہیں۔ وہ ایک قطرے میں سمندر کی طاقت رکھنے والے ہیں۔''

ہندوستان کی عظمت کا اعتراف خسرو نے اپنی مثنوی 'نہ سپہر' میں جس انداز میں کیا ہے۔ اس سے ہندوستان کے تئیں خسرو کے والہانہ جذبات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے یہاں کی آب وہوا، پھل پھول، چرند و پرند، تعلیم، زبان اور یہاں کے برہمنوں کے علمی تبحر وغیرہ کا مخلصانہ اظہار کیا ہے، جس سے ان کی حب الوطنی ٹپکتی ہے۔ خسرو نے اس مثنوی میں لکھا ہے کہ جو لوگ روم، خراساں اور ختن کے سامنے ہندوستان کے تئیں میری تعریف کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، اس کے جواب میں میں کہوں گا کہ میری نظر میں ہندوستان کے علوشان کے دو اسباب ہیں: ''ایک تو یہ ہے کہ ہندوستان میرا مادر وطن ہے اور خود پیغمبر حضرت محمدؐ نے کہا ہے کہ حب الوطنی ایمان کی نشانی ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ اس ملک کا بادشاہ مبارک شاہ ہے جس کے مقابلے میں دنیا میں دوسرا کوئی نہیں ہے۔''

صفدر آہ کے لفظوں میں:

''خسرو سچے وطن پرست اور ہندوستان کے عاشق تھے۔ اپنے اشعار میں جہاں جہاں وہ ہندوستان کی تعریف کرتے ہیں تو جیسے ان کی روح بول اٹھتی ہے۔ ہندوستان کی زمین، ہندوستان کا موسم، ہندوستان کے پرندے، ہندوستان کے پھل، ہندوستان کی ریت رواج، ہندوستان کے دانشور وغیرہ پر جس تاثر سے خسرو شعر کہتے ہیں، اس کی مثال غالباً سنسکرت سے لے کر ہندی اور اردو تک کسی ہندوستانی زبان میں نہیں مل سکے گی۔''

خسرو جب پورے کشور ہندوستان کی تعریف کرتے ہیں تو بول اٹھتے ہیں۔

''کشور ہند است بہشتی بزمیں''

اور جب جنت ارضی کشمیر کو دیکھتے ہیں تو اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

اگر فردوس بروئے زمین است
ہمین است وہمین است وہمین است

خسرو کی کثیر الابعاد زندگی کی یہ چند جہات ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے فروغ میں ان کے اہم کردار کی تفہیم کے لیے کافی ہیں لیکن ان کے مکمل ادبی، علمی اور ثقافتی کردار کے ادراک کے لیے ناکافی ہیں۔ صحیح معنوں میں 'خسرو شناسی' کا مکمل تصور اس لیے بھی ناممکن ہے کہ ان کی تخلیقات کا نصف بھی آج دستیاب نہیں ہے۔ 'تاریخ فرشتہ' کے مطابق خسرو کے ذریعے لکھی کتابوں کی کل تعداد 92 ہے جب کہ جامی (1414-1492) نے اپنی کتاب 'نفحات الانس' میں لکھا ہے کہ ان کی کتابوں کی کل تعداد 99 ہے۔ جب کہ فی الوقت ان کی دستیاب کتابوں کی تعداد محض 22 ہے۔ اس طرح واضح ہے کہ امیر خسرو کی ادبی اور علمی وقعت کا صحیح اندازہ لگانا ممکن نہیں۔

ماخذات

1 امیر خسرو: مؤلف ڈاکٹر ملک محمد
2 سنسکرتی کے چار ادھیائے۔ رام دھاری سنگھ دنکر
3 مقدمۂ تاریخ زبان اردو۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں
4 معارف النغمات۔ محمد علی خاں
5 امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری۔ ڈاکٹر شجاعت علی
6 امیر خسرو۔ سید غلام سمنانی
7 امیر خسرو۔ ڈاکٹر محمد وحید مرزا
8 حیات خسرو۔ مولانا شبلی
9 خسرو بحیثیت ہندی شاعر۔ صفدر آہ
10 امیر خسرو اور موسیقی — وفاقی وزارت تعلیم، اسلام آباد۔

■

Zubair Ahmad Bhagalpuri
Bihar Legislative Council
Patna- 800001 (Bihar)

میر کا طرزِ شاعری

احسان حسن

میرتقی میرنے اپنی زندگی میں حالات کی تنگی کے باوجود کبھی تنگ نظری اختیار نہیں کی۔ان کے فکروفن میں بلا کی وسعت موجود ہے۔ میر نے منجمد طریقۂ کار کے خلاف اپنی جنگ ہمیشہ جاری رکھی ورنہ دھلی سے لکھنؤ کا سفرکیوں کرتے۔اگر میر کے اندر قنوطیت غالب ہوتی تو دھلی سے کوچ کرنا کبھی گوارا نہ کرتے اور دھلی میں ہی مرکھپ گئے ہوتے۔میر کے یہاں تنوع ہے، زندگی میں بھی اور فن میں بھی۔

انسانی زندگی میں دو قسم کے طریقۂ کار موجود ہوتے ہیں، مثبت اور منفی یعنی قنوطی اور رجائی۔ شاعری اور دیگر فنونِ لطیفہ کا اظہار بھی انھیں دو پہلوؤں میں ہوتا ہے۔ میر کی شاعری کا بنیادی موضوع عشق میں ناکامی و نامرادی ہے۔ میر کو یاسیت اور حرماں نصیبی کا 'شاعر' تسلیم کیا جاتا ہے۔ میر نے یوں تو اس میدان میں بے مثل بلندی حاصل کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کا تھوڑا بہت حصہ رجائی تاثیر اور مثبت طریقۂ کار بھی لیے ہوئے ہے۔ یعنی میر کی شاعری میں درد وغم سے الگ ظریفانہ اور خوشگوار انداز بھی موجود ہے۔ ان کے یہاں ہجر تو اپنے عروج پر ہے ہی لیکن کبھی کبھی وہ وصال سے بھی ہم آہنگی اختیار کر لیتے ہیں۔

میر تقی میر کی شاعری اپنے مجموعی تاثر میں 'آہ!' کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ میر کے شعری آہنگ میں درد وغم، رنج والم کی ایسی فطری اور شعری اصطلاح میں کہیں تو 'آمدی' موجودگی ہوتی ہے کہ میر کا کلام ہمیں ایک افسوس ناک فضا میں لے کر چلا جاتا ہے۔ ہم پر یاسیت وحرماں نصیبی کا احساس غالب ہونے لگتا ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے اور میر کی شاعری کا بنیادی وصف بھی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''میر صاحب کا کلام عاشقانہ ہے لیکن ان میں اکثر اشعار ایسے ملیں گے جن میں کوئی اخلاقی یا حکیمانہ نکتہ خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ انسان کی طبیعت کے دو رنگ ہیں، لطف و مسرت یا اندوہ والم۔ میر صاحب کے اشعار عاشقانہ ہوں یا حکیمانہ ان میں مایوسی کی جھلک پائی جاتی ہے، یہ ان کی طبیعت کی افتاد ہے۔ وہ کسی حال میں ہوں، کوئی کیفیت ان پر طاری ہو، ان کے دل سے جب کوئی بات نکلی وہ یاس و ناکامی میں ڈوبی ہوئی تھی۔'' (انتخابِ کلام میر، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلی، ص 27-26)

اسی کے ساتھ ساتھ اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو میر کے کلام میں ہمیں ایسے بے شمار اشعار بھی ملتے ہیں جو حوصلہ و امید پیدا کرتے ہیں اور آرزومندی کی فضا تعمیر کرتے ہیں۔ عشق کا موضوع شاعری میں 'بسم اللہ' کی حیثیت رکھتا ہے خواہ دنیا کی کسی بھی زبان کی شاعری ہو۔ اس ضمن میں ہم دیکھتے ہیں کہ میر نے عشقیہ موضوعات پر بہت سے ایسے اشعار کہے ہیں جو ہمارے دلوں میں منفی نہیں بلکہ ایک مثبت احساس پیدا کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مِرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

لذّت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خِضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

کچھ عشق و ہوس میں فرق بھی کر
کیدھر ہے وہ اِمتیاز تیرا

کہتے تھے میر مت کُڑھا کر
دِل ہو گیا گداز تیرا

مرنے پہ جان دیتے ہیں وارفتگانِ عشق
ہے میر راہ و رسم دیارِ وفا کچھ اور

شمع ساں جلتے رہے لیکن نہ توڑا یار سے
رشتۂ الفت تمامی عمر گردن میں رہا

صحرائے محبت ہے قدم دیکھ کے رکھ میر
یہ سَیرِ سَرِ کوچہ و بازار نہ ہووے

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بِن یہ ادب نہیں آتا

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

عشق کے اپنے مخصوص ادب وآداب ہوتے ہیں۔ جہاں یہ ادب وآداب اور عشق کا لحاظ نہیں ہوتا وہاں گو کچھ بھی ہو کم از کم عشق تو نہیں ہوتا ہے۔ احترامِ آدمیت، احترامِ بشریت عشق ومحبت میں اوّل شرط ہیں۔ میر کے یہاں ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں جو گلے شکوے اور درد و رنج سے بالاتر محبت کی قدردانی کرتے نظر آتے ہیں۔ اِن اشعار میں رجائیت ہوتی ہے اور یہ اشعار اپنے قاری کو احساسِ محرومی و ناکامی سے بچالے جاتے ہیں۔

عشقیہ موضوعات سے الگ میر کی شاعری میں مختلف موضوعات کے دیگر اشعار بھی ملتے ہیں جو ہمارے سامنے ایک مثبت طریقۂ کار پیش کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

میر بندوں سے کام کب نکلا
مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

غیرتِ یوسف ہے یہ وقت عزیز
میر اس کو رایگاں کھوتا ہے کیا

سرسری تم جہاں سے گذرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میر معلوم ہے قلندر تھا

بارے دنیا میں رہو، غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

سر کِسو سے فِرو نہیں ہوتا
حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

کلامِ میر کے متعلق بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''میر کا کلام اور ان کی سیرت دونوں قابل مطالعہ ہیں اور دونوں نے مل کر میر کا رتبہ اردو شعراء میں نہایت بلند کر دیا ہے۔ ایسے باکمال اور صاحبِ سیرت لوگ کہیں مدّتوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کا نقش ایسا مستقل اور گہرا ہوتا ہے کہ زمانہ مٹا نہیں سکتا۔ خوب کہا ہے۔

مست سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں   تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں''

(انتخاب کلام میر، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلی، ص37)

غرض یہ کہ میر کے کلام میں مثبت طرز کی جو نشاندہی کی گئی ہے دراصل وہ میر کی شخصیت کا ہی ایک پہلو ہے۔ انھوں نے طویل عمر پائی تھی اور رنج و آلام بھی بہت برداشت کیے تھے۔ مگر زندگی بسر کرنے کا، زندگی جینے کا ان کا ایک اپنا مخصوص سلیقہ تھا۔ یہی سلیقہ مندی میر کے اشعار میں رجائیت کے پہلو روشن کرتی ہے۔

اس تعلق سے ہم نے بہت کم اشعار مثال کے طور پر پیش کیے ہیں۔ میر تقی میر کے کل 6 دیوان ہیں اور اس تعداد سے با آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میر کی شاعری کے مثبت عناصر پر ابھی کتنے اشعار مزید پیش ہونا باقی ہیں اور ان پر کس قدر تفصیلی بحث درکار ہے!

میر کی شاعری میں مثبت طرز کا جائزہ لینے کے لیے میر کے اشعار کو دو حصوں میں تقسیم کر لینا چاہیے۔ (1) عشقیہ موضوعات کے اشعار اور (2) غیر عشقیہ موضوعات کے اشعار۔ رجائیت کے لحاظ سے میر کی شاعری قابل غور ہے۔ ان کے یہاں بہت سے اشعار ایسے ہیں جو ہمارے دلوں میں روشنی و توانائی پیدا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ہی سہی مگر میر کی شاعری میں ظرافت کا رنگ بڑا دلفریب ہوتا ہے۔ چونکہ ان کی شاعری کا بہت بڑا حصہ المیے کی ترجمانی کرتا ہے اس لیے ان کے وہ اشعار جو المیہ کی تردید کرتے ہیں اور تصویر کا روشن پہلو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں، مزید توجہ نہ حاصل کر سکے۔ میر نے اپنے کردار، اپنی سیرت اور شخصیت کے متعلق بھی شعر کہے ہیں۔ میر کو اپنی شاعرانہ صلاحیت کے کمال پر فخر تھا ان کے کئی اشعار اس افتخار کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ اشعار ہم میں توانائی کا احساس پیدا کرتے ہیں اور ہمارے سامنے ایک آئیڈیل پیش کرتے ہیں۔

جلوہ ہے مجھی سے اب دریائے سخن پر   صد رنگ مری موج ہے، میں طبع رواں ہوں
میر کو کیوں نہ مُغتنم جانے؟   اگلے لوگوں میں اِک رہا ہے یہ
جانا نہیں کچھ، جز غزل، آ کر کے جہاں میں   کل میرے تصرف میں یہی قطعہ زمیں تھا
میر دریا ہے، سُنے شعر زبانی اس کی   اللہ، اللہ رے! طبیعت کی روانی اُس کی
بات کی طرز کو دیکھو، تو کوئی جادو تھا   پر ملی خاک میں، کیا سحر بیانی اس کی

اہل فن سمجھ سکتے ہیں کہ مصرع ثانی کی خاکساری میں بھی ایک افتخار ہے حالانکہ شعر مکمل کرنے کو یہ بھرتی کا مصرع ہے جب کہ میر کا نصب العین تو مصرع اولیٰ ہے۔ ایک دوسری غزل میں میر نے خود کے صاحب زبان اور صاحبِ طرز ہونے کا تو جیسے اعلان ہی کر دیا ہے اور اعلان کیا چیلنج کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی غزل کے دوسرے شعر میں زندگی سے میر کی محبت نمایاں ہے اور یہ دوسرا شعر اپنے مصرع ثانی میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ خیر یہ دونوں اشعار ملاحظہ ہوں۔

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر   یہ ہماری زبان ہے پیارے!
میر! عمداً بھی کوئی مرتا ہے؟   جان ہے، تو جہان ہے پیارے!

اب ذرا مثبت نقطۂ نظر اور زندہ دلی سے لبریز میر کے یہ اشعار دیکھیں۔

عشق میں، نَے خوف و خطر چاہیے   جان کے دینے کو، جگر چاہیے
شرط سلیقہ ہے ہر اِک امر میں   عیب بھی کرنے کو ہُنر چاہیے

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ   آئینہ تھا و لے قابل دیدار نہ تھا
اُگتی ہے میری خاک سے نرگس   یعنی اب تک ہے حسرت دیدار

میر کی شاعری کے متعلق وحیدالدین سلیم لکھتے ہیں:

''ایشیا کے شاعر بدنام ہیں کہ ان کا کلام اور ان کی زندگی دونوں مطابق نہیں ہیں مگر یہ مقولہ کہ شاعر کا کلام اس کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے، جتنا میر پر صادق آتا ہے شاید ہی کسی اور شاعر پر صادق آئے۔ ناکامی اور حسرت و یاس جس کو ہم قنوطیت کہتے ہیں، میر کے کلام کا ایک خاص پہلو ہے مگر ان کی زندگی کے اور پہلو بھی ہیں۔ اس لیے ہم قنوطیت کو جو غالب پہلو ہے، علیحدہ رکھ کر میر کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں، جس کی جھلک ان کے کلام میں پائی جاتی ہے۔

وہ جب کسی شخص کو دولت اور حکومت کی بلندی پر دیکھتے ہیں تو ان کے پاک دل میں حسد کا جذبہ موجزن نہیں ہوتا اور اگر کسی کو افلاس اور پستی کے بھنور میں چکر کھاتے دیکھتے ہیں تو اس کو حقارت کی نظر سے دیکھنا گناہ خیال کرتے ہیں۔ دنیا کے واقعات اور انقلابات سے ان کے اخلاق میں یکسانیت اور ہمواری پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

اب پست و بلند ایک ہے جوں نقش قدم یاں   پامال ہوا خوب تو ہموار ہوا میں''

(میر کی شاعری، افادات سلیم از وحیدالدین سلیم، بحوالہ رسالہ دستک ششماہی، شعبۂ اردو بی ایچ یو، بنارس، میر تقی میر نمبر جولائی تا دسمبر 2023، ص44)

یہ شعر غالب کے مشہور زمانہ شعر۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج   مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

کی یاد دلا رہا ہے۔ غالب کی ولادت 1976 کی ہے، میر کی وفات 1810 میں ہے۔ تقریباً چودہ برس کی عمر میں غالب جنھوں نے اپنے شعری سفر کی ابتدا فارسی شاعری سے کی، ممکن نہیں ہے کہ میر کی زندگی میں ان کا ہم عصر رہتے ہوئے مذکورہ بالا شعر کہہ دیا ہو۔ یہ بات یقینی ہے کہ غالب کا شعر میر کے شعر۔

اب پست و بلند ایک ہے جوں نقش قدم یاں   پامال ہوا خوب تو ہموار ہوا میں

سے بہت بعد میں کہا گیا ہے۔ اب مضمون باندھنے کی صورت میں تعجب نہیں کہ غالب کے سامنے میر کا یہ شعر چیلینج بن کر آیا ہو! گو کہ غالب میر کی عظمت کا اعتراف بھی کرتے تھے اور کمال فن میں اُنہیں اپنا حریف بھی گردانتے تھے۔

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب   کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

سو مضمون کو مستعار لیتے ہوئے ایک واضح شعر کہہ ڈالا۔

میر تقی میر کے مثبت طرز فکر اور زندگی میں نیک نیتی و زندہ دلی کے حوالے سے وحیدالدین سلیم اپنے مذکورہ مضمون میں ہی آگے لکھتے ہیں:

''میر کا فلسفہ معاشرت کیا ہے؟ یعنی ان کے نزدیک لوگوں کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے اور سوسائٹی میں رہ کر کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیے؟ یہ بحث بھی دلچسپ ہے اور اس کا تعلق میر صاحب کی شاعری اور ان کی زندگی سے ہے۔ اگر ہم کسی دل کو ڈھا کر کعبہ بنانا چاہیں تو ہمارا یہ فعل میر کی نظر میں ناجائز ہوگا۔ اگر ہمیں کوئی برا کہے تو اس کے جواب میں اس کی بھلائی کی دعا کرنی چاہیے۔ اگر ہم دنیا میں سرفراز ہونا چاہیں تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ رفاہ خلائق کی راہ میں خاک کی طرح اپنے تئیں پامال کریں۔ میر صاحب با آواز بلند فرماتے ہیں کہ خدا کی بارگاہ میں روزہ نماز کی حاجت نہیں ہے۔ اگر ہے تو اس بات کی ہے کہ تم نوع انسان کی دل جوئی کرو۔ ایک جگہ میر صاحب کہتے ہیں کہ اگر کوئی انسان کسی چیونٹی کو ستاتا ہے تو اس کے دل سے غبار اٹھتا ہے اور وہ عرش تک پہنچتا ہے۔ دنیا میں غم زدہ رہے یا دل شاد رہے، اس سے میر صاحب کو کوئی بحث نہیں۔ وہ تو صرف

یہ نصیحت کرتے ہیں کہ تم دنیا میں کوئی ایسا نیکی کا کام کر جاؤ کہ بہت دن تک تمھاری یاد لوگوں کے دلوں میں تازہ رہے۔ وہ دنیا کو ایک شیشہ گر کی دکان سے تشبیہ دیتے ہیں، جس میں زمین پر ہر طرف شیشے پھیلے ہوئے ہوں اور اہل دنیا کو ہدایت کرتے ہیں کہ ذرا احتیاط سے قدم رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ تمھارے چلنے سے کسی شیشے (یعنی کسی انسان کے دل) کو ٹھیس لگے، اگر ایسا ہوا تو اس بے احتیاطی کا خمیازہ شیشے کے ٹوٹنے کے ساتھ تمھیں بھی اٹھانا پڑے گا یعنی تمھارے تلوے زخمی ہو جائیں گے۔ یہ خیالات خود میر کی زبان سے سنو!

مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد — دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا
معیشت ہم فقیروں کی سی اخوان زماں سے — کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا
بسان خاک ہو پامال راہ خلق اے میر — رکھے ہے دل میں اگر قصد سرفرازی کا
بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو — ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو
ہردم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں — یہ کارگاہ ساری دکان شیشہ گر ہے

(میر کی شاعری، افادات سلیم از وحید الدین سلیم، بحوالہ رسالہ دستک ششماہی، شعبۂ اردو بی ایچ یو، بنارس، میر تقی میر نمبر جولائی تا دسمبر 2023، ص 50-49)

زندگی میں مثبت اور منفی نقطۂ نظر کا تعین ہماری کارگزاریوں سے ہوتا ہے یعنی مسلسل ہمارے اعمال کس سمت میں ہیں اور وہ کس قدر مستحکم ہیں۔ انسان اپنی زندگی میں مکمل طور پر نہ تو ہمیشہ مثبت رہ سکتا ہے اور نہ ہی منفی۔ مثبت اور منفی کا محاسبہ زندگی میں اختیار کیے گئے مجموعی طریقۂ کار پر منحصر ہوتا ہے۔

میر تقی میر نے اپنی زندگی میں حالات کی تنگی کے باوجود کبھی تنگ نظری اختیار نہیں کی۔ ان کے فکر و فن میں بلا کی وسعت موجود ہے۔ میر نے منجمد طریقۂ کار کے خلاف اپنی جنگ ہمیشہ جاری رکھی ورنہ دہلی سے لکھنؤ کا سفر کیوں کرتے۔ اگر میر کے اندر قنوطیت غالب ہوتی تو دہلی سے کوچ کرنا کبھی گوارا نہ کرتے اور دہلی میں ہی مرکھپ گئے ہوتے۔ میر کے یہاں تنوع ہے، زندگی میں بھی اور فن میں بھی۔ عمر کے آخری پڑاؤ میں لکھنؤ میں ایک شادی اور کی (ناصر لکھنوی کا بیان ہے کہ میر نے لکھنؤ پہنچ کر پیرانہ سالی میں دوسری شادی کی قاضی عبدالودود کے نزدیک یہ اس لیے بھی قرین قیاس ہے کہ میر کے دونوں بیٹوں فیض علی اور حسن عسکری (میر کلو عرش) کی عمروں میں بڑا تفاوت تھا اور دونوں کا ایک ماں کے بطن سے ہونا قرین قیاس نہیں۔ رسالہ دستک ششماہی، میر تقی میر نمبر، جولائی تا دسمبر 2023)۔ صرف شاعری ہی نہیں بلکہ نثر میں بھی طبع آزمائی کی اور زبردست کارنامے انجام دیے، نکات الشعرا، فیض میر اور ذکر میر بالخصوص قابل ذکر ہیں جن کا شمار اردو نثر کے کلاسکس میں ہوتا ہے۔ میر نے زندگی میں سفر بھی خوب کیے ہیں۔ ایک منفی نقطۂ نظر کا آدمی روانی سے گریز کرتا ہے، جمود کو پسند کرتا ہے اور میر کی زندگی میں جمود کا شائبہ تک نہیں۔ میر دراصل محبت کے آدمی تھے۔ ان کی سراپا شخصیت محبت میں شرابور تھی یہی وجہ ہے کہ جہاں پر اور جس میں محبت کا عنصر نمایاں نہ رہا، وہاں پر اور اس کے میر نہ رہے۔ عموماً جس کو لوگ میر کے افتاد طبع ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسلم فرخی لکھتے ہیں:

''میر نے محبت کی بے زبانی کو زبان عطا کی ہے۔ محبت کا نغمہ ہر شاعر نے چھیڑا ہے لیکن میر کی محبت رسمی اور محدود نہیں۔ یہ ان کے وجود کا بنیادی عنصر ہے۔ ان کے رگ و پے میں رواں دواں ہے۔ محبت ان کی فکر، ان کا ذہن، ان کا دل، ان کی روح ہے۔ 'محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور- نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور' اس محبت میں بے راہ روی نہیں، باغیانہ جوش نہیں، نرمی اور دھیما پن ہے۔ جذبہ تعمیر اور بہتر انسانیت کی تشکیل کا حوصلہ ہے۔ اسی محبت کے وفور نے میر صاحب کو خدائے سخن بنادیا ہے۔ میر نے طویل عمر پائی تھی، اسی مناسبت سے ان کا کلیات بھی ضخیم ہے۔ انھوں نے چھ دیوان مرتب کیے ہیں۔''

(میر تقی میر: سات آسمان از اسلم فرخی بحوالہ رسالہ دستک ششماہی، شعبۂ اردو، بی ایچ یو، بنارس، میر تقی میر نمبر جولائی تا دسمبر 2023، ص 21)

تخلیقیت مثبت رویوں کی حامل ہوتی ہے اور قنوطیت کی ضد ہوتی ہے۔ ایک قنوطیت کا مارا شخص اتنی کثیر تعداد میں تخلیقی کارنامے انجام دے ہی نہیں سکتا جتنا کہ میر نے دیے ہیں۔ میر کی وسعت خواہ فن کی ہو، ان کی زبان دانی کی ہو یا شخصیت کی یا پھر ان کی عمر دراز کا معاملہ ہو (میر نے تقریباً نوے برس کی طویل عمر پائی)، مجموعی طور پر زندگی میں مثبت طریقۂ کار کی غمازی کرتے ہیں۔ میر کے انھیں اوصاف پر گفتگو کرتے ہوئے ٹھاکر پرشاد سنگھ نے کیا عمدہ باتیں کہی ہیں:

''شکست و ریخت کے اس درد کے علاوہ بھی میر کے پاس بہت کچھ ہے، وہ کچھ ان حوصلہ مندوں میں سے تھے جو سخت ترین مصائب میں بھی خواب دیکھنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مصائب لوگوں پر آئے، گزر گئے۔ ان کی یاد بھی بعد میں باقی نہیں رہتی، لیکن مصائب کے ہجوم میں دیکھے ہوئے خواب زیادہ دوام حاصل کرتے ہیں اور آسانی سے ٹوٹتے نہیں، اور وہ صدیوں تک صرف اس لیے زندہ رہتے ہیں کہ وہ خواب جنھوں نے دیکھے تھے وہ خود ہجوم مصائب میں مبتلا تھے، اور اسی عالم میں انھوں نے پرورش پائی تھی، ایسے ہی خوابوں کو دوامی ادب کہا جاتا ہے اور انھیں کے بل پر ہم تہذیب و ثقافت کو مائل بہ ارتقا، آراستہ و پیراستہ ہوتے اور جدید اطوار و انداز اختیار کرتے دیکھتے ہیں۔ معلوم نہیں نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی اور ایسے ہی کتنے خوں خوار لشکروں کے بہیمانہ حملوں میں خاکستر ہوئی دلی کی گلیوں میں دھوئیں اور جلن کی کیسی بو رہی ہو، وہ جھونکا تو آیا اور گزر گیا لیکن میر کے ادب میں ایک اور لطیف تر جھونکا آج بھی موجود ہے۔

کہیں کیا بال تیرے کھل گئے تھے — کہ جھونکا باد کا کچھ مشک بو تھا

یہ لطیف و معطر جھونکا میر نے آنے والوں کو سونپا ہے جس سے وہ بہ وقت ضرورت دنیا کی ہر گلی میں بھری ہوئی سرانڈھ اور اباسی سے خود کو بچالے جاسکیں اور خوابوں کی دنیا میں زندگی بسر کرسکیں۔ معلوم نہیں یہ جھونکا موجود نہ ہونے کی شکل میں ہماری آپ کی کیا حالت ہوگی۔ یہ حیات آور شعور اور معطر خواب سب سے عظیم ورثہ ہے جو ہمیں میر اور اس قبیل کے شعرا سے ملا ہے، جب ہم میر کو یاد کرتے ہیں تو ان کے تصور کے ساتھ ساتھ یہ جھونکا آکر ہمیں خود میں غرق کر لیتا ہے اور ہم ایک تازگی کے احساس سے لبریز ہو جاتے ہیں۔''

(میر کی شاعری از ٹھاکر پرشاد سنگھ، حدیث میر از مقبول احمد لاری، بحوالہ رسالہ دستک ششماہی، شعبۂ اردو، بی ایچ یو، بنارس، میر تقی میر نمبر، جولائی تا دسمبر 2023، ص 56-55)

کتابیات

- میر کی شعری لسانیات از قاضی افضال حسین
- نقدِ میر اور شعر شور انگیز از ڈاکٹر یاسمین
- تلاشِ میر از نثار احمد فاروقی
- میر کی آپ بیتی از نثار احمد فاروقی
- میر تقی میر از نثار احمد فاروقی
- انتخابِ کلام میر، مرتبہ بابائے اردو مولوی عبدالحق
- منتخب غزلیں، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ
- دیوان میر (نسخۂ محمود آباد، مخطوطہ 1203ھ بحیات میر)، ترتیب و تدوین، ڈاکٹر اکبر حیدری، مطبوعہ جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، 1973
- رسالہ دستک ششماہی، شعبۂ اردو بی ایچ یو، بنارس، میر تقی میر نمبر جولائی تا دسمبر 2023

■

Dr. Ehsan Hasan
Asst. Prof. Dept of Urdu
Banaras Hindu University
Varanasi- 221005
Mob.: 9935352141

وسیم احمد علیمی

بین تہذیبی مکالمہ اور تحتیہ ترجمہ نگاری کا رجحان

> ترجمہ وقت کی ضرورت ہے اور اس کی بدلتی ہوئی شکلوں کا اعتراف بھی۔ اس سے آنکھ چرانے سے کسی اہل زبان کا بھلا نہیں ہو سکتا۔

اردو میں ترجمہ نگاری کے مباحث پر تحقیقی رجحانوں کا فقدان اس کے ارتقائی ادوار کی ہر دہائی میں دیکھا گیا ہے۔ اس کی وجوہات پر بے جا عرق ریزی کرنے سے بہتر ہے کہ عملی طور پر اس جانب توجہ دی جائے اور تکنیکی دنیا کے روز افزوں مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے ترجمے کے تحقیقی ابعاد کی تفہیم و تعبیر پر توجہ مرکوز کی جائے۔ جس طرح ادب کی قرات کا تعلق رفتہ رفتہ قرات سے سماعت کی طرف گامزن ہو رہا ہے اور تیز رفتار دنیا 'کوکو ایف ایم' 'آڈیبل' اور 'پوڈ کاسٹ' کی مرید ہوتی جا رہی ہے اسی طرح ویڈیو کا تعلق بھی فقط نظارگی سے نہیں رہ گیا بلکہ تکنیکی سہولیات نے 'Audio-Visual' (دید و شنید) کو خوب فروغ بخشا ہے اور اسی کے بطن سے Subtitle (تحتیہ ترجمہ) کی ضرورت نے جنم لیا ہے۔ اردو میں سبٹائٹل نگاری کی شعریات کے تعین سے قبل اس کا اصطلاحی اور تاریخی پس منظر، ضرورت و اہمیت اور رجحانات کے بارے میں جان لینا خالی از دلچسپی نہیں ہوگا۔

سبٹائٹل کو 'کیپشن' یا 'اوپن کیپشن' بھی کہا جاتا ہے۔ سبٹائٹل دراصل کسی ویڈیو میں نظر آنے والے مناظر یا بولی جانے والی آواز کا اسی زبان یا کسی دوسری زبان میں ترجمہ ہے جو اکثر ساتھ ساتھ نیچے کی جانب رواں دواں ہوتا ہے۔ انگریزی میں کسی مضمون کے ذیلی عنوان کو بھی 'سبٹائٹل' کہا جاتا ہے لیکن یہاں اس کا سیاق نہیں ہے۔ علم صرف کے مطابق Sub بمعنی ماتحت، ذیلی، تحتی اور Title بمعنی عنوان، نقش و نگار وغیرہ۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں سبٹائٹل کی تعریف یوں درج ہے۔ جس کا اردو مفہوم یہ ہے:

''سبٹائٹل سے مراد وہ الفاظ ہیں جو کسی فلم کے مکالمے کو دوسری زبان میں منتقل کرے اور ساتھ ساتھ اسکرین کے زیریں حاشیے پر نظر آئے۔ سبٹائٹل کا استعمال ٹی وی پر بھی ہوتا ہے خصوصاً اونچا سننے والوں کے لیے یا جو پوری طرح بہرے ہو چکے ہوں۔''

سبٹائٹل کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ ویڈیو کے آغاز سے ہی اس کی ضرورت اور استعمال دونوں دیکھا گیا ہے۔ فلم کے ابتدائی دنوں میں جب فلمیں بے آواز ہوا کرتی تھیں تب تحتیہ ترجمے کا استعمال کیا جاتا تھا تاکہ ناظرین کو مکالمے سمجھ میں آ جائیں۔ پھر جب فلمیں با آواز ہونے لگیں تب تحتیہ ترجمے کی ضرورت کم ہو گئی اور بوقت ضرورت کسی اشتہار یا انتباہ کے لیے صرف کیپشن کا استعمال ہونے لگا مثلاً سگریٹ نوشی کے مناظر کے وقت 'سگریٹ نوشی صحت کے لیے مضر ہے' کا انتباہ یا خودکشی کے مناظر کے وقت 'خودکشی کسی مسئلے کا حل نہیں ہے' کا انتباہ وغیرہ۔

اکیسویں صدی میں عالم کاری اور سرمایہ داری کے عروج نے سبٹائٹل کی ضرورت کو خوب مشتہر کیا یہاں تک کہ عالمی وبا کورونا وائرس کی وجہ سے عالمی بندش نے او ٹی ٹی (Over-the-Top) سے وابستہ تجارت کو مواقع بخشے جس سے سبٹائٹل کی ضرورت اور استعمال میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ فلمیں تھیئٹر کے بجائے او ٹی ٹی پر ریلیز ہونے لگیں، بچے اسکولوں کی جگہ موبائلوں اور دیگر تکنیکی آلات کی مدد سے پڑھنے لگے لہٰذا صارفیت نے اپنا مواد آسان تر بنانے کے لیے سبٹائٹل کے استعمال کو مزید بڑھا دیا۔

ویڈیو کے مناظر کو کسی کی مادری زبان میں ترجمہ کر دینا سرحدوں کی دیواروں کو گرا دیتا ہے اور ایک اردو جاننے والا ترکی زبان کے مکالموں سے اتنا ہی لطف اندوز ہوتا ہے جتنا کہ ایک ترک شہری۔ یہاں ایک اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ سبٹائٹل کے رواج نے مشہور مقولہ 'زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم' کی معنویت کو بھی ختم کر دیا ہے۔ اب اگر آپ کے یار کی زبان ترکی ہے اور آپ ترکی نہیں بھی جانتے تو سبٹائٹل کی مدد سے آپ کی یہ شکایت دور ہو سکتی ہے۔

جیسا کہ اوپر مذکور آکسفورڈ ڈکشنری کی تعریف سے واضح ہے کہ سبٹائٹل کا استعمال محض لطف بڑھانے کے لیے ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی کیا جاتا ہے جو

سننے سے قاصر ہیں یا اونچا سنتے ہیں۔ میں نے تو نیٹ فلکس پر بعض فلموں میں کہیں کہیں دیکھا ہے کہ جہاں منظر بالکل غیر مکالماتی ہے وہاں بھی سبٹائٹل کے استعمال سے لطف کو دو بالا کر دیا جاتا ہے مثلاً منظر میں گہرا سناٹا ہے اور تیز ہوائیں چل رہی ہیں، دور کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آرہی ہے۔اب ایسے منظر سے صرف وہی محظوظ ہوسکتا ہے جس کی قوت سماعت اچھی ہو لیکن سبٹائٹل کی مدد سے بہرے اور نصف بہرے لوگوں کو بھی اس منظر سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم ہوجاتا ہے۔

مصنوعی ذہانت کے دور میں کچھ پلیٹ فارمز ایسے ہیں جن میں موجود ویڈیو میں از خود ترجمہ نگاری (کیپشن Auto- Translate) کی سہولت بھی ہوتی ہے لیکن اس میں ابھی مزید پختگی کی ضرورت ہے۔بعض دفعہ تو مارے گھٹنا پھوٹے سر اور 'یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات' کے مصداق کسی ویڈیو پر از خود کردہ ترجمہ انتہائی مضحکہ خیز اور بے سر وپیر کا ہوتا ہے۔

اتنا ہی نہیں اگر آپ بھیڑ میں ہیں یا کسی ایسی جگہ جہاں موبائل سے نکلنے والی آواز دوسروں کو پریشان کرسکتی ہے ایسے ماحول میں بھی وقت کو ضائع کیے بغیر سبٹائٹل کی مدد سے فلموں، دستاویزی فلموں، عالمی شہرت یافتہ شخصیتوں کی تقاریر اور ترغیبی خطبات سے محظوظ ہوا جا سکتا ہے۔ لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سبٹائٹل کے رواج نے ہماری تیز رفتار دنیا کو بہتر کرنے میں بے حد مثبت تعاون کیا ہے۔

ترجمے کی شعریات تحتیہ ترجمے کی شعریات سے الگ ہے۔ ترجمے کا تعلق زیادہ تر کاغذ پر اترے ہوئے حروف سے ہے جب کہ تحتیہ ترجمے کا تعلق اکثر ویڈیو کے مناظر سے ہوتا ہے۔ ادبی یا صحافتی ترجمے کے لیے مترجم کا لسانی طور پر مسلح ہونا ضروری ہے جبکہ تحتیہ ترجمے کے لیے لسانی لیاقت کے ساتھ ساتھ تکنیکی طور پر بھی موزوں ہونا ناگزیر ہے۔مرکزی ترجمہ نگاری کا ترجمے کے بعد اصل متن سے کوئی وقتی تعلق نہیں رہتا جبکہ تحتیہ ترجمہ اسکرین پر ہی فراہم کیا جاتا ہے اور اس کا ایک ایک منظر ٹائمنگ کے موافق ہونا ضروری ہے۔مرکزی ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ متن کو دوسری زبان میں اچھے سے منتقل کر دے جبکہ تحتیہ ترجمے کے سروکار لسانیاتی اصولوں کے بجائے منظر کی بہتر عکاسی سے ہے۔ مرکزی ترجمہ اصل متن کے بغیر بھی پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے جبکہ تحتیہ ترجمہ اصل منظر اور ویڈیو کے بغیر بے معنی ہے۔

یوٹیوب اور دیگر جگہوں پر خال خال ہی اردو تحتیہ ترجمے کا استعمال نظر آتا ہے۔ اگر ہمارے اندر اردو کے فروغ کا جذبۂ صادق ہے تو ہمیں اس جانب بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ دنیا بھر میں اردو کی ایک بڑی آبادی بستی ہے اگر ہم نے صارفی دنیا کو اپنے وجود اور تعداد کا احساس دلانے میں کامیابی حاصل کر لی تو وہ دن دور نہیں جب دنیا بھر کی فلمیں ،ویب سیریز اردو کے قالب میں بھی منتقل ہوں گی اور اس طرح تحتیہ ترجمے کے ذریعے بھی اردو شہرت و مقبولیت کے منازل طے کرے گی۔

ترجمہ وقت کی ضرورت ہے اور اس کی بدلتی ہوئی شکلوں کا اعتراف بھی۔اس سے آنکھ چرانے سے کسی اہل زبان کا بھلا نہیں ہوسکتا۔ترجمہ کی بڑھتی ہوئی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے دیویندر اسّر اپنے مضمون 'ترجمہ: فن اور نظریہ' میں رقمطراز ہیں:

''مترجمین نے ترجمے کے فن کی جانب ہی ہماری توجہ مبذول نہیں کی بلکہ ان تھیوریوں کی جانب بھی ہماری توجہ دلائی ہے جن کے باعث موجودہ دور میں اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ترجمے کو محض فن ہی نہیں بلکہ سائنس کا درجہ دیتے ہیں... اس بدلتے ہوئے منظر نامے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اب علوم اور ادب بین العلومی اور بین التہذیبی ہو چکے ہیں۔

(ترجمے کے فنی اور عملی مباحث ،ص 18-16،شائع کردہ: جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ، 2012)

دیوندر اسر کی بات انتہائی قابل توجہ ہے کہ مترجمین نے ہی ان تھیوریوں کی جانب بھی ہماری توجہ مبذول کرائی ہے جن کی وجہ سے اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ تحتیہ ترجمے کے سیاق میں ان کے اس قول کی اہمیت اور بھی دو بالا ہو جاتی ہے کیونکہ جب تک ہم شاذ و نادر ہی سہی اردو میں ہو رہے تحتیہ ترجموں کا تنقیدی مطالعہ نہیں کریں گے ہم اس کی شعریات متعین نہیں کر سکتے۔ دوسری جگہ انھوں نے ادب اور علوم کے بین التہذیبی ہونے کی بات کی ہے۔اس ضمن میں او ٹی ٹی پر موجود مواد کی آوازوں کو ان کی اصل حالت میں باقی رکھتے ہوئے دنیا کی ایک تہذیب کو دوسری تہذیب کے سامنے پیش کرنے کا ہنر بھی ہمیں تحتیہ ترجمے کی ضرورت اور اہمیت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

فن ترجمہ نگاری کے ضمن میں تحتیہ ترجمہ نگاری کی اہمیت اور اس کے عناصر ترکیبی پر روشنی ڈالتے ہوئے Stavroula Sokoli اپنے تحقیقی مقالے بعنوان 'ریسرچ ایشوز ان آڈیو ویژول ٹرانسلیشن' میں لکھتی ہیں، جس کا مفہوم یہ ہے:

ترجمہ: یقیناً بین تہذیبی مکالمے کے طور پر تحتیہ ترجمے کا مطالعہ ایک وسیع اور اہم خاکے کی نشاندہی کرتا ہے۔مزید یہ کہ تحتیہ ترجمے کو متاثر کن مباحث کے طور منتخب کرنا ہی اپنے آپ میں کسی بھی قسم کے ترجمے کے مسائل سے وابستہ ایک بصیرت آمیز بحث ہے۔

مذکورہ اقتباس میں بھی تحتیہ ترجمے کو مرکزی ترجمے کی شعریات کا حصہ تسلیم کیا گیا ہے اور اس سے قبل مذکور دیویندر اسر کے مضمون سے مندرج اقتباس میں ترجمے کی تھیوریوں کے حوالے سے جو بات کہی گئی تھی اس کی تائید یہاں بھی ہو رہی ہے کہ ترجمے کے جتنے بھی جدید مباحث ہیں ان کی طرف تحقیق کاروں کی توجہ کا مبذول ہونا مرکزی ترجمے کے مباحث کے لیے نئے دروازے کھولنے کے مساوی ہے۔

یہاں سبٹائٹل نگاری کے مزید چند اہم اصولوں سے بحث کرنا ناگزیر ہے۔اس ضمن میں یوروپی یونین کی کاؤنسل نے اپنے مترجمین کو سبٹائٹل ترجمہ کرتے وقت جن نکات کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت کی تھی ان میں سے چند اہم نکات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس تناظر میں سب سے کلیدی نکتے کی نشاندہی ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

''متن لازمی طور پر مختصر ہو اور مکالموں کے مطلوبہ معانی کی بہتر ترسیل کرے اور اس کے اندر ایک قسم کا فطری بہاؤ بھی ہو۔''

ان نکات میں سے اخذ شدہ درج ذیل اشاریات بھی قابل توجہ ہو سکتے ہیں:

- کسی بھی حال میں اصل مفہوم ضائع نہ ہو۔
- طویل جملوں کو مختصر مکالموں کی شکل میں توڑ دیا جائے۔
- ہر سبٹائٹل میں زیادہ سے زیادہ دو سطور ہی ہوں۔
- اور کسی سطر میں 45 سے زیادہ الفاظ نہ ہوں۔
- اگر مکالمے کا دورانیہ تین سیکنڈ سے زیادہ کا ہو تو دو سطور رکھیں جائیں وگرنہ ایک ہی سطر کافی ہے۔
- ترجمے کی تکمیل کے بعد ویڈیو چلا کر سبٹائٹل پر نظر ثانی کر لینا اشد ضروری ہے۔

تحتیہ ترجمے کے مقاصد سے پرے زبان سیکھنے کے خواہشمند لوگ سبٹائٹل کا استعمال زبان سیکھنے کے مقصد سے بھی کرتے ہیں۔مثلاً ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرنے کے خواہشمند طلبا اگر کورین، جاپانی، جرمن، ترکی یا عربی زبان کے مترجم بننا چاہتے ہیں تو ان کے لیے ان زبانوں میں بنی فلمیں اور ڈرامے بے حد سود مند ثابت ہوتی ہیں اور وہ زبان آموزی کی نیت سے ان فلموں اور ڈراموں کا سبٹائٹل کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں تاکہ دلچسپی کا سامان بھی مہیا

رہےاورزبان آموزی کا مقصد بھی پورا ہوجائے۔

عالم کاری اور سرمایہ داری ترقی پذیر دنیا کے دو ایسے پہلو ہیں جن کا اثر ہر میدان میں محسوس کیا جا رہا ہے۔ انٹرنیٹ نے دنیا کو ایک گاؤں بننے میں دیر نہیں لگنے دیا اور اب عالمگیریت کے مثبت نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ ایک زبان میں بنی فلمیں جو فقط اسی زبان کے بولنے اور سمجھنے والوں تک محدود تھیں، سرحدیں لانگھ کر دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان میں شائقین کو سامانِ لطف فراہم کر رہی ہیں اور اس کے درپردہ فلموں کی تجارت بھی اپنی معراج کمال کو پہنچ رہی ہے۔ لیکن یہ سب ممکن کیسے ہوا؟ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ یہ سب Dubbing کے فیوض و برکات ہیں۔ Dubbing یعنی کسی زبان کی فلم میں بولے جانے والے مکالموں کو دوسری زبان میں بدل دینا۔ 'ڈبنگ' کے اردو متبادل و مترادف کی بات کریں تو مجھے اب تک اردو کی لغات میں اس کے پہلو بہ پہلو کوئی لفظ نہیں ملا۔ کچھ برقی لغات میں اس کا مفہوم بیان کر دینے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ لہٰذا میں جدید ترین اصطلاح 'Dubbing' کے لیے اردو اصطلاح 'صوتیہ ترجمہ' کا استعمال کر رہا ہوں۔

تحتیہ ترجمے کی طرح صوتیہ ترجمہ بھی تحریر شدہ متن کے بجائے کسی ویڈیو میں بولی گئی آواز کو دوسری زبان میں منتقل کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور یہ صرف فلموں تک محدود نہیں بلکہ صوتیہ ترجمے کی وابستگی کسی بھی قسم کے ویڈیو سے ہوسکتی ہے خواہ وہ ویڈیو صحافتی، سائنسی، دستاویزی، طبی یا ادبی مواد پر مشتمل ہو۔ ابھی کچھ دہائی قبل تک ہندوستان جیسے کثیر اللسان ملک میں بننے والی فلمیں مخصوص اہل زبان تک محدود ہوا کرتی تھیں لیکن صوتیہ ترجمے کی آمد نے شائقین فلم پر مخصوص لوگوں کی اجارہ داری کو ختم کر دیا۔ مثال کے طور پر 2022 میں منظر عام پر آنے والی ایس ایس راجا مولی کی مشہور ایکشن ڈراما فلم بنیادی طور پر تیلگو میں بنی تھی لیکن ریلیز سے قبل ہی اس کا ہندی زبان میں بھی صوتیہ ترجمہ کیا گیا اور شمالی ہند کے سنیما گھروں میں بھی اس فلم کی نمائش کی گئی۔ فلم نے بلا کسی لسانی امتیاز کے شمالی ہند میں اپنے سکے جما لیے۔ اسی طرح جنوبی کوریا میں بنی مشہور ٹیلی ویژن ویب سیریز 'Squid Game' (اسکوئیڈ گیم) دنیا کی بیشتر زبانوں میں صوتیہ ترجمے کی مدد سے منتقل کی گئی اور دنیا بھر کے فلمی شائقین نے اس ڈرامے کو خوب سراہا۔ جس طرح دنیا کے کسی ایک خطے اور ایک زبان میں لکھا گیا ادب متنی ترجمے کی بدولت دنیا بھر کے قارئین سے داد و تحسین وصول کر سکتا ہے اسی طرح صوتیہ ترجمے کی مدد سے فلمیں بھی زبانوں کے دائروں کو پھلانگ کر عالمی میزان پر اپنا حق خوب وصول کر رہی ہیں۔ اس ضمن میں اردو کا دائرہ بے حد ناگفتہ بہ ہے۔ فلموں کے صوتیہ ترجمے کے حوالے سے بڑے پروجیکٹوں میں اردو کی جگہ انتہائی تنگ ہے اور اس کی بنیادی وجہ ہے صوتیہ ترجمے میں استعمال ہونے والی زبان۔ چونکہ صوتیہ ترجمے میں کسی خاص رسم الخط کا ذرہ برابر بھی عمل دخل نہیں ہوتا لہٰذا ہالی وُڈ کی بڑی فلمیں بڑی چالاکی سے ایسی زبان میں منتقل کی جاتی ہیں جو برصغیر کے عام فہم ناظرین کے

> ”
>
> **اردو میں باضابطہ صوتیہ ترجمے کچھ ترکی تاریخی ڈراموں کے ہوئے ہیں۔ اردو زبان کے دامن کو مزید وسیع کرنے کے لیے اہل زبان کو صوتیہ ترجمے کی طرف بھی متوجہ ہونے کی ضرورت ہے ساتھ ہی اس کے قواعد، شعریات، لسانیاتی ابعاد، تہذیبی پس منظر اور تجارتی مفاد کے پہلوؤں کا بھی مطالعہ ضروری ہے۔**
>
> “

لیے کافی ہو۔ میں نے ذاتی طور پر سنیما گھر میں ہالی وڈ کی کچھ ایسی فلمیں دیکھی ہیں جن کو صوتیہ ترجمے کی مدد سے ہندی میں منتقل کیا گیا تھا لیکن اس میں استعمال ہونے والی زبان ہندی اور اردو کے درمیان کی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی مثال 2018 میں بنی جیمس وان کی فلم 'ایکوامین' بھی ہے جس میں فکشن کی مدد سے پانی کے اندر بسے براعظموں کا خیالی نقشہ بے حد دلچسپ انداز میں کھینچا گیا ہے۔ اس فلم کے صوتیہ ترجمے کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو لسانی طور پر اس میں استعمال ہونے والی زبان نہ پوری طرح ہندی ہے اور نہ مکمل طور پر اردو۔ بلکہ صوتیہ ترجمے کی ٹیم نے بغرض تجارت اس میں درمیانی زبان کا استعمال کیا ہے اس طرح کہ ہندی اور اردو دونوں کے اہل زبان کی سماعت کو اس فلم کے مکالمے اپنی زبان کے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً اس فلم کے صوتیہ ترجمے سے ایک مکالمہ ملاحظہ کریں اور خود فیصلہ کریں کہ اس میں استعمال ہونے والی زبان کس لسانی زمرے میں رکھی جا سکتی ہے؟

''تم نے سہی کہا ہاں میں ناجائز ہوں، یہاں اس لیے نہیں آیا کہ خود کو لائق سمجھتا ہوں، پتہ ہے میں نہیں ہوں۔''

یہ مکالمہ فلم کے اس منظر میں ہے جہاں ایکوامین کو بادشاہ اٹلانٹین کی معجزاتی ترسولی دستیاب ہوتی ہے۔ اسی منظر میں ایک اور مکالمہ ہے جس کا لسانیاتی مطالعہ بے حد دلچسپ ہوگا:

''ہو کون تم؟

میں کچھ بھی نہیں ہوں، کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے آیا ہوں بس میری دنیا کو اور اپنوں کو بچانے کے لیے میں آیا ہوں کیونکہ ترسولی ہی میری آخری امید ہے۔''

اب آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ ان مکالموں میں کون سی زبان استعمال ہوئی ہے، لیکن ایک بات اظہر من الشّمس ہے کہ صوتیہ ترجمے لسانی اظہار کی توسیعی گنجائشوں کو مزید مستحکم کرنے میں ایک زبردست آلۂ کار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو میں باضابطہ صوتیہ ترجمے کچھ ترکی تاریخی ڈراموں کے ہوئے ہیں۔ اردو زبان کے دامن کو مزید وسیع کرنے کے لیے اہل زبان کو صوتیہ ترجمے کی طرف بھی متوجہ ہونے کی ضرورت ہے ساتھ ہی اس کے قواعد، شعریات، لسانیاتی ابعاد، تہذیبی پس منظر اور تجارتی مفاد کے پہلوؤں کا بھی مطالعہ ضروری ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مرکزی ترجمہ نگاری کے ضمن میں سبٹائٹل کی شعریات کو نظر انداز کرنا ترجمے کی تحقیقی ذمہ داریوں کو فراموش کرنے کے مترادف ہے۔ اردو زبان و ادب کی ترقی اور چہار دانگ عالم میں اس کی دھوم کے لیے ضروری ہے کہ تکنیکی دنیا میں ہو رہے نت نئے تجربوں سے اردو کو باکرہ رکھنے کی کوشش بے جا نہ کی جائے بلکہ ہر میدان میں بقدر گنجائش اردو کی ترجمانی اور بالخصوص ٹکنالوجی سے وابستہ تجربوں اور ایجادات کے شعبے میں اردو کی نمائندگی کے لیے نئی نسل کی تربیت بے حد ضروری ہے۔ ترجمہ نگاری زبان و ادب کا ایک اہم شعبہ ہے اور تحتیہ ترجمے کی تحقیق پر توجہ دینا اس کی لسانیاتی توسیع کے تقاضوں میں سے ایک ہے۔

■

Wasim Ahmad Alimi
(Urdu Translator), Electione & Urdu Language Cell, Block Office, Jalalgarh
Purnia- 854327 (Bihar)
Mob.:7835961227

زاہد یاسین شاہ

جموں وکشمیر کے

نمائندہ غیر مسلم افسانہ نگار

”اگر اردو افسانے کے میدان پر نظر ڈالی جائے تو یہاں غیر مسلم افسانہ نگاروں کی طویل فہرست مرتب ہے۔ پریم ناتھ در، ٹھاکر پونچھی، وجے سمن، سوم ناتھ زتشی، رام کمار ابرول، موہن یاور، تیج بہادر بھان، وید راہی، پشکر ناتھ، مدن موہن شرما، کلدیپ رعنا، ویریندر، اور دیپک بدکی، دیپک کنول اور اشوک پٹواری کے علاوہ کئی غیر مسلم نام افسانہ نگاری کی آبیاری کرنے میں منہمک ہیں۔“

اس بات سے ہم سب بہ خوبی واقف ہیں کہ جموں، کشمیر اور لداخ اپنے حسن وفطرت کی بنیادوں پر ہر کسی کو اپنی طرف کھینچنے کی مقناطیسی قوت رکھتے ہیں۔ یہ تینوں خطے زبان، مذہب، ثقافت اور معاشرت کے بہترین نمونے ہیں۔ ان خطوں میں وادی کشمیر کی خوب صورتی اور حسن وجمال سے کون شناسا نہیں۔ یہاں کی صبحوں کا پر کیف اور خاموش منظر ہو یا شاموں کی مدھم اور مشکبار ہواؤں کی سرسراہٹ، جھرنوں کے پانیوں کا جھوم جھوم کے گرنا ہو یا جھیل ڈل کے کنارے پر واقع حضرت بل کی درگاہ سے اللہ اکبر کی اذانوں کی گونج، گلمرگ کے سلسلہ وار پہاڑوں پر استادہ سرو، دیودار اور کاریو کے بلند قامت پیڑوں کا خوش منظر ہو یا پہلگام کے دریائے لدر میں بہنے والے پانی کی موجوں کا انسان کو راحت و آرام میسر پہنچانا۔ اسی طرح یہاں کے لوگوں کی اعلیٰ ظرفی اور ان کی مہمان نوازی کی انوکھی ادا ہر آنے والے سیاح کو ان سادہ لوح کشمیریوں کے حسن سلوک کا گرویدہ بناتا ہے۔ یہ روایت یہاں کے ماضی سے بھی گہرے طور سے منسلک ہے اور آج بھی اس میں وہی شدت اور وہی خلوص ومحبت کی چاشنی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگ عام طور پر ایک دوسرے کے ساتھ کشمیری زبان میں ہی بات چیت کرتے ہیں۔ تاہم اردو جموں وکشمیر کی سرکاری زبان۔ اس زبان سے قبل یہاں فارسی اور سنسکرت جیسی بڑی زبانوں کا بھی نہ صرف چلن رہا ہے، بلکہ ان زبانوں میں یہاں ادبی کام بھی ہوا ہے۔ اردو کے فروغ میں جہاں مسلمان قلم کاروں نے اس سرزمین میں اپنی پیش رفت کا اظہار کیا وہیں دوسری جانب اردو کی بقا کے لیے غیر مسلم کشمیری ادیبوں اور شاعروں نے بھی دل کے نہاں خانوں کو قرطاس پر رقم کرنے میں کافی دلچسپی دکھائی ہے۔

جموں وکشمیر میں اردو کو 1889 میں مہاراجہ پرتاب سنگھ کے عہد میں سرکاری درجہ ملا۔ اس سے قبل اس زبان کی جڑیں یہاں کی زمین میں پوری طرح سے مضبوط ہو چکی تھیں۔ اردو سے دلچسپی لینے والوں کی اگر چہ تعداد کافی اچھی تھی مگر اب اس میں ادبی اظہار کے لیے نئے نئے چہرے سامنے آنے لگے۔ جموں وکشمیر میں اردو کی شعری اور نثری اصناف میں ہندو فن کاروں نے طبع آزمائی کر کے اپنے ہنر کا بھرپور ثبوت پیش کیا۔ باقی دوسری اصناف کے ساتھ ساتھ یہاں فکشن خصوصاً افسانے کی طرف غیر مسلم قلم کاروں نے کافی اچھی پہل کی اور اس بات میں کوئی شبہ ہی نہیں کہ اردو فکشن کے آغاز کا سہرا بھی غیر مسلم افسانہ نگار ہی کے سر جاتا ہے۔ عبدالقادر سروری اپنی کتاب 'کشمیر میں اردو' میں پریم ناتھ پردیسی کو اردو کے پہلے افسانہ نگار قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر برج پریمی عبدالقادر سروری کی رائے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے محمد الدین فوق کو اردو کا پہلا افسانہ نگار قرار دیتے ہیں۔ بہر حال جموں وکشمیر میں اردو کا پہلا افسانہ نگار کون ہے یہ الگ بحث ہے، البتہ دونوں کے مطابق اردو کا پہلا افسانہ نگار غیر مسلم ہی ہے۔ اس کے بعد اگر اردو افسانے کے میدان پر نظر ڈالی جائے تو یہاں غیر مسلم افسانہ نگاروں کی طویل فہرست مرتب ہے۔ پریم ناتھ در، ٹھاکر پونچھی، وجے سمن، سوم ناتھ زتشی، رام کمار ابرول، موہن یاور، تیج بہادر بھان، وید راہی، پشکر ناتھ، مدن موہن شرما، کلدیپ رعنا، ویریندر، اور دیپک بدکی، دیپک کنول اور اشوک پٹواری کے علاوہ کئی غیر مسلم نام افسانہ نگاری کی آبیاری کرنے میں منہمک ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کے ذریعے سماجی حقیقتوں کا بے لاگ اظہار کیا۔ ان کے یہاں کشمیر کی مختلف جہتوں کا برمحل برتاؤ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان میں بیشتر افسانہ نگاروں نے یہاں کے ان مسائل کو پیش کیا ہیں جن سے یہاں کی عوام جوجھتی ہوئے نظر آتی ہے۔ جموں وکشمیر کے غیر مسلم نمائندہ افسانہ نگاروں میں سب سے پہلا نام پریم ناتھ پردیسی کا آتا ہے۔

پریم ناتھ پردیسی 1909 میں سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ان کا حقیقی نام مدھوسودھن سادھو تھا۔ شاعری میں وہ روتق تخلص استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح کہانیوں کے لیے انھوں نے پہلے پریم ناتھ سادھو کے نام سے لکھا اور بعد میں پریم ناتھ پردیسی کے نام سے ادبی حلقوں میں معروف ہوئے۔ پریم ناتھ پردیسی شاعر اور افسانہ نگار کے علاوہ

ایک اچھے صحافی بھی تھے۔ ماہنامہ دلیش، استاد، آگہی، صدف، سہیل وغیرہ پردیسی کے اخبارات تھے۔ ان کی ادبی نگارشات اس وقت کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوئیں۔ انھوں نے آل انڈیا ریڈیو کشمیر میں بحیثیت پروگرام اسسٹنٹ کے بھی کام کیا۔ یہاں انھوں نے ڈراما نگاری کی طرف اپنے مزاج کو موڑا اور کئی ریڈیائی ڈرامے تحریر کر کے عوام سے دادِ تحسین حاصل کیا۔ سنگ تراش، سوامی اور سنگرش وغیرہ پریم ناتھ پردیسی کے قابلِ تعریف ڈرامے کہے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک پردیسی کی افسانہ نگاری کی بات ہے، اس سلسلے میں ان کا پہلا افسانہ اپریل 1932 میں روزنامہ 'رنبیر' جموں سے 'سچی پراتھنا' کے عنوان سے شائع ہوا۔ 'دنیا ہماری، شام وسحر اور بہتے چراغ' پردیسی کے ایسے افسانوی مجموعے ہیں، جن سے موصوف کی فنی اور فکری صلاحیتوں کا بھر پور علم ہوتا ہے۔ پردیسی کے افسانوی مجموعہ 'شام وسحر' میں حقیقت پسندی کا عمدہ امتزاج ملتا ہے۔ یہ افسانے رومان اور جذبات پسندی کی رو میں بہنے کی بجائے فن کار کی ذمے داریوں کے عکاس ہیں۔ ان میں پردیسی کی بلوغیت کا واضح اشارہ ملتا ہے۔ اس افسانوی مجموعے سے پہلے کے افسانوں میں بقول پریم ناتھ بزاز رومانیت، غیر کشمیری واقعات اور کردار ان کے افسانوں میں ملتے ہیں۔

پریم ناتھ پردیسی نے اپنے افسانوں میں کشمیر کے موضوع کو جس انداز سے برتا ہے وہ ان ہی کا خاص وصف ہے۔ انھوں نے یہاں کی تہذیب وتمدن اور انسانی حقیقتوں کا برمحل اور صاف ستھرا اظہار اس انداز سے کیا ہے کہ ان کے اس طرز کے افسانوں کو پڑھنے سے یہاں کا لینڈ اسکیپ صاف اور واضح انداز میں سامنے آتا ہے۔

پردیسی کے بعد جموں وکشمیر میں سب سے نمایاں افسانہ نگار پریم ناتھ در کہلاتے ہیں۔ وہ 25 جولائی 1914 میں حبہ کدل سرینگر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی تعلیم سرینگر ہی میں حاصل کی۔ پریم ناتھ دراصل ایک باوقار افسانہ نگار ہیں، البتہ انھوں نے اپنی فطری صلاحیت کو جلا بخشنے کے لیے صحافت کے میدان میں بھی قدم جمائے۔ اس ضمن میں وہ 'ہندوستان ٹائمز' کے ساتھ وابستہ رہے۔ علاوہ اس کے وہ آل انڈیا ریڈیو میں ہفت روزہ 'انڈین لسنر' اور 'آواز' کے مدیر بھی رہے ہیں۔ پریم ناتھ در کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ انھیں نہ صرف اردو بلکہ انگریزی زبان پر بھی کامل دسترس حاصل تھی۔ ان کا پہلا افسانہ 1945 میں لاہور سے اس لیے شائع ہوا کیونکہ اس عہد میں جموں و کشمیر میں اخبارات پر پابندی تھی اور اگر کوئی اخبار نکلتا بھی تھا تو وہ سرکاری حکم نامے کے تحت چلتا تھا۔

پریم ناتھ در چوں کہ اولاً افسانہ نگار رہے ہیں۔ اس تناظر میں ان کے جتنے بھی افسانے منصۂ شہود پر آئے ہیں وہ تمام فنی، فکری اور سماجی لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے افسانوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کا مطالعہ کس قدر وسیع رہا ہے، اس کے علاوہ ان کے یہاں انسانی تجربات کا ایک خاص وصف پایا جاتا ہے۔ وہ انسانی نفسیات کا گہرا علم رکھتے تھے اس بات کا ثبوت ان کے افسانوں میں جا بجا نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں طرح طرح کے موضوعات پائے جاتے ہیں اور یہ موضوعات ایک دم سے قاری کو اپنی گرفت میں لینے کی قوت رکھتے ہیں۔ ان کے اسلوب کا نرالا انداز ہو یا جذبات نگاری کا اظہار، علامتوں سے پیدا ہونے والی صورت حال ہو یا وحدت تاثر کا پر کیف سماں۔ ان کے فن کے حوالے سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے بجا طور پر کہا ہے:

''پریم ناتھ در کے افسانے رومان اور حقیقت کا ایک خوب صورت امتزاج ہیں۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے خوبصورت نثر میں لکھا ہے۔ ان کی تحریر 'از دل خیز د بر دل ریزد' کے مصداق اپنے ہر قاری کو متاثر کرتی ہے۔ اس طرز تحریر کی بدولت انھوں نے اپنی فکر اور اسلوب بیان کو اس طرح ایک دوسرے میں سمویا ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا دشوار ہے۔''

(پریم ناتھ در، چناروں کے سائے میں، فنکار کلچر آرگنائزیشن لال بازار سرینگر، 1991، ص 23-22)

کاغذ کا واسدیو، نیلی آنکھیں، چناروں کے سائے میں پریم ناتھ در کے افسانوی مجموعے ہیں۔ ان مجموعوں میں مختلف سماجی مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کے مذکورہ مجموعوں میں کشمیر کے تعلق سے جتنے بھی افسانے شامل ہیں ان کی اہمیت اس لحاظ سے مسلم ہے کہ ان میں یہاں کے درد و کرب اور تہذیب و ثقافت کے علاوہ سادہ لوح انسانوں کی ان تمام خصوصیات کو کسی نہ کسی صورت میں پیش کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے وہ آج بھی پہچانے جاتے ہیں۔ 'کھڑکی، دودھ، چڑھاوا اور گیت کے چار بول' پریم ناتھ در کے بہترین افسانے ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعے سے پریم ناتھ در کے فکر وفن کا خوب پتا چلتا ہے۔

جموں وکشمیر کے نمائندہ اردو افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ٹھاکر پنچھی کا ہے۔ ٹھاکر پنچھی ایک ساتھ کئی ادبی اصناف میں اپنا تشخص قائم کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ وہ ایک بہترین ناول نگار، افسانہ نگار، ڈراما نگار اور ترجمہ نگار رہے ہیں۔ ان کی پیدائش جموں کے پونچھ علاقے میں ہوئی۔ آپ نے آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو کشمیر جموں میں اپنے فرائض منصبی انجام دیے ہیں۔ ڈراموں کے ساتھ جڑنے کی وجہ آغا حشر کاشمیری اور جموں تھیٹریکل کمپنی بنی۔ ٹھاکر پنچھی زود نویس کہلاتے ہیں، لیکن انھوں نے صرف دو ہی افسانوی مجموعے شائع کرائے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کئی ناول بھی تخلیق کیے اور یہی ناول ان کی مقبولیت کا سبب بن گئے۔ بادل برسے، رات کے گھونگٹ، وادیاں اور ویرانے، زلف کے سر ہونے تک اور چاندنی کے سائے وغیرہ پردیسی کے معیاری ناول ہیں۔ بحیثیت افسانہ نگار ٹھاکر پنچھی کا قد جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں میں کافی اونچا نظر آتا ہے۔ 'زندگی کی دوڑ' اور 'چناروں کے چاند' ٹھاکر پنچھی کے افسانوی مجموعے ہیں۔ ان مجموعوں میں شامل افسانوں کی نوعیت بالکل کم وبیش وہی ہے جو یہاں کے دیگر افسانہ نگاروں کی خصوصیات میں شامل ہیں۔ ٹھاکر پنچھی کا اولین افسانہ 'راجا' کے عنوان سے کالج میگزین 'توی' میں شائع ہوا۔ اسی طرح ابتدائی افسانوں میں ان کا افسانہ 'کالکی' جموں کے ہفتہ وار اخبار 'چاند' میں چھپ کر آیا۔ ٹھاکر پنچھی منشی پریم چند کی فکر وسوچ سے کافی متاثر تھے۔ ان کے افسانوں میں پریم چند کے اثرات کافی حد تک پائے جاتے ہیں۔ پونچھ ہندوستانی سرحد کے قریب ایک خوب صورت اور دلکش علاقہ ہے۔ یہاں کی مٹی تعلیم وفنون کے لحاظ سے کافی زرخیز نظر آتی ہے۔ اس علاقے سے کئی شاعر اور ادیب پیدا ہوئے ہیں اور اس وقت بھی اس دور افتادہ علاقے سے اردو کی آبیاری کرنے میں کئی شعرا و ادبا منہمک ہیں۔ ٹھاکر پنچھی کو اپنی منفرد افسانوی بنیادوں کی وجہ سے پہاڑی رومانوں کا ترجمان افسانہ نگار کہا جاتا ہے۔ ان کے افسانہ 'موت کے سائے' کو آل انڈیا مقابلے میں پہلا انعام حاصل ہوا ہے۔

پنچھی کے افسانوں میں جہاں بلند قامت پہاڑوں سرسبز وادیوں، اونچے اونچے درختوں اور پہاڑوں اور اس کے دامن میں رہنے والے لوگوں کی خوش گوار زندگی کی عکاسی ملتی ہے وہیں دوسری جانب ان میں یہاں کے عوام کی ان مشکلات کا بھی انکشاف ہوتا ہے جن کو وہ ایک طویل عرصے سے برداشت کر رہے ہیں۔ ان معصوم اور بے قصور لوگوں کی آہیں اور سسکیاں ان کے افسانوں میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ اس طرح کا کرب ناک اظہار قاری کو ایک پر آشوب اور الم ناک دنیا میں دھکیل دیتا ہے۔ جان محمد آزاد ٹھاکر پنچھی کے افسانوی مجموعہ 'زندگی کی دوڑ' کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس انداز سے

کرتے ہیں:

اس مجموعے کے افسانوں میں موت کے سائے تلے، ڈھولک بجتی رہے... یہ افسانے نہیں بلکہ شہروں سے دور پہاڑوں میں رہنے والے معصوم اور سادہ لوگوں کی دھڑکنیں ہیں۔"

(جان محمد آزاد، جموں و کشمیر کے اردو مصنفین، جے اینڈ کے اکیڈمی آرٹ لکچر اینڈ لینگویجز سرینگر، 2008، ص 438)

ٹھاکر پنچھی کے افسانوں میں اسلوب کی انفرادیت ملتی ہے اور یہ انفرادیت ان کے افسانوں سے شروع ہوکر ناولوں میں جا کر بس جاتی ہے۔ ان کے افسانوں میں انسانی نفسیات، سیاسی و سماجی باریکیوں کا رچاؤ ملتا ہے۔ ان کے ناول اور افسانے کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئے ہیں، جن میں بنگالی، ملیالم، پنجابی اور ہندی زبانیں وغیرہ شامل ہیں۔

جموں و کشمیر میں اردو افسانے کو اپنے احساسات اور تجربات سے مالا مال کرنے میں پشکر ناتھ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ پشکر ناتھ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ناول اور ڈراما نگاری میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ پشکر ناتھ کا تعلق سرینگر کے عالی کدل سے تھا۔ وہ 1934 میں پیدا ہوئے۔ آپ کو علم و ادب کے ساتھ کم سنی ہی میں دلچسپی تھی۔ ابتدا ہی سے آپ مختلف ادبی سرگرمیوں میں شریک ہوتے تھے۔ بدرالدین پشکر ناتھ کے قریبی دوست تھے اور ان کے ساتھ مل کر دونوں نے 'حلقۂ علم و ادب' کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ پشکر ناتھ نے حکیم منظور، مخمور بدخشی اور محی الدین شال کے ساتھ مل کر 'حلقہ ارباب ذوق' نامی تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ یہ تنظیم ادبی لحاظ سے کافی دور رس ثابت ہوئی اور بعد میں یہ اپنے مقاصد اور اصولوں سے دور ہوتے چلے گئے۔ اس تنظیم نے جموں و کشمیر میں شعر و ادب کے فروغ کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

پشکر ناتھ نے اپنا پہلا افسانہ برج پریمی کے قول کے ردِ عمل میں لکھا تھا۔ یہ افسانہ اس وقت لکھا گیا جب پشکر ناتھ نے اپنا پہلا افسانہ 'اور کہانی ادھوری رہ گئی' کے نام سے لکھا تھا۔ اس افسانے پر برج پریمی نے انھیں یہ کہا کہ وہ اس سے عمدہ کہانی لکھ کر دکھائے، چنانچہ پشکر ناتھ نے اس چیلنج کو قبول کر کے کئی خوب صورت اور معنی خیز افسانے لکھے۔ ایسے افسانوں میں 'موت کے سوداگر، پردہ نشین، ڈل کے باسی، گلوان، گالی، ابابیل، شہرِ بے چراغ اور درد کا مارا' وغیرہ شامل ہیں۔ یہ افسانے ملک کے مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہوئے اور اس طرح پشکر ناتھ کو افسانہ نگاری کے میدان میں ایک خاص جگہ مل گئی۔ پشکر ناتھ ایک حساس، اور تجربہ کار فن کار تھے۔ ان کی ذہنی صلاحیت کئی صفات کی حامل ہے۔ ان کے افسانوں میں نفسیاتی الجھاؤ، سماجی مسائل، اقدار کی بیخ کنی جیسے موضوعات کو جگہ ملی ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانے کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کے لوگوں کی غربت، سادہ دلی، شرافت، کے علاوہ یہاں کے حسن و فطرت کو اپنے افسانوں میں سمونے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ عبدالقادر سروری پشکر ناتھ کے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پشکر ناتھ کے افسانوں کا محرک کشمیر کی زندگی اور اس کی حسین فضائیں ہیں، لیکن فطرت کے ان حسین مناظر کے درمیان، عوام کی غربت اور ان کا افلاس ایک تضاد ہے، جس کے نقوش وہ بڑی جانکاری کے ساتھ ابھارتے ہیں۔"

(عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو، جے اینڈ کے اکیڈمی آرٹ لکچر اینڈ لینگویجز سرینگر، 1984، ص 188)

"اندھیرے اُجالے، ڈل کے باسی، عشق کا چاند اندھیرا اور کانچ کی دنیا" پشکر ناتھ کے افسانوی مجموعے ہیں۔ انھوں نے ان چار افسانوی مجموعوں کی بدولت جموں و کشمیر میں اپنا نام قائم کرنے میں جس محنت اور لگن سے کام کیا ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا ہے۔

برج پریمی جموں و کشمیر میں اردو افسانے کا ایک اہم نام ہے۔ ان کا پورا نام برج کشن ایمہ تھا، تاہم ادبی حلقوں میں وہ برج پریمی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ وہ حبہ کدل سرینگر میں 1935 کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے 1976 میں کشمیر سے پی ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ پی ایچ ڈی میں ان کا موضوع 'سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے' تھا۔ 1977 میں انھوں نے کشمیر یونیورسٹی میں ریڈر کے بہ طور کام کرنا شروع کیا اور ہمیشہ اسی پیشے سے وابستہ رہے۔

برج پریمی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا ہے۔ 1949 میں ان کا پہلا افسانہ 'امر جیوتی' شائع ہوا۔ برج پریمی نے فنی، فکری، موضوعاتی اور اسلوبیاتی اعتبار سے کافی اچھے افسانے لکھے ہیں۔ ایک پھول ایک کلی، اجڑی بہاروں کے اجڑے پھول، یہ گیت یا مزار، قبا کے ایک طرف اور سپنوں کی شام برج پریمی کے قابل ذکر افسانے ہیں۔ ان کے افسانے ملک کے نمائندہ رسائل جن میں دیش، شعلہ اور شبنم، سب رنگ اور ہمارا ادب وغیرہ شامل ہیں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ برج پریمی افسانہ نگاری کے علاوہ تنقید و تحقیق میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ انھوں نے اس ضمن میں کئی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات متنوع ہیں۔ ان میں زیادہ تر موضوعات کشمیر سے متعلق ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں کرشن چندر کا رنگ نمایاں ہے۔ جوں جوں ان کا فن پروان چڑھتا گیا اسی قدر ان کے افسانوں میں بھی باقی دوسرے افسانہ نگاروں خصوصاً سعادت حسن منٹو کا رنگ دکھائی دینے لگا۔ برج پریمی کے افسانوں کی سب سے اہم اور منفرد شان ان کی خود کلامی میں مضمر ہے۔ ان کے افسانوں میں یہ خصوصیت ایک انوکھی طرح کو پیدا کر کے قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔ برج پریمی کے افسانوں میں خود کلامی کے وصف کے اظہار کے تعلق سے کشمیری لال ذاکر لکھتے ہیں:

ایک بات جو ان سبھی کہانیوں میں مشترک ہے، وہ یہ ہے کہ برج پریمی کا کہانی لکھنے کا انداز خود کلامی کا انداز ہے، یعنی سولیلوکی کا انداز۔ اس کا ہر کردار خود کلامی کر رہا ہے اور جب وہ کسی دوسرے شخص کے بارے میں بولتا ہے یا اپنے سماج اور ماحول کا ذکر کرتا ہے، تو لگتا ہے کہ وہ اپنے آپ ہی سے گفتگو کر رہا ہے۔ خود کلامی کا یہ عمل بڑا ہی پُر عذاب ہوتا ہے۔ کیونکہ بات کرنے والا جب بات کرتا ہے تو اپنی روح میں لگے ہوئے پرانے اور نئے زخموں کو چھیڑتا ہے اور جس کسک کا احساس اسے خود ہوتا ہے وہی کسک دھیرے دھیرے پڑھنے والوں تک بھی پہنچ جاتی ہے۔"

(برج پریمی، سپنوں کی شام، دیپ پبلی کیشنز نصیب نگر پمپوش کالونی جانی پورہ جموں، 1995، ص 8)

ڈاکٹر برج پریمی کی ادبی مصروفیات چوں کہ کافی تھیں اور اس وجہ سے انھوں نے صرف ایک افسانوی مجموعہ پیش کیا ہے، جو 'سپنوں کی شام' کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ ان کی دوسری تصانیف میں جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما' حرف جستجو، منٹو کتھا، جلوۂ سب رنگ، چند تحریریں، ریاست جموں و کشمیر میں اردو فکشن اور کشمیر کے مضامین وغیرہ اہمیت رکھتی ہیں۔

اس طرح اگر دیکھا جائے تو وادیِ کشمیر میں اردو افسانہ کی تاریخ اور اس کے ارتقا میں غیر مسلم تخلیق کاروں کا نہ صرف اہم رول رہا ہے بلکہ عصر حاضر میں بھی یہاں کے افسانوی ادب کے افق پر غیر مسلم افسانہ نگاروں کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے یہاں فکشن لکھنے کا جو شوق اور جو ذوق پایا جاتا ہے، وہ دراصل ان کی اردو زبان و ادب کے ساتھ ایک والہانہ محبت کا اظہار ہے۔

■

Zahid Yaseen Shah
S/o Pir, Mohd Yaseen Shah
R/O: Rakh Pahoo
District: Pulwama
Tehsil: Kakapora- 192304
Mob.: 7006703805

امتیاز وحید

وحید العصر گونو جھا

کا سوانحی خاکہ

(سینہ بہ سینہ روایتیں)

ناموران متھلا میں گونو جھا کا نامِ نامی سرفہرست ہے۔ اسے ریاست ترہت، موجودہ متھلا میں ذہانت، علمیت اور دانشوری کا استعارہ خیال کیا جاتا ہے۔ گونو جھا کی زندگی اور اس کی شخصیت کا حال کسی تذکرے میں تفصیلی طور پر نہیں ملتا، نہ اس کے اقوال کا کوئی تحریری ثبوت ہی دستیاب ہے۔ یہ متھلا کے ملک الشعرا ودیاپتی سے پہلے کا آدمی ہے، اس وقت تحریری طور پر چیزوں کو محفوظ رکھنے کا چلن بھی عام نہیں تھا لہٰذا وہ تحریری طور پر کہیں محفوظ نہیں رہ سکا۔ البتہ تاریخی حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ 13 ویں صدی عیسوی میں متھلا کے بادشاہ ہری سنگھ کا ہم عصر تھا اور ایک ذہین ترین انسان تھا۔ اس کی زندگی کی بیشتر کڑیاں اب ناپید ہو چکی ہیں۔ اس سے منسوب کہاوتوں، کہانیوں اور رسائل کے بعض تراشوں میں جو چیزیں ملتی ہیں، ان سے کماحقہ گونو جھا کی کوئی مستند شبیہ یا سوانح ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ بکھرے شخصی مواد کے استناد کا مسئلہ اس پر مستزاد ہے کیونکہ یہ وہ معلومات ہیں، جو متھلا لوک ادب اور کلچر میں سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں۔ مرورِ ایام کے ساتھ ان سے منسوب واقعات میں لوگوں نے اپنی پسند و ناپسند کا اضافہ بھی کر دیا ہے، جس سے گونو جھا سے منسوب متعلقات کی نشاندہی اب ممکن نہیں رہی۔ البتہ اپنی کہانیوں کی طرح گونو جھا کی شخصیت بھی بڑی دلچسپ، پراسرار اور پرکشش معلوم ہوتی ہے۔ تاریخی عدم استناد و توثیق کے باوجود معروف ناٹک کار بیکنٹھ جھا نے اپنی کتاب میں مختلف انداز میں گونو جھا کا تذکرہ کیا ہے اور انھیں رجسٹر اندراج کے حوالے سے 'سون کریا کرمیے خاندان کا برہمن' بتایا ہے، جن پر بھگوتی کا خاص فیضان تھا۔ بنگالی مصنف چندر گپت موریہ اور شوتو رکھت نے اپنی کتاب 'میتھلار گوپال بھند گونو جھا' میں گونو جھا سے متعلق کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے بموجب بیربل نے گونو جھا سے گہرے اثرات قبول کیے تھے۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ 1326 میں گونو جھا کو 'مہامہو پادھیا' کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ نارائن جھا نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ودیاپتی اور گونو جھا متھلا دربار کے رتن مانے جاتے تھے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ راجا شیو سنگھ گونو جھا سے متاثر تھے۔

گونو جھا دراصل بہار کی زندگی کا سرنامہ ہیں۔ بہار کی زندگی کی وہ اہم خصوصیت، جو اس کو دوسرے خطے سے ممیّز کرتی ہے، اہالیانِ بہار کی زندگی کی سادگی بلکہ معصومیت کے اظہار تک پہنچی ہوئی، انتہا درجے کی سادگی ہے۔ دوسری خصوصیت اخلاص ہے، ایسا اخلاص جس میں دوسری کسی بھی چیز کی آمیزش نہ ہو اور معاشرتی طرزِ اظہار کا برجستہ بیان، جو بظاہر تو معمولی لگے لیکن اس کے باطن میں علم و شعور داخل ہو۔ گونو جھا ان خصوصیات کی تجسیم ہے، جو اپنی ذہانت، حاضر جوابی اور دیگر خصوصیات کے سبب طلسماتی کردار کا حامل ایک اہم اور دلچسپ شخصیت خیال کیا جاتا ہے اور متھلا لوک کہانیوں، کتھاؤں اور ثقافتی تناظر میں ہر جگہ لطیف پیرایے میں یاد کیا جاتا ہے۔

گونو جھا دربھنگہ ضلع کے 'بھروارا' گاؤں میں پیدا ہوئے۔ والد مذہبی طبیعت کے مالک تھے، لہٰذا اس کی پہلی اولاد گونو جھا نے بھی والد کی طرح مذہبی طبیعت پائی۔ گونو جھا کالی دیوی کے بھکت تھے۔ مانا جاتا ہے کہ انھیں کالی ماں کا خصوصی فیضان حاصل تھا، جس کے سبب انھیں فہم و فراست کی دولت ہاتھ آئی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ شر کے نہیں بلکہ خیر کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا کردار برائی اور شر کو اس کے انجام تک پہنچائے بغیر دم نہیں لیتا۔ روایت ہے کہ بھگوتی نے انھیں وَردان دیا تھا کہ وہ کبھی مفتوح نہیں ہوگا۔ اس کی شکست اس کی موت کا سبب ہوگی۔ لہٰذا گونو جھا سے منسوب کہانیوں میں وہ ہمیشہ ایک فاتح کردار کے روپ میں ہی سامنے آتے ہیں۔ گویا اس کا کردار فتح مندی کا اعلامیہ ہے۔ شکست چونکہ اس کی موت کی نوید تھی لہٰذا اس سے بچنے کی تدابیر میں گونو جھا نے عقل اور منطق کی انتہا سے کام لیا۔ لوک روایت کے مطابق اس نے بھگوان کو بھی جُل دینے میں کامیابی پائی۔ ان سے میتھلی زبان میں ظریفانہ اور کئی مزے دار لوک کہانیاں منسوب ہیں، جن میں انھیں ایک چالاک، ہوشیار اور عقلمند آدمی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اپنی انھی گوناگوں خوبیوں کے سبب انھیں بہار کا بیربل بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے زمین دار، اہلِ ثروت اور مہاراجاؤں کے دربار سے بھی وابستہ رہے۔ درباریوں کی تملق پرستی کے سبب عام رعایا پر زمین داروں کی عدم توجہی اور ظلم و جبر کے خلاف بھی وہ برسرپیکار دیکھے گئے اور عوام کو درباریوں کے چنگل سے نجات دلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے سادھوؤں کے بھیس میں موجود مفاد پرستوں اور منافقین کو بھی آڑے ہاتھوں لیا اور ان کی اصلیت کو بھی بے نقاب کیا۔ یہ سارا کام انھوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت کے سہارے انجام دیا۔ بہار میں گونو جھا کی دلچسپ کہانیاں اسی طرح زبان زد عام و خاص ہیں، جس طرح متھلا-کوکل ودیاپتی کے شیریں نغمے متھلا کی فضاؤں میں گونجتے ہیں۔ گونو جھا کی کہانیاں لوگوں میں اس قدر مقبول ہیں کہ اب یہ کتھائیں نہ صرف ہمارے لوک ادب کا حصہ خیال کی جاتی ہیں بلکہ کلاسیک کا درجہ رکھتی ہیں۔

تاریخی طور پر گونو جھا سے مماثل پندرہویں صدی کے خطہ آندھرا پردیش میں گرلاپتی رام کرشنا، معروف بہ تینالی رام جیسا ذہین و فطین کردار بھی پایا جاتا ہے، جو اپنی عقلیت پسندی کے سبب مشہور ہے۔ یہ ایک تیلگو شاعر، اسکالر، مفکر اور سری کرشنا دیواریا (1509 تا 1529) کے دربار میں خصوصی مشیر تھا۔ اس کا تعلق موجودہ آندھرا پردیش کے ٹینالی گاؤں سے تھا۔ اس کا نام اس کی دانشمندانہ لوک کہانیوں کے لیے جانا جاتا ہے۔ وہ اشٹا دیگا جایا وجے نگر شہنشاہ کرشنا دیواریا کے آٹھ درباری شاعروں میں سے ایک تھا اور وزیر بھی تھا۔ اسی زمرے میں بنگال کے گوپال بھریا گوپال بھنڈ کا نام بھی لیا جاتا ہے، جو قرونِ وسطی کے بنگال میں ایک عدالتی جیٹر تھا اور اٹھارہویں صدی میں ندیا کے بادشاہ راجہ کرشن چندر (1710-1783) کے دربار سے وابستہ تھا۔ گوپال خلقِ خدا میں مسرت کی افزودگی کا سرچشمہ

تھا۔ دوسروں کو ہنسی مذاق اور ظرافت سے خوشی فراہم کرنا اس کی فطرت ثانیہ تھی۔ بادشاہ گوپال کو اپنے دربار کا نورتن سمجھتا تھا۔ اس کا مجسمہ آج بھی کرشن چندر کے محل اور کرشن نگر قصبے کے گھورن میں دیکھا جا سکتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ گوپال کے پاس بڑی گہری ذہانت تھی۔ اس کے کارناموں پر مبنی کہانیاں مغربی بنگال اور بنگلہ دیش میں آج تک بیان کی جاتی ہیں۔ گونوجھا کی طرح مزاح اور غایت ذہانت اس کی بھی بنیادی شناخت ہے۔ حاضر جوابی میں اس کے ذہنی اختراع اور ہوشیاری کا عالم دیدنی تھا۔ بنگلہ ادب میں اس کا موازنہ بیربل، ٹینالی رمن، گونوجھا اور نصرالدین کی کہانیوں سے کیا جاتا ہے۔

گونوجھا کے والد اس کے بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ اس کی پرورش و پرداخت اس کی ماں کے ہاتھوں ہوئی۔ اس کی تعلیم کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس سے منسوب کوئی تحریری سرمایہ بھی موجود نہیں۔ البتہ یہ بات تحریری صورت میں موجود ہے کہ گونوجھا متھلا کے ملٹری اسکالر تھے اور اسی حیثیت سے دربار سے وابستہ بھی تھے۔ بعض روایتوں میں انھیں ایک ظریف درباری شاعر کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی بذلہ سنج طبیعت کو دیکھ کر البتہ اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ دربار سے وابستہ وہ ایک حیوانِ ظریف تھا لیکن چونکہ اس سے منسوب کتھا کہانیوں اور کہاوتوں میں اس کے شعری ذوق یا اس کے گوی ہونے کا کہیں کوئی اشارہ نہیں ملتا لہٰذا اسے شاعر کی حیثیت سے دیکھنا قرینِ مصلحت معلوم نہیں ہوتا۔ دربار سے اس کی وابستگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم از کم اس کی واجب تعلیم ضرور رہی ہوگی۔ محض ذہانت کی بنیاد پر دربارِ وقت تک اس کی رسائی اور وابستگی خلافِ عقل بات معلوم ہوتی ہے۔ تاہم یہ محض قیاس آرائیاں ہیں۔ گونوجھا کے ایک چھوٹے بھائی بھونو کا بھی ذکر ملتا ہے۔ والد کے انتقال کے بعد یہ دونوں اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتے تھے۔ ماں گو کہ گونوجھا کی ہوشیاری سے خوش اور مطمئن تھی کہ زندگی کسی طرح گزار لے گا لیکن اسے اپنے چھوٹے بیٹے کی فکر دامن گیر رہتی تھی کہ یہ سیدھا سادا میرے بعد کیسے رہ پائے گا۔ گونو ماں کو تسلی دیتے کہ میرے جیتے جی اسے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ گونو سے منسوب واقعات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ذہانت نے اس کے اردگرد حاسدین کی ایک بھیڑ کھڑی کر دی تھی۔ گرد و نواح کے قصبات سے عوام اپنے مختلف مسائل اور سماجی معاملات میں گونوجھا سے صلاح و مشورے کے لیے بھی آتے تھے، جنھیں وہ بڑی آسانی سے حل کر دیتا تھا۔ اس کی ذہانت نے رفتہ رفتہ اس کی شہرت کا سامان کیا اور پھر حاسدین بھی پیدا کیے۔ اس کی ماں کے انتقال پر اس کے بدخواہوں نے اسے گھیرنا شروع کیا کہ قرب و جوار کے گاؤں میں دور دور تک تمھارا آنا جانا ہے، لوگ تمھیں جانتے ہیں۔ ماں کے انتقال پر تمھیں کم از کم پچیس گاؤں کو شیرینی کی دعوت ضرور دینی چاہیے۔ اصرار کچھ اتنا شدید تھا کہ گونوجھا کو ان کی بات مانتے ہی بنی۔ دعوت کی خبر گاؤں اور آس پڑوس کے مضافات میں مشتہر کر دی گئی۔ گونوجھا نے بھی دن تاریخ طے کر دی۔ تاہم اس دعوتِ عام کی اس نے کوئی تیاری نہ کی اور مطمئن بیٹھا رہا۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مقرر وقت پر مہمانوں کا ہجوم اکٹھا ہوا۔ گونوجھا نے متھلا کی روایت کے مطابق کھانے کے لیے مہمانوں کے سامنے پتے رکھ دیے اور ان میں گنے کے چار چار ٹکڑے پیش کر دیے۔ بڑے بزرگوں کی سرزنش پر گونوجھا نے نرم لہجے میں کہا کہ میں نے کیا غلط کیا ہے۔ گنا تمام مٹھائیوں کی جڑ ہوتا ہے۔ کیا گنے کے بغیر شیرینی کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ آپ سب کا منہ میٹھا ہو جائے گا اور میری ماں کی روح کو شانتی بھی مل جائے گی۔ کیا یہ میٹھا نہیں ہے؟ بزرگ نرم پڑ گئے۔ گونوجھا کی بات درست تھی۔ گونوجھا نے اپنی بساط بھر ضیافت کا اہتمام یقیناً کیا تھا۔ اس نے اس طرح نہ صرف بعد از مرگ اپنی ماں کی روح کی تسکین کا سامان کیا بلکہ اپنے بدخواہوں کو بھی سبق سکھایا۔ یہ واقعہ گونوجھا کے اس سماجی شعور کا غماز ہے، جس سے ہندوستانی معاشرہ جوجھ رہا ہے کہ شرادھ کے نام پر لوگ برباد ہو جاتے ہیں اور ان پر قرض لے کر ضیافت کرنے کا بوجھ ڈالا جاتا ہے۔

گونوجھا کی کہانیاں اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نگاہ کے فروغ کا ذریعہ ہیں۔ صدر عالم گوہر نے 'گونوجھا کے قصے اور دوسری کہانیاں' کے پیش لفظ میں گونوجھا حتیٰ کہ بیربل جیسی ذہین و فطین شخصیت کو سماج کا مسخرہ بتایا ہے، جو حد درجہ تکلیف دہ ہے۔ کیا مسخروں کو اکبر کے نورتنوں میں جگہ دی جا سکتی ہے؟ ملا دو پیازہ سے بیربل کی نوک جھونک مذاقِ لطیف، ذہانت اور غایت حسنِ مزاح کی علامت نہیں؟ اکبر جیسے عالی دماغ شہنشاہ کے دربار میں رکیک اور اوچھی بذلہ سنجیوں کی گنجائش ہے؟ گزرتے وقت کے ساتھ بیربل جیسے ذہین اور ان سے منسوب خردمندانہ واقعات میں عوامی دلچسپیوں کی چیزیں بھی شامل ہوتی گئیں اور وقت کے ساتھ یہ کچھ سے کچھ ہو گئیں۔ ان واقعات سے پھوٹنے والی ظرافت اور ان میں در آنے والی عوامی رکاکت کے سبب بیربل جیسے ذہین و فطین شخص کے لیے بھی ہمارا ذہن کوئی باوقار سیاق تلاش کرنے سے قاصر نظر آتا ہے۔ بعینہٖ یہی صورتِ حال گونوجھا کے سلسلے میں بھی پیش آئی۔ کچی پکی روایات کی گرد میں اس کی شخصیت کا وقار مجروح ہوا، جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

گونوجھا سے منسوب درجنوں واقعات، کہانیوں اور کہاوتوں میں اسے ایک خداداد صلاحیت کے مالک فرد کی حیثیت سے دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی ذہانت کے سبب مرجعِ خلائق تھا اور اس میں عوام کے مسائل کو بہ آسانی حل کرنے کی صلاحیت بھی موجود تھی۔ وہ سماجی مسائل کے تئیں بالعموم جس طرح کا رویہ اپناتا ہے، اس سے اس کی ذہانت کا پتا چلتا ہے۔ اس میں حالات اور مسائل سے جوجھنے کی قوت دکھائی دیتی ہے۔ اس کی خداداد صلاحیت کا سرچشمہ میتھلی روایت کے بموجب بھگوتی کا وردان ہے، جو گونوجھا کو ملا تھا۔ اسی قوتِ باطن نے اسے فہم و شعور کی دولت ودیعت کی تھی اور اسے غیر معمولی طور پر حاضر جواب بھی بنا دیا تھا۔ اس کی حاضر جوابی کے قصے بھی متھلا میں خوب مشہور ہیں، جن میں اس کی ذہانت کی چمک پائی جاتی ہے۔

گونوجھا سے منسوب بہت ساری کہانیوں میں وہ شریکِ حیات کے ساتھ باتیں کرتا نظر آتا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ گونوجھا کی شادی ہوئی تھی۔ خانگی زندگی میں بھی ہم اسے ایک کامیاب، ہوش مند اور وفاشعار شوہر کی حیثیت سے پاتے ہیں۔ اس کی ایک بیٹی کا ذکر بھی ملتا ہے، جو جلد ہی فوت ہو گئی تھی۔ البتہ اس کے بھائی بھونو کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس طرح اس کا نسلی سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا۔ اس کے خاندان کے کسی بھی فرد یا وارثین کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس کے باوصف گاؤں 'بھروارا' کے لوگ گونوجھا سے اپنی نسبت پر فخر محسوس کرتے ہیں اور اور اپنے اجداد میں شمار کرتے ہیں۔ گونوجھا کا انتقال چمر چھونچھ میں ہوا۔ گونوجھا کو گزرے صدیاں بیت گئیں تاہم وہ آج بھی اپنی ذہانت اور شر کے خلاف اپنی حکمت علمی بنانے اور حق کی پاسبانی کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔ اپنی خوبیوں کے سبب وہ آج بھی متھلا باسیوں کے دل میں بستا ہے۔ گونوجھا اور متھلا اب ایک ہی سکے کے دو نام ہیں۔ گونوجھا کے ذکر کے بغیر متھلا کا تمدنی تصور روشن نہیں ہو پاتا۔ گونوجھا متھلا کی سماجی زندگی میں کچھ یوں شیر و شکر ہو گیا ہے کہ وہ بلاتفریق وہاں آباد سبھی طبقوں، ذات اور برادری میں یکساں اہمیت طور پر مقبول اور قابل قدر خیال کیا جاتا ہے۔ کیا ہندو کیا مسلم، سبھی اس کے قدر دان ہیں اور گونوجھا ان میں قدر مشترک کا درجہ رکھتا ہے۔ گونوجھا کی ہردلعزیز شخصیت کا یہ وہ روشن پہلو ہے، جو اسے قومی یکجہتی اور مشترکہ ثقافت کے سفیر کی حیثیت سے دیکھنے کی تحریک دیتا ہے۔ متھلا کی طویل تمدنی تاریخ میں گوناجھا کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔

■

Dr. Imteyaz Waheed
A-8, Calcutta University Teachers' Quarters
P1/7, CIT Scheme
VII-M, KANKURGACHIMANIKTALA
KOLKATA-700054 (W.B)

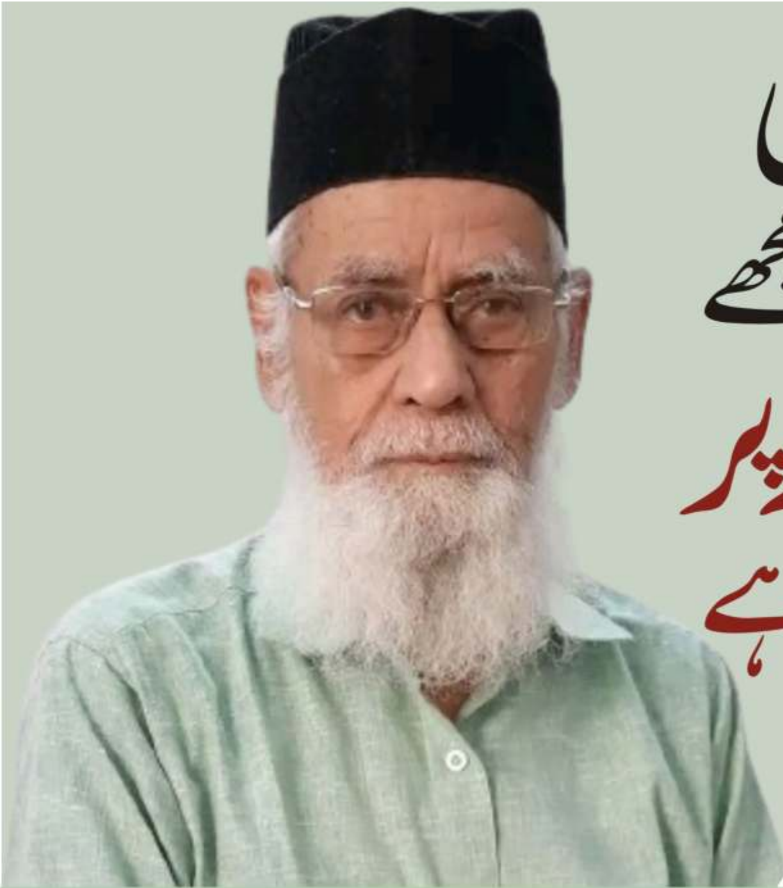

عبدالحی

ترجمہ نگاری کی سعادت مجھے وہبی طور پر حاصل رہی ہے

سید محمود احمد کریمی

سید محمود احمد کریمی 90 سال کے کہنہ مشق مترجم اور ادیب ہیں۔ آج ہمارے یہاں ایسی شخصیات خال خال ہی نظر آتی ہیں جنھیں بیک وقت فارسی، اردو، انگریزی اور عربی پر قدرت حاصل ہو۔ کریمی صاحب خاموشی سے کام کرنے پر یقین رکھتے ہیں اور ایک درجن سے زائد کتابوں کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرچکے ہیں اور اب بھی فعال ہیں۔ اقبال سے انھیں بہت زیادہ عقیدت ہے اور انگریزی میں اقبال پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اقبال کے درجنوں فارسی اور اردو اشعار انھیں اب بھی یاد ہیں۔ انھوں نے سورہ یٰسین اور قصیدہ بردہ کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ ایسے گمنام لوگوں کی جتنی پزیرائی ہونی چاہیے تھی اتنی ہوئی نہیں۔ سید محمود احمد کریمی جیسی نابغہ روزگار شخصیت سے حال ہی میں عبدالحی نے تفصیلی گفتگو کی ہے جس کے اقتباسات اردو دنیا کے قارئین کے لیے پیش کیے جارہے ہیں۔ (ادارہ)

عبدالحی: اپنی پیدائش اور خاندانی پس منظر پر روشنی ڈالیں؟

سید محمود احمد کریمی: میری پیدائش ضلع دربھنگہ کی مشہور بستی پیغمبر پور میں 26 فروری 1934 کو ایک زمیندار گھرانے میں ہوئی۔ دادیہال کی طرف سے میرا تعلق نواب سید سعادت علی خاں (سعادت پیغمبر پوری) سے ہے۔ نانیہال کی طرف سے میرا تعلق نواب لطف علی خاں سکندرہ (ضلع جموئی) سے ہے۔ نواب صدیق حسن خاں اور نواب قمرالحسن خاں میرے سگے ماموں تھے۔

ع ح: اپنی تعلیم وتربیت پر گفتگو کریں؟

س م ا ک: میری تعلیم وتربیت اپنے گھر پر ہوئی۔ میرے والد الحاج مولوی عزیز احمد صاحب نے اردو اور فارسی کی تعلیم دی۔ میرے بڑے بھائی جناب نیاز احمد کریمی (نیاز پیغمبر پوری) نے انگریزی زبان بڑے چاؤ سے پڑھایا۔ موصوف نے انگریزی ادب کی طرف میرے ذہن کو راغب کیا۔ بعدہٗ میرا داخلہ دربھنگہ میں مارواڑی ہائی اسکول میں کرادیا گیا۔ وہاں سے میں نے 1953 میں میٹریکولیشن سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور سی ایم کالج دربھنگہ سے آئی۔ اے 1955 میں پاس کرکے بی اے آنرز میں داخلہ لیا۔ 1958 میں بی اے آنرز (اردو) کا امتحان پاس کیا۔ گھریلو الجھنوں کے باعث ایم اے میں داخلہ نہ ہوسکا۔ گھر پر زمینداری کا کام سنبھالنا پڑا۔ سوئے اتفاق کہ میرے بڑے بھائی نیاز صاحب کا اور میری والدہ کا حج کے بعد ستمبر 1955 میں مکہ مکرمہ میں انتقال ہوگیا۔ والد صاحب تنہا واپس آئے۔ اب میں عملی زندگی میں داخل ہوچکا تھا۔ شادی ہوگئی اور میں صاحب اولاد بھی ہوگیا۔ اس طرح میری زندگی مکمل طور پر بدل گئی۔ تاہم علم کے حصول کا شوق علیٰ حالہ قائم رہا۔ موقع ملنے پر 1970 میں .B.L کا امتحان پرائیوٹ سے دے کر وکالت کی ڈگری حاصل کی۔ پھر 1983 میں بہار یونیورسٹی مظفر پور سے اردو زبان میں .M.A پاس کیا۔ اس طرح پرائیوٹ سے اجازت لے کر ایل این ایم یو دربھنگہ سے انگلش میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ یہی میرا تعلیمی کیریئر رہا ہے۔

ع ح: آپ کا تعلق زمیندار گھرانے سے رہا ہے۔ نواب سعادت علی خاں آپ کے جدامجد تھے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کی زندگی اور شاعری پر اظہار خیال کریں۔ یہ بھی بتائیں کہ کیا ان کا دیوان دستیاب ہے؟

س م ا ک: جی ہاں! آپ نے صحیح فرمایا۔ میرا تعلق زمیندار گھرانے سے رہا ہے۔ نواب سید سعادت علی خاں سعادت پیغمبر پوری میرے جدامجد تھے۔ وہ ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کا دیوان سعادت شہرۂ آفاق ہے۔ وہ حضرت داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ داغ دہلوی نے دیوان سعادت کی تاریخ اشاعت تحریر کی جو یوں ہے۔

کہا مصرع تاریخ دیکھو داغ نے کیسا
مبارک انجمن افروز دیوان سعادت ہے

1323ھ

نواب سید سعادت علی خاں کا دیوان سعادت اب تک

تحقیق کے مطابق اولیت کا تاج اپنے سر رکھتا ہے۔نواب صاحب پہلے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کی زندگی ماشاء اللہ بہت بہتر گزری۔ وہ نہایت خوبصورت خوش پوشاک اور پرکشش شخصیت کے حامل تھے۔وہ نرم خو اور سادہ لوح انسان تھے۔ان کے دربار میں تین درباری شاعر تھے جن کے نام جناب حفیظ جونپوری، جناب نسیم بلسوی، جناب خیر رحمانی تھے۔

دیوان سعادت بحیثیت وارث میرے پاس بحفاظت موجود ہے، نیز آپ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ ایک سو سترہ سال بعد میں نے دیوان سعادت کا دوسرا نیا ایڈیشن طبع کرانے کا انتظام کرلیا ہے۔

ع ح: آپ پیشہ وکالت سے وابستہ رہے لیکن کچھ دنوں بعد اسے خیر باد کہہ دیا پھر تدریس کی جانب آئے لیکن یہاں بھی زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے۔آخر ایسا کیوں؟ آپ کا ذریعہ معاش کیا رہا؟

س م ا ک: وکالت کا پیشہ میں نے پیشہ ورانہ خیال سے نہیں کیا، بلکہ مصروفیت کے خیال سے کیا تھا۔تقریباً دو سال تک اس پیشے سے وابستہ رہا۔اس دوران مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ پیشہ میرے لیے موزوں نہیں، علاوہ ازیں مذہبی نقطۂ نگاہ سے بھی وکالت کا پیشہ میرے لیے نامناسب تھا، اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا اور تدریسی میدان میں قدم رکھا۔

ایل این ایم یو، دربھنگہ کے Schedule Caste Pre Examinaiton Centre میں بحیثیت لکچرر 1987 سے 1997 دس سال تک اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ بعدۂ ایک پرائیوٹ اسکول روز پبلک اسکول دربھنگہ میں جوائن کیا۔ یہاں اس اسکول میں PGT یعنی Post Graduate Trainded Teacher کی حیثیت سے بحال ہوا۔کلاس IX, X, XI, XII میں اردو اور انگریزی 1997 سے 2015 تک اپنے تدریسی فرائض کو بحسن و خوبی انجام دیتا رہا۔اس طرح میں نے انیس سالوں تک اسکول میں تدریسی فرائض انجام دیا۔ اسکول چھوڑنے کا خیال نہیں تھا لیکن میری اہلیہ بہت زیادہ بیمار ہوگئیں اس لیے ان کی علالت کے باعث مجبوراً خود سے سبکدوشی کا فیصلہ کرنا پڑا۔آخر کار اہلیہ دہلی میں بعارضہ بلڈ شوگر اور بلڈ پریشر 2017 میں انتقال کر گئیں۔

زمینداری کے خاتمے کے بعد کاشتکاری ہی میرا ذریعہ معاش آج تک ہے۔علاوہ ازیں میرے تین لڑکے ہیں جو سب انجینئر ہیں اور ملازمت میں ہیں۔ ماشاء اللہ وہ سب اپنی اپنی ذمے داری نبھا رہے ہیں۔

ع ح: ترجمے کی جانب کس طرح آئے؟ انگریزی زبان پر اتنی اچھی گرفت کس طرح ہوئی جب کہ اردو والے انگریزی زبان سے دور رہتے ہیں؟

س م ا ک: حقیقت یہ ہے کہ بچپن سے مجھے علم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔اللہ کے فضل سے مجھے اپنے گھر میں دو بہت ہی شفیق استاد مل گئے۔ ایک میرے والد الحاج مولوی عزیز احمد صاحب اور دوسرے سگے بڑے بھائی جناب نیاز احمد کریمی، بی اے، پٹنہ کالج پٹنہ، المتخلص نیاز پیغمبر پوری۔

والد صاحب سے اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی اور بڑے بھائی جان نے انگریزی بڑی محنت کے ساتھ پڑھائی۔ انھوں نے انگریزی زبان سے رغبت دلائی۔ اس طرح دونوں زبانوں سے بلکہ تینوں زبانوں سے میرا گہرا تعلق پیدا ہوگیا۔ مجھے یاد ہے کہ 1958 میں بی۔اے

> **ترجمہ نگاری ایک اہم اور مشکل ترین کام ہے۔ لیکن اگر ترجمہ نگار کو دو زبانوں پر کاملاً قدرت حاصل ہو تو وہ اس کو بخوبی انجام دے سکتا ہے۔**

آنرز اردو کا امتحان پاس کر کے میں نے انگریزی میں ایک مضمون لکھا جس کا نام Iqbal and his Mission ہے۔وہ مضمون میرے پاس محفوظ رہا۔اس کے بعد میں نے علامہ اقبال کے شکوہ کا ترجمہ کیا۔اس کے بعد میں نے محسن رضا رضوی کی بیاض 'فن ہمارا' کا مکمل ترجمہ انگریزی میں کیا۔اس طرح ترجمے کا شوق پورا ہوتا رہا۔ بعدۂ مختلف شعرا کی غزلوں اور نظموں کا ترجمہ کرتا رہا جو میرے پاس موجود ہے۔

اردو داں حضرات انگریزی زبان سے اس لیے محترز رہتے ہیں کہ انھوں نے انگریزی زبان باقاعدہ طور پر محنت اور شوق سے نہیں پڑھا، ان کی بنیادی تعلیم کمزور رہی۔علمی استعداد خام رہی۔ اس وجہ سے ان لوگوں کو انگریزی زبان سے احتراز ہے۔وہ لوگ ہندی زبان سے آشنا ہوئے اور ہندی اخبار پڑھنا باعث فخر سمجھتے ہیں۔

ع ح: آپ نے اقبال پر انگریزی میں ایک کتاب تحریر کی ہے۔ برائے مہربانی کتاب کے حوالے سے گفتگو کریں؟

س م ا ک: اقبال کے متعلق جو کتاب میں نے انگریزی میں تحریر کی اس کی وجہ یہ ہوئی کہ 1958 میں میں نے سی ایم کالج دربھنگہ سے بی اے آنرز اردو میں کیا۔آنرز کلاس میں تین اردو کے پروفیسر تھے۔ جناب منظر صاحب، جناب قاسم حسین صاحب اور لطف الرحمٰن صاحب۔ یہ تینوں حضرات آنرز کلاس میں ہم لوگوں کو اردو پڑھاتے تھے۔ پروفیسر منظر صاحب علامہ اقبال کے خاص مداحوں میں تھے۔وہ ان کے متعلق بہت شوق سے ان کے کارنامے بتاتے تھے۔یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ مشہور لیڈر جناب شفیع داؤدی کی بہو محترمہ فاطمہ داؤدی ہم لوگوں کی کلاس ساتھی تھیں۔سن رسیدہ ہونے کے باوجود بی اے آنرز کا کلاس کیا کرتی تھیں۔بہرحال گریجویشن کے بعد تازہ دم ہونے کی وجہ سے جذبۂ شوق سے مملو ہو کر میں نے اقبال پر ایک طویل مضمون انگریزی میں تحریر کیا۔

اس مضمون میں میں نے ہندوستان کے مسلمانوں پر جو انگریزی کا غلبہ ہوا اور انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا اس کا اجمالی جائزہ لیا اور مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے مصلح یعنی ریفارمر کا کام تین حضرات نے کیا۔مولانا الطاف حسین حالی نے مسلمانوں کے عروج و زوال کی کہانی بیان کر کے افسوس کا اظہار کیا۔ جناب اکبرالہ آبادی نے طنز کے تیر برسائے لیکن علامہ اقبال نے ایک مناسب طرز عمل اختیار کیا۔ انگلستان میں رہ کر تمام اسلامی ممالک کی حالت کا جائزہ لے کر ہندوستانی مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگا کر ایک بیدار قوم کی حیثیت سے جینے کا درس دیا۔ یہ کام انھوں نے اپنی شاعری سے لیا۔ میں نے اقبال کے کلام سے ان کی انتھک کوششوں کا جائزہ لیا تھا۔

ع ح: اپنی ترجمہ نگاری پر روشنی ڈالیں۔کس طرح کی اور کتنی کتابوں کا آپ نے ترجمہ کیا ہے؟

س م ا ک: یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ترجمہ نگاری ایک اہم اور مشکل ترین کام ہے۔لیکن اگر ترجمہ نگار کو دو زبانوں پر کاملاً قدرت حاصل ہو تو وہ اس کو بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ اپنے ماقبل کے اندراجات میں میں نے عرض کیا ہے کہ شروع ہی سے وہبی طور پر یہ سعادت حاصل رہی ہے۔گریجویشن کے بعد ہی سے تراجم کی طرف مائل ہوا۔ پہلے تو متفرق غزلوں اور نظموں کا ترجمہ کرتا رہا پھر علامہ اقبال کے شکوہ کا ترجمہ کیا۔محسن رضا رضوی کی بیاض 'فن ہمارا' کا ترجمہ کیا۔اس کے بعد 2015 سے باقاعدہ ترجمے کا سلسلہ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے مجموعہ کلام نعت شریف افسانوی مجموعے کے ترجمے کے ساتھ شروع ہوگیا۔ اور اب تک 14 کتابوں کا ترجمہ کر

چکا ہوں۔ جن کی فہرست درج ذیل ہے:

1 عضویاتی غزلیں۔ مناظر عاشق ہرگانوی
1 Organwise Ghazlen - 2016
2 ہر سانس محمد پڑھتی ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی
2 Encomium to Holy Prophet - 2016
3 بکھری اکائیاں۔ مناظر عاشق ہرگانوی
3 Assortment of short stories - 2017
4 شبنمی لمس کے بعد۔ مناظر عاشق ہرگانوی
4 After Dewy Palpability - 2020
5 نبیوں میں تاج والے۔ مناظر عاشق ہرگانوی
5 Crowned chief of Prophet - 2021
6 نظمیچہ ثلاثہ۔ مناظر عاشق ہرگانوی
6 Triliterality - 2021

مذہبی کتابیں Religious Books

7 قصیدہ بردہ شریف
7 Qasida Burdah Sharif - 2018
8 سورہ یٰسین شریف
8 Surah Yaseen Sharif - 2018
9 قربتوں کی دھوپ۔ ڈاکٹر امام اعظم
9 Proximal Warmth - 2018
10 کچھ محفل خوباں کی۔ ڈاکٹر منصور خوشتر
10 Closet of Beauties - 2018
11 لمسوں کی خوشبو۔ انور آفاقی
11 Fragrance of Palpability - 2020
12 ایم۔ اے۔ ہرگانوی سے آشنائی
12 An acquaintance with M.A. Harganvi -2020
13 ناول شبنمی لمس کے بعد: منظوم تجزیہ
13 Novel Shabnami Lams ky baad Poetic vision , 2018
14 افسانچہ (حملہ کے وقت)
14 Afsancha "Hamla ke Waqt - 2020

Books Authored by Mahmood Ahmad Karimi

1 Iqbal and his Mission - 2020 (English)
2 Anwar Afaqi - A versatile Genius - 2023 (English)
3 زاویۂ نظر کی آگہی۔ اشاعت اول، 2021
4 زاویۂ نظر کی آگہی۔ اشاعت دوئم 2023
9 اردو سے انگریزی ترجمہ کرنا بہت مشکل کام ہے۔

آپ اپنی ترجمہ نگاری کے تجربات سے مستفید کریں؟

س م ا ک: جی ہاں! آپ کا کہنا بالکل صحیح ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ عموماً ترجمہ نگار اپنے تبحر علمی کی بنا پر ترجمہ کیا کرتے ہیں اور چند ایسے لوگ بھی ہیں جو وہبی صلاحیت سے اس کام کو انجام دیتے ہیں۔ لہٰذا ناچیز کے ساتھ یہی صورت حال ہے۔ مجھے اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ صلاحیت نے مدد کی اور میں ترجمہ نگاری کا کام انجام دیتا رہا۔ ترجمہ نگاری کا مسلسل اور باقاعدہ سلسلہ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی کتابوں سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے۔ 2015 کے دسمبر سے آج تک ترجمے کا کام کر رہا ہوں۔ اسی دوران حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کر لی۔

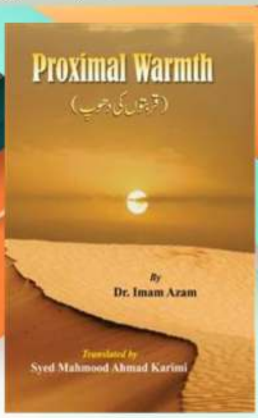

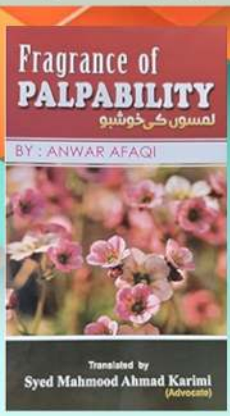

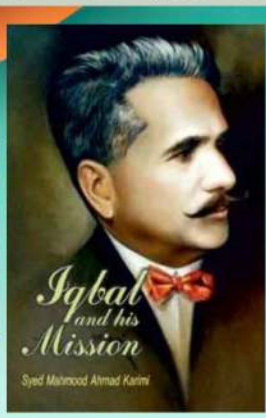

اس عمل میں مجھے بڑا حظ ملتا ہے اور ہر وقت دل و دماغ میں بہتر سے بہتر ترجمے کا خیال جاگزیں رہتا ہے۔ ابھی تک چودہ کتابوں کا ترجمہ میں نے کیا ہے اور تین کتابیں میری تصنیف کردہ ہیں۔

میری ترجمہ شدہ کتابوں میں مناظر عاشق ہرگانوی کی دو کتابوں کی خوب پذیرائی ہوئی جن میں عضویاتی غزلیں اور نعت شریف ہر سانس محمد پڑھتی ہے کا نام سرفہرست ہے۔ نعت شریف Encomium to Holy Prophet پر کولکاتا میں 2016 میں میر امن دہلوی ایوارڈ بھی ملا تھا۔ یہاں دربھنگہ میں بھی المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کی جانب سے اس نعت شریف کے ترجمے پر ایوارڈ ملا تھا۔ اہل قلم حضرات کی طرف سے بھی پذیرائی ہوئی اور انھوں نے اس سلسلے میں اپنے احساسات کا اپنی تحریروں میں اظہار کیا اس کو ڈاکٹر احسان صاحب نے کتابی شکل میں طبع کرایا جس کا نام سید محمود احمد کریمی: فکر و نظر کے آئینے میں ہے۔

ع ح: آج کے دور میں تراجم کی کتنی اہمیت ہے؟ کیا ترجمے اردو زبان و ادب کی ترقی میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں؟

س م ا ک: محترم جناب حقانی القاسمی صاحب اپنے تبصرہ میں لکھتے ہیں:

ترجمے کا عمل نہ ہوتا تو شاید تہذیبیں ایک دوسرے سے مانوس نہیں ہوتیں، اور مختلف قوموں، زبانوں کے مابین اجنبیت، بیگانگی کی دیوار ہمیشہ کھڑی رہتی، لیکن ترجمے سے بہت سے دریچے کھلے ہیں اور ایک دوسرے کے لسانی اور تخلیقی کلچر سے مانوس ہونے کا رجحان بڑھا ہے۔ اگر انگریزی سے اردو میں ترجمے نہ ہوئے ہوتے تو شاید ہم اہم علمی و ادبی اور ثقافتی سرمائے سے محروم ہو جاتے۔ ہماری زبان کی ثروت میں تراجم کے ذریعے بہت اضافہ ہوا ہے۔ اسی طرح اردو زبان سے انگریزی اور دوسری زبانوں میں جو ترجمے ہوئے ہیں، ان سے اردو زبان کی اہمیت، معنویت اور عظمت بڑھی ہے اور دوسری زبانوں میں ہمارے افکار و تصورات کا عمدہ تاثر قائم ہوا ہے۔ اردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے بہت سے شاہکار انگریزی اور دوسری زبانوں میں منتقل ہو گئے جس کی وجہ سے دوسری زبانوں کے تخلیق کاروں اور ناقدین کو بھی اس زبان سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ اردو سے انگریزی میں ترجمے کا سب سے پہلا کام شاید ایک انگریز Duncan Forbes نے میر امن کے 'باغ و بہار' کے ترجمے کے ذریعے کیا۔

مشاہیر اردو شعرا کے انگریزی میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ خاص طور پر غالب، میر، فیض، فراق وغیرہ کے کلام کے ترجمے کیے گئے ہیں۔ اس طرح فکشن کے ترجمے بھی انگریزی میں ہوتے رہے ہیں۔ خاص طور پر مراۃ العروس، 'آگ کا دریا'، 'ایک چادر میلی سی'، 'بازار حسن'، 'امراؤ جان ادا' کے علاوہ عصمت چغتائی، انتظار حسین، نیر مسعود اور دیگر فکشن نگاروں کے ناولوں اور افسانوں کے ترجمے ہوتے رہے ہیں اور ترجمہ نگار بھی ایسے لوگ ہیں جنھیں ادبی دنیا میں شہرت و مقبولیت حاصل ہے۔ اردو سے انگریزی میں ترجمہ نگاروں نے اپنی الگ شناخت قائم کی ہے۔ ان میں

خشونت سنگھ، قرۃ العین حیدر، شمس الرحمٰن فاروقی، ایم نعیم، رخشندہ جلیل، طاہر نقوی، مشرف عالم ذوقی، سریندر دیول، محمود احمد کریمی، معاذ بن بلال وغیرہ بہت اہم ہیں۔

محترم حقانی القاسمی صاحب کا یہ تبصرہ ایک ترجمے کی کتاب کے سلسلے میں ہے جس کا نام ہے The Nameplate۔ جس کو نصیب خان نے ترجمے سے نوازا ہے۔ مصنف کا نام طارق چھتاری ہے۔

محترم قاسمی صاحب تبصرتاً لکھتے ہیں ”آج یہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ عالمگیر مقبولیت اور گلوبل ریڈرشپ کے لیے انگریزی ترجمے کی اشد ضرورت ہے۔

ع ح: آپ نے انگریزی سے اردو میں ترجمے کیے ہیں؟ کون سی کتابوں کے؟

س م ا ک: چونکہ انگریزی سے اردو ترجمہ کے لیے کوئی آفر کہیں سے نہیں آیا، اس لیے اس طرح کا کام کرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ اگر آئے گا تو ان شاء اللہ کروں گا۔

ع ح: آپ کے ترجموں پر آپ کی کتنی پذیرائی ہوئی؟ کیا آپ کو انعام واکرام دیا گیا؟ تفصیل سے بتائیے؟

س م ا ک: درج ذیل کتابوں کی پذیرائی ہوئی:

1 عضویاتی غزلیں Organwise Ghazlen

2 نعت شریف: ہر سانس محمد پڑھتی ہے (Encomium to Holy Prophet

3 قصیدہ بردہ شریف (Qasida Burdah Sharif

4 سورہ یٰسین شریف Surah Yaseen Sharif

5 بیاض: قربتوں کی دھوپ Proximal Warmth

نعت شریف (1) Encomium to Holy Prophet

عضویاتی غزلیں (2) Organwise Ghazlen

کے سلسلہ میں کولکاتا میں 2016 مجھے محفل خوش رنگ کی طرف سے میر امن دہلوی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

پھر المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ دربھنگہ کی طرف سے شکیل الرحمٰن ایوارڈ نعت شریف کی کتاب کے سلسلے میں 29 مارچ 2018 کو دیا گیا۔ اس کے علاوہ اخباروں اور رسالوں میں اور دوسری کتابوں کے سلسلہ مضامین چھپتے رہے۔ بعدۂ ان سب کو کتابی صورت میں ڈاکٹر احسان عالم نے طبع کرایا اور وہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ اس کتاب کا نام سید محمود احمد کریمی: فکر ونظر کے آئینے میں ہے۔

ع ح: ترجموں کے ساتھ ساتھ آپ نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ اپنی تنقید پر اظہار خیال کریں؟

س م ا ک: ترجمہ نگاری کے ساتھ ساتھ میں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ تنقیدی مضامین کتابی صورت میں طبع ہوچکے ہیں۔ کتاب کا نام 'زاویۂ نظر کی آگہی' ہے۔ اس کتاب میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

شیخ مجدد کا نظریۂ توحید، اقبال کا تصور خودی، اقبال کی تخلیقی قوت، دوقومی نظریہ اور تقسیم ہند کا تخیل، ظفر کی شاعری زنداں میں، تنقید کے ضمن میں، تعلیم کی افادیت، 'حملہ کے وقت' تجزیہ، پیغمبر پور اسٹیٹ کی ادبی و ثقافتی خدمات، دردِ مسلم......، علامہ اقبال کا پیغام عمل، جنگ آزادی میں اردو صحافت کا کردار

حقیقت یہ ہے کہ تنقید کے بغیر تخلیق ادھوری ہے۔ اس لیے میں نے تنقید کا سہارا لیا۔ میرے تمام مضامین جن کی تعداد بارہ ہے تنقیدی نوعیت کے ہیں۔ آپ انہیں پڑھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ع ح: اردو زبان کے فروغ کے لیے آپ کے پاس کیا تجاویز ہیں؟

س م ا ک: اردو کے فروغ کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ مسلم قوم اپنی مادری زبان اردو اور اپنے کلچر کو ہر طرح قائم رکھنے کا عزم کرے۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم اسکولوں میں داخل کرانے سے قبل اپنے گھروں پر دینی تعلیم کے ساتھ اردو سے روشناس کرائیں۔ انھیں اردو پڑھائیں اور اس طرح وہ بچے اس قابل ہوجائیں کہ اردو پڑھ لکھ سکیں۔

دوسری صورت فروغ اردو کی یہ ہے کہ اردو اخبارات رسائل خرید کر پڑھیں اور دوسروں کو پڑھائیں۔ اردو کی بقا کے لیے اردو اداروں کو مالی تعاون فراہم کریں تاکہ اردو کی ترویج ہوسکے۔

تیسری صورت یہ ہے اپنی بستی میں اردو میڈیم اسکول قائم کریں۔ جہاں اردو کے ساتھ دینی تعلیم کا بھی انتظام ہو۔

سرکاری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کے لیے اردو ٹیچر کی بحالی ہو اور مسلم بچے وہاں اردو کی تعلیم بھی حاصل کریں۔ کالجوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام کیا جائے جہاں اردو پروفیسر موجود نہ ہوں۔

ع ح: اردو زبان سے نئی نسل کی بے رغبتی پر آپ کیا کہیں گے؟

س م ا ک: اردو زبان سے نئی نسل کی بے رغبتی اور اجتناب سے اردو زبان کو دھچکا لگنا فطری امر ہے۔ اس کی وجہ والدین کی اردو بیزاری ہے۔ اردو داں والدین اپنے بچوں کو بنیادی مذہبی تعلیم اور اردو زبان و ادب سے محروم کر رہے ہیں۔ چونکہ والدین خود اردو زبان سے رغبت نہیں رکھتے ہیں اس لیے ان کے بچے بھی اس نعمت کی لذت سے محروم ہیں، کیونکہ یہ بہت بڑا دینی اور اردو زبان سے برگشتگی اور ایک کلچر کا المیہ ہے۔ لہٰذا والدین کے لیے ضروری

> **اردو کے فروغ کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ مسلم قوم اپنی مادری زبان اردو اور اپنے کلچر کو ہر طرح قائم رکھنے کا عزم کرے۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم اسکولوں میں داخل کرانے سے قبل اپنے گھروں پر دینی تعلیم کے ساتھ اردو سے روشناس کرائیں۔ انھیں اردو پڑھائیں اور اس طرح وہ بچے اس قابل ہوجائیں کہ اردو پڑھ لکھ سکیں۔**

ہے کہ وہ اپنی نسل کو بے دینی اور اردو زبان و کلچر سے علیحدگی کو خدا کے لیے دور کریں اور اپنی غلط روی پر تاسف کرتے ہوئے راہ راست پر آجائیں۔ وما توفیق الا باللہ

ع ح: کیا اردو زبان سے تعلیم حاصل کر رہے طلبا اچھا کیریئر حاصل کرسکتے ہیں؟

س م ا ک: بے شک! اردو تعلیم کے ذریعے مسلم طلبا دنیوی علم کے حصول میں بہتر کارکردگی کا نمونہ یقیناً پیش کرسکتے ہیں۔ جس کی مثال عامر سبحانی آئی اے ایس ہیں جنھوں نے اردو کے ذریعے آئی اے ایس میں کامیابی حاصل کی اور بہتیری مثالیں ہیں کہ مدرسے کے فارغین نے مثالی ریکارڈ بنایا ہے۔

ع ح: اردو دنیا کے قارئین کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

س م ا ک: اردو کے قارئین کو میرا یہ پیغام ہے کہ اردو ادب کے فروغ، ترویج اور تبلیغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور اس زبان کی ترقی کے لیے دامے، درمے، قدمے اور سخنے ہر طرح کی مدد مہیا کریں اور کرائیں۔

ادیب اور شاعر حضرات سے گذارش ہے کہ وہ اردو ادب میں صحت مند تخلیقات سے اس شیریں زبان کو نکھاریں۔ غیر صحت مند اور فحش افسانوں اور افسانچوں سے اس زبان کو محفوظ رکھیں۔ معاشرے کو ایسے ادب سے روشناس کرائیں جس سے معاشرے کی اصلاح بھی ہو اور وہ ادب کی ترقی کا ضامن بھی ہو۔ تخلیق منثور یا منظوم دونوں میں بلند خیالی اور اخلاقی اقدار کی ضیاپاشی ہو۔

■

Dr. Abdul Hai
C M College
Darbhanga- 846004 (Bihar)
Mob.:9899572095

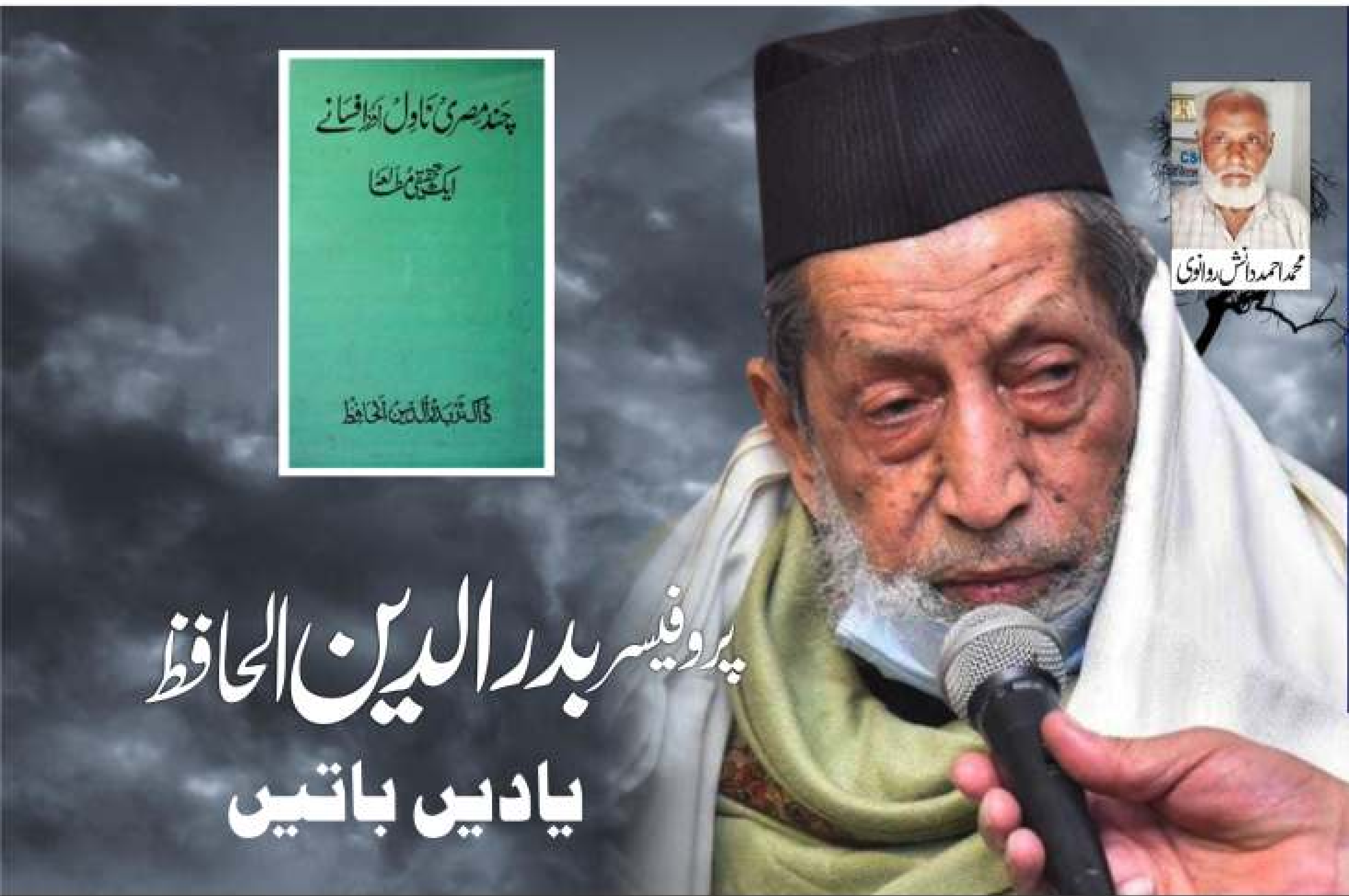

محمد احمد دانش روانوی

پروفیسر بدرالدین الحافظ

یادیں باتیں

موصوف کو 1985 میں اُس وقت کے صدر جمہوریہ ہند آنجہانی ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے بدست بہترین عربی اُستاد کے میڈل سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ بھی آپ کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے عوض متعدد اعزازات وانعامات دیے گئے۔

2 جنوری 2024 کو میرے واٹس ایپ پر موصولہ پیغام، افسوس کے ساتھ خبر دی جاتی ہے کہ بدرالدین الحافظ کا آج انتقال ہو گیا ہے۔ یہ خبر میرے لیے انتہائی افسوسناک اور سوہان روح تھی۔ مرحوم سے میرا تعلق انتہائی والہانہ رہا ہے۔ پروفیسر بدرالدین الحافظ سے پہلی مرتبہ میری ملاقات جامعہ الفیصل راجہ کا تاجپور، ضلع بجنور (یوپی) میں دوروزہ تعلیمی کانفرنس بعنوان 'مدارس اسلامیہ کا نصاب تعلیم اور عصری آگہی' منعقدہ 4،5 مئی 2010 میں ہوئی تھی۔ اس میں راقم کے علاوہ بطور مقالہ نگار موصوف نے بھی اپنا مقالہ پڑھا تھا۔ پروفیسر بدرالدین الحافظ کی ولادت 1935 میں مرادآباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وتکمیل حفظ قرآن مدرسہ شاہی مرادآباد میں ہوئی۔ بعد میں دارالعلوم دیوبند سے سند فضیلت وعالمیت حاصل کی۔ اس کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے انٹرمیڈیٹ اور گریجویشن کیا۔ بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے عربی ادب میں ایم اے اور دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر کے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ملازمت سے وابستہ رہتے ہوئے اسلامک اسٹڈیز وعربک ٹیچر سے پروفیسر تک کے تدریسی مراحل طے کیے۔ موصوف کو 1985 میں اُس وقت کے صدر جمہوریہ ہند آنجہانی ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے بدست بہترین عربی اُستاد کے میڈل سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ بھی آپ کو ان کی علمی وادبی خدمات کے عوض متعدد اعزازات وانعامات دیے گئے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے پروفیسر وسربراہ ہو کر سبکدوش ہوئے۔ سبکدوش ہونے کے بعد بھی آپ تا حیات علمی وادبی کاموں میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم طلبا کی جدید عربی میں گھر پر مفت تدریس کرتے ہوئے لاتعداد طلبا کی علمی تربیت کی اور مستفید کیا۔ موصوف کا یہ جذبہ اور خدمات لائق صد تحسین وستائش ہے۔

بحیثیت ترجمہ نگار آپ نے متعدد عربی ناولوں کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ دینیات میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ پروفیسر بدرالدین الحافظ نے عربی کے مشہور ادیب عباس محمود العقاد کی پانچ عربی کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے ہیں۔ ان میں خلفائے راشدین اور حضرت عائشہؓ کے تراجم لائق ذکر ہیں۔ بچوں کے لیے مدرسہ ابتدائی کی نظمیں کے عنوان سے ایک مجموعہ بھی شائع ہوا۔ انشائیوں میں آپ کے گزشتہ سالوں میں تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں انصاری صاحب کا چائے خانہ 13 20 میں شائع ہوا۔ شیخ کا طرحدار کرتا اشاعت 2014 اور بڑھاپے میں جوانی اشاعت 2017 نے منظر عام پر آ کر قبولیت عام حاصل کی۔ تینوں کتابوں کے اصلاحی

مضامین نے انشا کے حسن وآہنگ اور افسانوی رنگ نے موصوف کے اسلوب نگارش کو دلچسپ وجاذب نظر اور دوآتشہ بنادیا ہے۔ موصوف نے ان مضامین میں نفس مضمون سے مطابقت رکھنے والے معروف شعرا کے اشعار کو اس خوبی کے ساتھ چسپاں کیا ہے کہ مستعمل اشعار مضامین کی تحریروں کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے کتاب 'بڑھاپے میں جوانی' کے مضمون، بڑھاپا کیا گیا میں شجاع خاور کا یہ شعر۔

شجاع موت سے پہلے ضرور جی لینا
یہ کام بھول نہ جانا بہت ضروری ہے
سنتے ہیں ان کو چھیڑ چھیڑ کے ہم
کس مزے سے عتاب کی باتیں

ایک اور مضمون سلام پھیرتے ہی ہم ثواب مانگنے لگے میں۔

تجارتوں کا رنگ اب عبادتوں میں آگیا
سلام پھیرتے ہی ہم ثواب مانگنے لگے

وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بڑھاپے میں جوانی کتاب میں شامل مضامین میں سے چند جن میں بوڑھی محبوبہ، بڑھاپے میں جوانی، شیخ کا طرحدار کرتا، میرا موبائل مجھ سے مانوس نہیں ہوتا، اصلی نقلی کمبل، کے دلچسپ مناظر وغیرہ کے علاوہ دیگر مضامین بھی یا تو مصنف کو پیش آمدہ روزمرہ کے واقعات، مسائل اور مشاہدات کے ترجمان ہیں یا پھر ان کے تجربے کے غماز، جن کو مصنف نے اپنے منفرد اسلوب نگارش کے ساتھ نفس مضمون کو اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھ کر کلمات دادو تحسین نکلتے ہیں۔ ایک یونانی دواخانے میں کیا دیکھا میں ادویات کے غلط املا سے متعلق بڑی اچھی نشاندہی کے ساتھ موجودہ دور کے اردو خواندہ حضرات کے غلط املے پر بجا طور پر اظہار تاسف کیا ہے۔ مضامین میں مستعمل طنز ومزاح برائے اصلاح جہاں نشتریت پیدا کرتا ہے وہیں دوسری طرف شائستہ مزاح بھی قاری کی طبیعت کو مکدر نہیں ہونے دیتا۔ مختصر تینوں کتابوں کے مشمولات نہ صرف لائق مطالعہ ہیں، بلکہ اپنے اندر فکر اصلاح بھی رکھتے ہیں۔ درمیان میں گاہے گاہے احادیث، اقوال زرّیں اور ناصحانہ اشعار کی شمولیت نے کتاب کے مواد میں چار چاند لگادیے ہیں۔ بلا شبہ مذکورہ مضامین نہ صرف قارئین کو اصلاح کی تحریک دلاتے ہیں، بلکہ انھیں دعوت فکر دے کر عملی جدوجہد پر بھی اُبھارتے ہیں۔

مدرسہ ابتدائی کی نظمیں پروفیسر بدرالدین الحافظ صاحب کی بچوں کے لیے لکھی گئی منظومات کا مجموعہ ہے، جو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے مڈل درجات کے مڈل سطح کے طلبا و طالبات کے لیے تحریر کی گئی ہیں۔ مذکورہ بالا مجموعے میں پروفیسر بدرالدین الحافظ صاحب کی نظموں کے علاوہ جناب عنایت اللہ منظر اعظمی، سید مقصود حسین نقوی، سید ضمیر الحسن میر مرحوم وغیرہ سابق اساتذہ کی شعری کاوشوں کو بھی ترتیب میں جگہ دی گئی ہے۔ بالخصوص اس مجموعے کو تصنیف کے علاوہ ترتیب وتالیف کے ذیل میں بھی رکھا جائے گا۔ سبھی نظموں میں بچوں کی تربیت واصلاح کی خاص رعایت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ نظموں میں حمد ونعت کے علاوہ دیگر موضوعات پر شامل نظموں میں طلبا کے علمی وثقافتی تمدنی وکلچرل سرگرمیوں کی نمائندگی بخوبی ہوئی ہے۔ اس مناسبت سے ان نظموں کو نیا تعلیمی سال، نیا شمسی سال، کھلی ہوا کا مدرسہ، فائنل کلاس کی الوداعی دعوت اور سالانہ اسپورٹس وغیرہ ذیلی عنوانات کے تحت موضوعات کی نشاندہی کے لیے زمرہ بند کیا گیا ہے۔ نظموں میں ہندی لفظیات کے استعمال نے نہ صرف زبان وبیان میں مٹھاس پیدا کی ہے، بلکہ اس سے ہماری گنگا جمنی تہذیب کی عکاسی بھی ہوئی ہے۔

پڑھو لکھو و گیانک بن کر تم کو چاند پہ جانا ہے
نئی نرالی راہ پہ چل کر سب کو مارگ دکھانا ہے
کہہ دو اَب تو چاند کی دنیا میں جانے کی ٹھانی ہے
دنیا نئی بسانی ہے،

نظمیں بچوں کو نہ صرف علم وعمل کے لیے اُبھارتی ہیں بلکہ ان میں حب وطن اور ملی خدمت کا جذبہ پیدا کرنے کے علاوہ ان میں جمہوری مزاج پیدا کر کے شعور و بیداری کا پیغام بھی دیتی ہیں۔ جیسے بچوں کی حکومت والیکشن، مسند نشینی کا جلسہ، مبارک ہو یہ رسم، مسند نشینی و جمہوریت کا نغمہ وغیرہ نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ طلبا کو بانیان جامعہ گاندھی جی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور حکیم اجمل خاں وغیرہ اسلاف کے کردار وسیرت کو بطور آئیڈیل وآدرش اپنی شخصیت وعمل میں ڈھال کر ملک وملت کی خدمت اور تعمیر کے لیے اُبھارا گیا ہے۔

پڑھنے لکھنے سے کرلو پیار / تم ہو دیش کے کھیون ہار
پڑھنے والے لوگ تھے کیسے / گاندھی، اجمل، ذاکر جیسے
تم بھی کام کروان جیسے / بن جاؤ گے اک دن ایسے

اس کے علاوہ متفرقات کے تحت عمومی موضوعات کو موصوف نے جلسے میں قوالی، سالگرہ مبارک ہو، مبارکباد اور ہری سبزی پسند ہے وغیرہ نظموں میں جگہ دی ہے۔ چند طلبا واساتذہ کا تعارف منظومات کے بند واشعار میں اس ان کہے انداز میں کردیا گیا ہے، جس سے نہ صرف ان شعروں میں ان کی سیرت سمائی ہوئی ہے، بلکہ ان کی وطن پرستی کی تاریخی جھلک بھی ان شعروں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ طلبا کا منظوم تعارف دیکھیں۔

کون کہتا ہے جہاں سے اولیاء رخصت ہوئے
مجھ کو دیکھو میں ابھی سید ولی موجود ہوں
ہے کھتولی میرا گھر میرے بزرگوں کا وطن
ناز ہے جس پر مجھے وہ میری خوشیوں کا چمن

نعیم احمد کے لیے۔

شہر بستی سے میں آیا اٹھا کر ہاتھ میں بستہ
بسا پھر جامعہ آکر لگایا میز پر بستہ
نعیم احمد میں کھاتا ہوں باقر خانیاں خستہ
پسند ہے مجھ کو اصلی گھی وہ مہنگا ہو کہ ہو سستا

اساتذہ کے تعارف میں آزاد رسول، آفتاب صدیقی، شاہدہ پروین وغیرہ پر اشعار۔

کردار میں درویشی انداز فقیرانہ
آزاد نے پائے ہیں اطوار کریمانہ
کیوں نہ چمکیں یہ جہاں میں آج مثل آفتاب
ہے محبت ان کی فطرت تو ریاضت ان کا دین
شاہدہ مشہود ہیں اردو کی سہیلی
بچوں کو سناتی ہیں یہ خسرو کی پہیلی

پروفیسر بدرالدین الحافظ نے سنجیدہ علمی موضوعات پر لکھنے کے ساتھ ساتھ نثر میں طنز وظرافت اور یادداشت قلم بند کر کے اپنے قلم کے جوہر دکھلائے ہیں۔ 'میری زندگی کی یادگار عیدیں' ایسی ہی یادداشتوں پر مبنی ان کی تحریر ہے، جس میں مختصر طور پر ان کی خودنوشت سوانح کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس میں موصوف نے عید کے زیر عنوان خود کو پیش آمدہ مدو جزر زمانہ اور نشیب وفراز کو بڑی خوبصورتی اور فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ عید کے اہتمام میں بچوں کے لیے ضروری لوازمات سے محرومی کا حالات کے تناظر میں بخوبی ذکر کرتے ہوئے یہ بھی تحریر کیا ہے انقلاب زمانہ نے غیر متوقع طور پر مجھ سے مفلوک الحال شخص کو بالآخر وہ عروج بخشا کہ آج جامعہ میں دوگانۂ عید کی امامت کا مجھے شرف حاصل ہوا، جس کی اقتدا میں سابق صدر جمہوریہ ہند مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد مجیب شیخ الجامعہ وزرا وسفرا جیسی گرانقدر شخصیات نے نماز عید ادا کی۔ اپنے اسی مضمون میں موصوف نے بجا طور پر عیدین کے مواقع پر اتحاد باہمی، یگانگت ومیل ملاپ وغیرہ کے ذکر کے ساتھ ساتھ اہتمام عید کے طریقوں کے مابین ماضی وحال کے فرق کو تاریخ کے تناظر میں بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ زندگی کی یادگار عیدیں کے زیر عنوان دہلی کی عید گاہ میں 'اپنی پہلی عید کی نماز' میں تحریر کرتے ہیں کہ 1944 میں جب والد صاحب نے کرنال

چھوڑنے کا ارادہ کرلیا اور مجھے لے کر دہلی آ گئے تو صدر بازار کی سرائے میں اترے۔ یہاں چار آنے روز کی چار پائی کرائے پر لی۔ اس سرائے میں ایک روپیہ یومیہ چھوٹا کمرہ بھی ملتا تھا، جسے عام طور پر پنجاب اور یوپی وغیرہ کے تاجر کرائے پر لے کر تجارتی سامان رکھا کرتے تھے۔ اس کی چابی ہر کرائے دار کے پاس رہتی تھی۔

اس کے بعد والد صاحب نے ہمارے ایک رشتے کے ماموں مولانا مقبول احمد کو تلاش کیا۔ وہ قصاب پورہ میں رہتے تھے، وہاں ان کی General merchant کی دکان تھی۔ وہ مل کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ تم جہاں ٹھہرے ہو وہاں گھر کا کھانا لاؤں گا۔ اس طرح مقبول ماموں دو تین روز تک کھلاتے رہے۔ پھر انھیں کی کوشش سے ہمارے لیے ایک قیام گاہ تلاش کی گئی، جو گھر نہیں بلکہ ایک دوکان تھی۔ یہ بارہ ٹوٹی سے باڑہ ہندو راؤ کو جانے والی سڑک کے بائیں جانب کسی اگلی گلی میں تھی۔ اس کے برابر حجام کی ایک دوکان تھی۔ وہ بھی ملنسار شخص تھا۔ اگرچہ دوکان میں رہائش کی ساری سہولتیں نہیں تھیں اور دشواری بھی تھی، مگر بہر حال ایک ٹھکانہ ہوگیا تھا۔ پھر حجام ہی کے مشورے پر قطب روڈ سے ایک چارپائی منگائی گئی، جو چار روپے کی تھی۔ لانے والے مزدور نے چار آنے لیے تھے۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ کسی طرح گزر رہا تھا۔ اسی دوران مجھے بخار آنے لگا۔ والد صاحب جنھیں ہم بھائی کہا کرتے تھے، مجھے لے کر بارہ ٹوٹی پر ایک سرکاری ڈسپنسری میں گئے۔ وہاں کچھ گولیاں دی گئیں، جو دو تین روز تک کھاتا رہا اور بخار اتر گیا۔

عید کا دن قریب تھا۔ اس دن بچوں کی خواہش کے مطابق نئے کپڑے، جوتے، عیدی اور سوئیاں سب ذہن میں گھوم رہی تھیں، مگر بھائی سے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، کیونکہ سارا حال معلوم تھا۔ فی الحال آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ کرنال سے جو بھی لائے ہوں گے، اسی سے کام چل رہا تھا۔ یہ یاد آیا کہ بھائی نے کرنال سے بازار میں سڑک کے کنارے کپڑے بیچنے والے سے میرے لیے دس آنے کا ایک پاجامہ خریدا تھا۔ عید کے دن پہن لوں گا۔ قمیص نئی تھی یا پرانی، یاد نہیں، پر جوتے پرانے تھے۔ عید کے دن بھائی نے کہا، 'میں تو عیدگاہ نہیں جا سکتا۔ تم سامنے والی مسجد کے پاس رہنے والے بچوں کے ساتھ عیدگاہ چلے جانا۔' چلتے وقت مجھے دو آنے دے کر کہا، 'کچھ کھالینا'۔

میں محلّہ والوں کے ساتھ عیدگاہ چلا گیا، مگر قدرے تنہائی کا احساس تھا۔ راستے میں حلوائیوں کی دوکان پر کچھ کچوریاں تلی جا رہی تھیں، کچھ لکڑی کے کھلونے بھی فروخت ہو رہے تھے۔ ہم قصاب پورہ کے راستے عیدگاہ پہنچے۔ عید کی نماز ادا کی۔ واپسی میں بھیڑ کی وجہ سے میں ساتھیوں سے بچھڑ گیا، مگر راستہ یاد تھا، اس لیے اکیلا گھر آ گیا۔

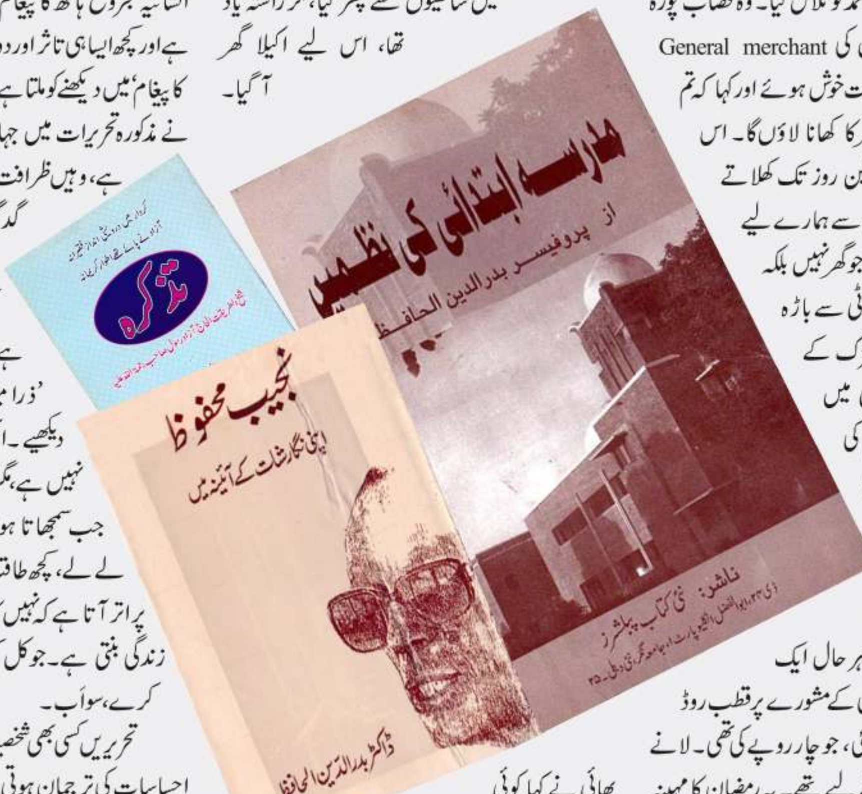

بھائی نے کہا کوئی چیز کیوں نہیں لایا۔ بہرحال گھر میں خاموشی تھی۔ کوئی عید کا ماحول نہیں تھا۔ یہ بھی یاد نہیں کہ ہم نے سوئیاں کھائیں یا نہیں۔ گھر میں تو پکنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ دن گزر گیا۔ میری زندگی کی یادگار عیدیں، میں موصوف کی عید پر سرگزشت پڑھ کر ہمیں بیساختہ منشی پریم چند کا افسانہ عیدگاہ یاد آ جاتا ہے اور اسی افسانے کا کردار حامد کے ساتھ موصوف بدرالدین الحافظ صاحب کی اتفاقی مماثلت کس درجہ ہے کہ حامد بھی عیدگاہ سے واپسی پر دادی کے لیے چمٹا لانا نہیں بھولتا ہے اور جیب میں کم پیسے ہونے کے سبب اپنے لیے نہ کچھ کھانے کے لیے خریدتا ہے اور نہ کوئی کھلونا لیتا ہے۔ جب کہ اس کے ساتھیوں نے میلے میں خوب مزے اڑائے تھے۔ آگے لکھتے ہیں، کسے خبر تھی کہ مایوسی کے عالم میں عید منانے والا یہ بچہ آنے والے وقت میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم مسلم سفرا و وزرا اور سربراہان جامعہ ملیہ کو عید کی نماز پڑھائے گا اور لوگ اس سے مل کر خوش ہوں گے۔

یہ قدرت کی کاریگری ہے جناب
کہ ذرہ کو چمکائے جوں آفتاب

موصوف اپنے حادثاتی واقعات کو ظرافت کے پیرائے میں کس لطف کے ساتھ تحریر کرتے ہیں جس کو ان کے انشائیہ 'مجروح ہاتھ کا پیغام'، میں بجا طور پر دیکھا جا سکتا ہے اور کچھ ایسا ہی تاثر اور دوسرے انشائیہ 'صحت مند ہاتھ کا پیغام' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ درون نفس مضمون موصوف نے مذکورہ تحریرات میں جہاں اپنے علم و فضل کا اظہار کیا ہے، وہیں ظرافت سے پر اسلوب اور شوخی سے گدگداتے ہوئے انشائیوں میں زبان کا حسن اور جو لطف پیدا کر دیا ہے، وہ دیکھتے ہی بنتا ہے۔ ایک بانگی دیکھیے۔

'ذرا میرے مجروح ہاتھ کی بیتابی تو دیکھیے۔ ابھی اچھی طرح صحت یاب ہوا نہیں ہے، مگر بے چین ہے کہ کچھ کرے۔ جب سمجھاتا ہوں کہ جلدی کیا ہے؟ ذرا دم لے لے، کچھ طاقت کا انتظار تو کر، تو لب کشائی پر اتر آتا ہے کہ نہیں کار جہاں دراز ہے۔ عمل سے زندگی بنتی ہے۔ جو کل کرنا ہے وہ آج کر، جو آج کرے، سو اَب۔

تحریریں کسی بھی شخصیت کے نہ صرف جذبات اور احساسات کی ترجمان ہوتی ہیں، بلکہ تحریروں کے بطن میں صاحب شخصیت کے سیرت و کردار کو بھی بجا طور پر دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ پروفیسر بدرالدین الحافظ کی شخصیت کو ایک شفیق استاد، کامل رہنما، برابر والوں کے لیے ایک مخلص دوست، ملک و قوم و ملت کے لیے درد مند دل رکھنے والے فرد اور علم و ادب کے شیدائی و خدمت گزار کے طور پر رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔ آج موصوف ہمارے درمیان نہیں ہیں، مگر ان کی تحریریں اور مشورے ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

■

Mohammad Ahmad Danish
Kashana-e-Gulzar,
Near: Taj Palace,
Post: Raja ka Tajpur,
District: Bijnor, U.P. 246735
Mob.: 9759418047

رضوان الحق

> ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ موسیقی کو رکارڈ کرنے کی تکنیک کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز میں ہی ہو سکا۔ اس سے قبل موسیقی کے بڑے سے بڑے اساتذہ کی آوازیں محفل میں گونجتی تھیں پھر ہمیشہ کے لیے دنیا سے فنا ہو جاتی تھیں۔

استاد راشد خان

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ہندستانی موسیقی کا نہایت تابناک ستارہ استاد راشد خان بالآخر ڈوب گیا۔ اسی کے ساتھ وہ امیدیں بھی ڈوب گئیں، جو ان سے بھارت رتن پنڈت بھیم سین جوشی نے کی تھیں، انھوں نے راشد خان کو سننے کے بعد ایک بار کہا تھا، ''وہ ہندستانی موسیقی میں گائکی کے تابناک مستقبل کی ضمانت ہیں۔''[1]

اب وہ ہمارے درمیان نہیں رہے۔ وہ کافی عرصے سے پروسٹیٹ کینسر سے لڑ رہے تھے اور آخر کار ہار گئے۔ ابھی وہ محض 55 برس کے تھے، موسیقی کو ان سے ابھی بے شمار توقعات تھیں، جو اب پوری نہ ہو سکیں گی۔ لیکن وہ دنیائے موسیقی کو جو کچھ دے کر گئے ہیں، وہ سرمایہ بھی معمولی نہیں ہے، اس کی قدر و قیمت کے تعین میں ایک زمانہ لگے گا۔ ان کے چاہنے والوں کے لیے یہ آواز ہمیشہ ہمیشہ گونجتی رہے گی۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ موسیقی کو رکارڈ کرنے کی تکنیک کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز میں ہی ہو سکا۔ اس سے قبل موسیقی کے بڑے سے بڑے اساتذہ کی آوازیں محفل میں گونجتی تھیں پھر ہمیشہ کے لیے دنیا سے فنا ہو جاتی تھیں۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم ایک ایسے زمانے میں جی رہے ہیں کہ فن کار کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی اس کی موسیقی سے ہم محروم نہیں ہوں گے۔ غنیمت کی بات یہ ہے کہ راشد خان کی بے شمار رکارڈنگز ہمارے درمیان موجود ہیں اور آگے بھی رہیں گی۔

راشد خان (1 جولائی 1968 تا 9 جنوری 2024) اس وقت ہندستانی موسیقی کے شاید سب سے روشن ستارے تھے۔ تقریباً پچپن سال کی جواں عمر میں انھیں سنگیت ناٹک اکادمی، پدم شری اور پدم بھوشن جیسے اعلیٰ اعزازات سے نوازا جا چکا تھا اور ابھی نہ جانے کون کون سے اعزازات ان کے منتظر تھے لیکن اب وہ تمام مکانات ختم ہو چکے ہیں۔ دنیائے موسیقی میں رام پور سہسوان گھرانے کا نام بڑے عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ اسی گھرانے میں اتر پردیش کے بدایوں میں پیدا ہوئے تھے، سہسوان بدایوں ضلعے کا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ اس گھرانے کا آغاز محبوب خان نے کیا تھا، لیکن استاد عنایت حسین خان (1849-1919) کے ذریعے اس گھرانے کی بنیادیں مستحکم ہوئیں اور شناخت ملی۔ اس گھرانے کے دیگر معروف اساتذہ میں استاد حیدر خاں (1857-1927) اور پدم بھوشن مشتاق حسین خان (1878-1964) بہت اہم ہیں۔ راشد خان نے استاد نثار حسین خان (1906-1993)

سے گنڈا بندھوا کر باقاعدہ شاگردی اختیار کی تھی، وہ ان کے نانا بھی تھے۔ اس گھرانے کی شناخت کسی ایک طرح کی گائکی یا باجے سے نہیں ہے بلکہ اس گھرانے میں الگ الگ زمانے میں کئی طرح کے فن کار پیدا ہوئے ہیں۔ کسی نے خیال گائکی میں نام پیدا کیا تو کسی نے ٹھمری میں اور کسی نے ترانہ میں کمال حاصل کیا۔ پھر بھی کچھ راگ اور بندشیں ایسی ہیں جنھیں اکثر استاد گایا کرتے تھے۔ مثلاً، دیش راگ میں ''کرم کردیجے اؤمرے خواجہ موجی الدین،...'' یا ''جھنن جھنن باجے بچھوا.. باجے۔'' وغیرہ۔

راشد خان کی پرورش اسی ماحول میں ہوئی، ان کا بچپن عام بچوں کی طرح ہی کھیل کود میں گزرا، شروع میں انھیں گائیکی میں کچھ خاص دلچسپی نہ تھی، لیکن گھر کی روایت کے مطابق انھیں موسیقی میں تربیت دی جاتی رہی، جب تک انھیں کچھ پسند نہ آتا وہ اس کی تربیت میں دلچسپی نہ لیتے، ان کے استاد بھی اس بات کو لے کر پریشان رہا کرتے تھے۔ شروع میں غزل نے انھیں متاثر کیا تو وہ غزل گائکی کی طرف راغب ہوئے، محمد رفیع کے فلمی نغموں نے بھی متاثر کیا تھا۔ اسی زمانے میں گرِجا دیوی کی ٹھمری سن کر ٹھمری میں بھی ان کی دلچسپی پیدا ہوئی۔ استاد نثار حسین خان نے ان کی صلاحیت کو پہچان لیا اور ان کی تربیت کو لے کر سنجیدہ ہو گئے۔ وہ راشد خان کو بہت صبح اٹھا دیتے، سخت نظم وضبط کو ان پر لاگو کرتے، نیند میں ڈوبے راشد خان اس سختی سے گھبرا جاتے اور کئی بار موسیقی کے تئیں بے زاری کا بھی اظہار کرتے۔ مگر موسیقی ان کی سرشت میں شامل تھی، وہ اس کا ریاض ضابطے سے تو کم کرتے پھر بھی چلتے پھرتے اور کھیلتے کودتے راگوں اور ترانوں کا ریاض کر لیا کرتے۔ تان کاری عام طور پر بہت ریاضت کے بعد ہی آتی ہے لیکن راشد خان نے اسے کھیل کھیل میں ہی سیکھ لیا تھا۔ آہستہ آہستہ خود راشد خان کو احساس ہو گیا کہ ان کی آواز میں کچھ خاص کشش ہے اور انھیں اس کے تئیں سنجیدہ ہونا چاہیے۔

راشد خان ابھی محض 11 سال کے تھے کہ استاد نثار حسین خان انھیں کولکاتا کے ایک کلاسیکی موسیقی کے کنسرٹ میں لے گئے۔ اس کنسرٹ میں راشد خان کو سننے والوں میں پنڈت روی شنکر، پنڈت بھیم سین جوشی، علی اکبر خان، امجد علی خان، نکھل بنرجی جیسے دنیائے موسیقی کے آفتاب و ماہتاب موجود تھے۔ راشد خان نے راگ پردیپ میں ایک بندش لگائی 'لاگے تو سے نین اؤ پریتم' ایک چھوٹے بچے میں جو ایک ڈر اور جھجک ہوتی ہے وہ ان میں بھی تھی لیکن ایک بار جو گانا شروع کیا تو بس کمال ہی کرتے چلے گئے۔ گائکی کے بعد سب لوگوں نے راشد خان کی خوب تعریفیں کیں۔ 1980 میں کولکاتا کے آئی ٹی سی سنگیت ریسرچ اکادمی میں استاد نثار حسین خان کو بطور استاد دعوت نامہ ملا جسے انھوں نے قبول کر لیا۔ اس کے بعد راشد خان کو بھی اکادمی کے ضابطے کے مطابق داخلہ مل گیا۔ یہاں گروشِشیہ پرمپرا کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی، اکادمی میں بھی استاد نثار حسین خاں راشد خان کے استاد مقرر ہو گئے۔ لیکن راشد خان یہاں نثار حسین خاں کے ساتھ ساتھ دیگر اساتذہ سے بھی باقاعدہ موسیقی سیکھنے لگے۔ اس ادارے سے اس زمانے کے بڑے بڑے اساتذہ وابستہ تھے، کئی بار ایسا ہوتا کہ پنڈت روی شنکر، ولایت خاں یا گرجہ دیوی آئی ہوتیں اور وہ کہتیں کہ اس بچے کو بلا کر لاؤ 'راشد خان' کو سننے کو جی چاہتا ہے۔ ایسے میں راشد خان ہمیشہ ان کی امیدوں پر کھرے اترتے اور خوب داد وتحسین حاصل کرتے۔ ان سب اساتذہ کے ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ رہتا تھا کہ وہ صرف راشد خان کی پرورش نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس کی شکل میں ہندستانی کلاسیکی موسیقی کے مستقبل کو سنوار رہے ہیں۔ بچے نے بھی سب کی باتوں کو خوب غور سے سنا اور سمجھا۔ ان دنوں سنگیت ریسرچ اکادمی کے ڈائریکٹر وجے کچلو تھے، وہ ہر طالب علم کا اس کے استاد کے ساتھ جائزہ لیتے تھے۔ ان کی ہم جماعت رہیں، ریکھا سوریا نے ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ ہر اسکالر کی ہر ہفتہ مشترکہ طور پر حوصلہ افزائی اور تعینِ قدر کرتے تھے۔ راشد کے بارے میں وہ آپس میں کہتے ''ہم اس کا تعینِ قدر کرنے والے کون ہوتے ہیں، وہ ہمارا ہم پایہ اور ہمارے برابر ہے، ہم سے کم نہیں ہے۔''[2]

ان کی تعلیم کا یہ سلسلہ یہیں نہیں رکا بلکہ جب تک یہ بڑی بڑی شخصیتیں اس دنیا میں رہیں وہ ان کے سامنے اسی طرح دوزانو ہو کر سیکھتے رہے اور وہ اساتذہ بھی اپنی شفقت سے انھیں نوازتے رہے۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتے عظیم فن کاروں سے رہنمائی اور مشورہ کرتے، باریکیوں کے بارے میں سوال کرتے۔ اگر رکارڈنگ میں جانے کا موقع ملتا تو وہاں بھی بڑے غور سے دیکھتے سنتے اور رکارڈنگ کی باریکیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے، وہ سیکھنے کا کوئی بھی موقع گنوانا نہیں چاہتے تھے۔

ایک بار ڈور لین کولکاتا میں پنڈت بھیم سین جوشی کی رکارڈنگ تھی، یہ 1997 کا واقعہ ہے، راشد خان کو معلوم ہوا تو وہ بھی اسٹوڈیو کے رکارڈنگ روم میں ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھ کر دیکھنے لگے، رکارڈنگ کرانے والوں نے ان سے باہر نکل جانے کو کہا۔ وہ لوگ راشد خان کو جانتے بھی تھے لیکن انھوں نے بے رخی سے جب نکال دیا تو راشد خان نے اسی وقت عزم کر لیا کہ وہ اتنی محنت کریں گے کہ ایک دن یہ لوگ ہی مجھ سے رکارڈنگ کے لیے خوشامد کریں گے۔ اور راشد خان نے اتنی محنت کی کہ ایک دن وہ وقت بھی آ گیا جب وہ لوگ راشد خان سے رکارڈنگ کے لیے التجائیں کرنے لگے۔ لیکن راشد خان نے اپنے فن پر کبھی غرور نہیں کیا، ان کے ساتھ رکارڈنگ کو قبول کر لیا۔ وہ اتنی محنت کرتے کہ ہر مشکل سے مشکل بندش اور راگ کو جذبات اور رس سے بھرپور بنا دیتے۔ راگ راگنیوں کا علم رکھنے والے اور تکنیکی طور پر ہندوستانی کلاسیکی موسیقی جاننے والے تو ان سے لطف اندوز ہوتے ہی تھے لیکن ایک عام انسان جس کے کانوں میں موسیقی کے حسن سے لطف اندوز ہونے کی تھوڑی بھی حس ہوتی، وہ بھی اس موسیقی سے لطف اندوز ہوئے بنا نہ رہ پاتا۔ وہ راگوں کے پیچ وخم کو تو سمجھتے ہی لیکن اس کے جمالیاتی پہلو پر زیادہ زور دیتے۔ سُمیتا اوجھا نے راشد خان کے ایک پروگرام کو یاد کرتے ہوئے لکھا ہے:

''الاپ کی مدھم آنچ پر دھیرے دھیرے راگداری کی ٹھہراؤ بھری آواز پھیلنے لگی تھی اور گائک کی سُر دار، خمدار آواز فضا میں گردش کرنے لگی تھی۔ بے شمار خیال کے پیکروں میں تھرک رہی آواز سامعین کو لگاتار حیرت میں ڈال رہی تھی کہ تبھی گائک نے ایک مرکی لی، تھوڑی سی ڈھیل دے کر سر کے تار کو اچانک کھینچ لیا... یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ موسیقی آسمان سے اتر رہی ہو۔''[3]

استاد راشد خان سے میرا پہلا تعارف 2003 کے آس پاس ہوا، ایک بار میں معروف دستاویزی فلم ساز انور جمال کے ساتھ ان کی کار میں سفر کر رہا تھا، کار میں ہندوستانی کلاسیکی موسیقی میں راگوں کا ایک کیسٹ بج رہا تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا، ''اس آواز کو پہچانتے ہو؟ میں نے آواز غور سے سنی اور پہچاننے کی کوشش کی، لیکن پہچان نہ سکا، پہچانتا بھی کیسے کیونکہ میں نے دانستہ طور پر کبھی انھیں سنا ہی نہیں تھا۔ جب میں غور سے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا، اس وقت احساس ہوا کہ یہ آواز اور گائیکی بہت غیر معمولی ہے۔ انور جمال نے بتایا کہ یہ راشد خان ہیں اور انھیں غور سے سننا چاہیے۔ اس کے بعد میں نے راشد خان کو انٹرنیٹ پر تلاش کر سننے کی کوشش کی مگر کچھ زیادہ نہ مل سکا، اس زمانے میں انٹرنیٹ پر اتنے زیادہ آڈیو ویڈیو موجود نہ تھے۔ اس وقت تک یوٹیوب بھی نہیں آیا تھا۔ ہندوستان میں یہ 2006 میں لانچ ہوا تھا۔ اس لیے

انٹرنیٹ پر کچھ زیادہ تو نہ مل سکا لیکن جو بھی ملا اسے سنا۔ میں نے 2007 میں کلاسیکی موسیقی کا ایک سی ڈی البم خریدا، جس میں کلاسیکی موسیقی کی 18 سی ڈی تھیں، جس میں تقریباً تمام اساتذۂ موسیقی کے فن کاروں کے رکارڈز تھے۔ ہندوتانی اور کرناٹک دونوں طرح کی موسیقی کے رکارڈز۔ جس میں ووکل اور انسٹرومینٹل یعنی گائکی اور بجانے والے آلات دونوں طرح کی موسیقی کے استاد تھے۔ میرے لیے یہ بات بڑی خوشی کی تھی کہ اس البم میں جہاں کمار گندھرو، بھیم سین جوشی، پنڈت روی شنکر، گرجہ دیوی اور استاد بسم اللہ خان جیسے اساتذہ تھے، وہیں میرے پسندیدہ استاد راشد خان بھی موجود تھے۔ میں نے راشد خان کی اس سی ڈی کو بار بار سنا۔

اب جو میں سوچتا ہوں وہ کیا چیز تھی جس کی وجہ سے میں راشد خان کو بار بار سنتا تھا؟ میں موسیقی کا کوئی ماہر تو نہیں تھا، وہ ہندوستانی کلاسیکی گائکی میں تکنیکی طور پر کمال تو رکھتے ہی تھے، ان میں اختراع بھی کرتے تھے لیکن وہ موسیقی کی جمالیاتی خوبیوں کا بہت خیال رکھتے تھے، اور یہی وہ کمال تھا جس کی وجہ سے میں راشد خان سے سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ راشد خان کی ویب سائٹ پر ان کی گائکی کے بارے میں لکھا ہے:

''راشد خان نے اپنے نانا نانی کی طرح اپنے وِلمبت خیالوں میں آہستہ رفتار سے تفصیلات کو شامل کیا اور سرگم وسرگم تانکاری کے استعمال میں غیر معمولی مہارت بھی حاصل کی۔ وہ استاد امیر خان اور بھیم سین جوشی کے اسلوب سے متاثر ہیں۔ وہ اپنے استاد کی طرح ترانہ کے استاد ہیں لیکن انھیں اپنے طریقے سے گاتے ہیں، وہ باجوں کے اسٹروک - اساس اسلوب کی بجائے خیال گائکی کے اسلوب کو ترجیح دیتے ہیں، جس کے لیے استاد نثار حسین مشہور تھے۔''[4]

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ استاد راشد خان کا اصل کمال یہ ہے کہ ان کی گائیکی اساتذہ کے اسلوب کو اچھے سے سمجھ کر اس میں جدت پیدا کرنے سے بنی ہے۔ یہ موسیقی سخت محنت، صحیح تکنیک اور مشکل راستوں پر چل کر ہی ممکن ہوئی ہے، راشد خان نے ان سب مہارتوں کو کامیابی کے ساتھ پار کیا ہے۔

استاد راشد خان کو یاد کرتے ہوئے مجھے بھوپال کی ایک خوبصورت شام یاد آ رہی ہے، ان دنوں سردیوں کی شدت ختم ہو چکی تھی اور گرمی آنے میں ابھی وقت تھا۔ بھارت بھون کے بہی رنگ اسٹیج میں استاد راشد خان کی گائکی جاری تھی، کھلی فضا کا یہ اسٹیج بھارت بھون کے پچھلے حصے میں ہے جو بھوپال کے معروف 'بڑا تالاب' سے متصل ہے۔ اس جھیل میں دور تک موجیں رواں دواں تھیں، شاید جھیل کے اِس طرف سے اٹھنے والی ایک موج سے جھیل کی موجیں بھی سُر ملانا چاہ رہی تھیں، دور تک پھیلی جھیل کے اُس پار اور کہیں کہیں تالاب میں بھی کچھ دیے یوں ٹمٹمارہے تھے، جیسے راشد خان کی آواز سے ان میں بھی لہریں پیدا ہو رہی ہوں۔ اس سے قبل کہ استاد اپنی پسند کا کوئی راگ چھیڑتے، نئی نسل کے ان کے دیوانوں نے چیخنا شروع کر دیا، ''آؤگے جب تم او ساجنا، انگنا پھول کھلیں گے۔'' لوگ فلم 'جب وی میٹ' کا گانا سننا چاہ رہے تھے، استاد خیال گائکی سے شروعات کرنا چاہ رہے تھے لیکن چاہنے والوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے،

استاد راشد خان کا اصل کمال یہ ھے کہ ان کی گانیکی اساتذہ کے اسلوب کو اچھے سے سمجھ کر اس میں جدت پیدا کرنے سے بنی ھے۔ یہ موسیقی سخت محنت، صحیح تکنیک اور مشکل راستوں پر چل کر ھی ممکن ھوئی ھے، راشد خان نے ان سب مھارتوں کو کامیابی کے ساتھ پار کیا ھے۔

بڑی خندہ پیشانی سے انھوں نے فلمی نغمے سے پروگرام کا آغاز کیا، اگرچہ مجھے یہ بات پسند نہیں آئی کہ راشد خان کے پروگرام کا آغاز ان کے فلمی نغمے سے ہو، بہر حال سننا شروع کیا، لیکن جیسے ہی انھوں نے آلاپ لیا احساس ہو گیا کہ یہ فلمی نغمہ عام فلمی نغمہ نہیں ہے، اور یہ گائکی ان کی کلاسیکی گائکی سے الگ نہیں ہے۔ اول تو فلمی نغمے کے بول بہت اچھے تھے، دوم راشد خان کی گائکی نے اسے ایک نئی بلندی عطا کر دی تھی۔ جب وہ اس بند پر پہنچے تو انھوں نے فلمی نغمے سے تھوڑی آزادی لے کر اسے اپنی آواز سے مزید سنوار دیا۔ ''نینا ترے کجرارے ہیں، نینوں پہ ہم دل ہارے ہیں، انجانے ہی تیرے نینوں نے وعدے کیے، کئی سارے ہیں، سانسوں کی لَے مدھم چلے، تو سے کہیں برسے گا ساون.. برسے گا ساون جھوم جھوم کے، دو دل ایسے ملیں گے۔'' اس بند کو وہ ٹھہر کر دیر تک گاتے رہے۔ جیسے کہیں سے کوئی روحانی آواز اتر رہی ہو اور ہم سب اس میں ڈوبتے جا رہے ہوں۔ اس نغمے کے بعد انھوں نے کچھ اور فلمی گیتوں کی فرمائشیں پوری کیں۔ اس کے بعد استاد نے کہا اب جو کلاسیکی موسیقی کے سامعین ہیں، ان کی خواہش کا بھی خیال رکھا جانا چاہیے۔ اب تک نوجوان بھی ان کے اصل کمال سے لطف اندوز ہونے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ اور انھوں نے کلاسیکی گائکی شروع کر دی۔ وہ مختلف راگ راگنیوں کو گاتے رہے، کومل سُروں کو وہ جس کمال سے لگا رہے تھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی ماوَرائی آواز ہو اور ان کے گلے سے رقص کرتے ہوئے نکل رہی ہو۔

میری کلاسیکی موسیقی میں تربیت تو نہیں ہے۔ کلاسیکی موسیقی کے بارے میں تھوڑا بہت پڑھا ہے اور کلاسیکی موسیقی سنتا بھی رہا ہوں، میرے گلے میں سُر تو نہیں ہیں لیکن کانوں میں سُر ہیں، اور جب بھی کوئی سُر ٹوٹتا ہے تو کان بتا دیتے ہیں۔ جب میں نے اردو میں افسانے لکھنے شروع کیے تھے اور کچھ موقر رسالوں میں شائع ہونے لگے تھے تبھی سے میرے ذہن میں ایک بات گھر کر گئی تھی کہ اگر میں ادب میں داخل ہو چکا ہوں تو مجھے دوسرے فنون لطیفہ مثلاً کلاسیکی موسیقی، رقص، مصوری، تھیٹر اور سنیما سے بھی تھوڑی بہت واقفیت ہونی ہی چاہیے۔ سارے فنون میں اظہارِ خیال کی بنیادی باتیں معلوم ہونی چاہیے، فن کار کی طرح نہ سہی قاری یا سامع کی طرح ہی سہی، ان سے لطف اندوز ہونے کا فن تو آنا ہی چاہیے۔ ان تمام فنون لطیفہ میں تھیٹر اور سنیما میں تو کافی حد تک ادب شامل ہی ہوتا ہے۔ اس لیے ان فنون کی فہم آسان تھی، مصوری بھی رنگ، ساخت اور اشیا کے باہمی توازن سے تھوڑا بہت سمجھ میں آنے لگا تھا، اگرچہ جدید مصوری میں کافی مشکلیں آئیں لیکن اردو ادب میں استعاراتی، تجریدی اور علامتی افسانے پڑھنے کے بعد جدید مصوری بھی کسی حد تک سمجھ میں آنے لگی تھی۔ رقص میں تکنیکی باتیں نہ بھی معلوم ہوں لیکن آہستہ آہستہ اس کے جمالیاتی پہلو سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اب مسئلہ موسیقی کا تھا، وہ موسیقی جس میں شاعری یا لفظ نہیں تھے اور ماہرِ موسیقی اسی کو خالص موسیقی مانتے تھے۔ لفظوں یا شاعری کو اکثر ماہرین موسیقی کی آلودگی مانتے ہیں۔ خالص کلاسیکی موسیقی میں بھی کئی بار 'ٹیپ' کے کچھ لفظ یا مصرعے ہوتے ہیں، جنھیں یہ لوگ بار بار دہراتے ہیں۔ لیکن موسیقی میں یہ لوگ ان لفظوں یا مصرعوں کو معنی کے لحاظ سے نہیں گاتے ہیں۔ کہ ہم ان کے معنی میں کھو جائیں بلکہ ان لفظوں کے بہانے وہ کسی اور جہاں کی سیر کراتے ہیں۔ کچھ اور احساس کراتے ہیں، وہ کسی بات یا کسی معنی کے

پاس نہیں لے جاتے، بلکہ ایسے احساسات سے تعارف کراتے ہیں جو لفظوں میں بیان نہیں کیے جاسکتے۔ وہ ہم کو کسی خواب تک لے جاتے ہیں، کسی حقیقت کا احساس کراتے ہیں، جہانِ تخیل کی سیر کراتے ہیں، اور خوف کا احساس کراتے ہیں، موسیقی احساسات کی سرحدیں بلرڈ کر دیتی ہے، جیسے خواب میں زمان و مکاں بلرڈ (Blurred) ہو جاتے ہیں۔ موسیقی خوشی اور غم کا احساس کراتی ہے۔ خوشی اور غم کا ہی نہیں بلکہ اگر سنسکرت شعریات کی زبان میں کہیں تو موسیقی سبھی نو رسوں کا احساس کراتی ہے۔ راشد خان کی گائکی بھی انھیں رسوں سے روبرو کراتی ہے۔

اکیسویں صدی کے آغاز تک راشد خان کلاسیکی موسیقی میں ایک شناخت اور مقام بنا چکے تھے لیکن عوامی حلقوں میں عام طور پر غیر معروف تھے۔ راشد خان نے 2004 میں 'کسنا' فلم سے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا۔ لیکن انھیں عوامی حلقوں میں 2007 میں 'جب وی میٹ' فلم سے شہرت ملی۔ یہ نغمہ ''آؤگے جب تم ساجنا، انگناں پھول کھلیں گے'' آج بھی بہت مقبول ہے۔ نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بن چکا ہے اور اس کا شمار فلمی نغموں کے نو کلاسیکی نغموں میں ہوتا ہے۔ اس سے قبل انھیں فلموں میں گانے کے کئی آفر مل چکے تھے مگر وہ ٹھکرا دیتے تھے۔ کلاسیکی موسیقی کے اساتذہ نے بھی انھیں منع کر رکھا تھا کہ اگر فلموں کی طرف گئے تو کلاسیکی موسیقی کے نہیں رہوگے۔ ہوا کچھ یوں کہ اس نغمے کی موسیقی کے ہدایت کار سندیش شانڈلیہ (مجموعی طور پر اس فلم میں موسیقی پریتم کی ہے لیکن اس نغمے کی موسیقی سندیش شانڈلیہ کی ہے) نے فون کیا کہ آپ کو ایک فلم میں گانا گانا ہے، فون پر راشد خان نے منع کر دیا، تو کچھ روز بعد سندیش کولکاتا پہنچ گئے، اور ضد کر لی کہ جب تک ہاں نہیں کہیں گے تب تک واپس نہیں جاؤں گا، بڑی بیٹی بھی کہنے لگی کہ اس فلم میں گائیے۔ تب انھوں نے کہا اچھا ٹھیک ہے بتایئے کیا گانا ہے، اس طرح گانے پر کام شروع ہوا، اس میں کئی تبدیلیاں کی گئیں، اس کے بعد یہ نغمہ وجود میں آیا۔ اس فلم کے بعد انھوں نے کئی اور فلمی نغمے گائے، پھر بھی انھوں نے فلموں کی لائن کبھی نہیں لگائی، اول تو صرف وہ نغمے گاتے جو ان کے مزاج کے مطابق ہوتے، دوم سال میں بس ایک دو فلمی نغمے ہی گاتے۔

اس کے بعد موسیقی کے کنسرٹ میں وہ جب بھی جاتے، ہزاروں کی تعداد میں نوجوان جمع ہو جاتے اور ان کے گائے فلمی نغموں کی فرمائش کرتے، وہ ان کی فرمائش کا احترام کرتے لیکن ان کی خواہش ہوتی کہ لوگ ان کی کلاسیکی گائکی کو زیادہ سے زیادہ سنیں اور ایسا ہوتا بھی۔ ان کے فلمی نغموں کی وجہ سے بہت سے لوگ ان کی کلاسیکی گائیکی سننے کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ وہ دونوں طرح کی گائکی کے درمیان ایک پل بنانے کا کام بھی کرتے رہے۔ فلموں کے ساتھ ساتھ راشد خان نے غزل گائکی کی طرف بھی توجہ دی اور ان کی غزلوں کا ایک البم 'عشق لمحے' ریلیز ہوا۔ ''لبوں پہ عشق کا دعویٰ ہزار دلوں میں سکوں رکیا اس طرح بھی محبت نبھائی جاتی ہے۔ (شاعرہ: ابیتا پرسورام 'بیتا') ان غزلوں سے انھیں بھی کافی شہرت ملی، وہ کولکاتا میں رہتے تھے اور کولکاتا میں رویندر سنگیت کے بغیر بات نہیں بنتی ہے تو انھوں نے رویندر سنگیت میں بھی بڑی کامیابی کے ساتھ ہاتھ آزمائے۔ فلمیں، غزلیں رویندر سنگیت یہ سب تجربے وہ کرتے رہے، لیکن راشد خان کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان کا اصل کمال کلاسیکی گائکی میں ہی ہے۔ انھوں نے اپنی توجہ کلاسیکی موسیقی سے کبھی نہیں ہٹنے دی۔

ایک بار مجھے راشد خان سے ذاتی طور پر بھی ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ دہلی میں انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں آئے ہوئے تھے، جہاں انور جمال نے ان سے میری ملاقات کرائی، انھوں نے بتایا کہ میں این سی ای آر ٹی میں اردو تدریس سے وابستہ ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے، انھوں نے اردو شاعری اور خاص طور سے غزلوں پر کچھ باتیں کیں، پھر انھوں نے بتایا کہ لندن کے معروف رائل البرٹ ہال میں کچھ عرصے بعد ان کا پروگرام ہونے والا ہے۔ اس میں جو لباس پہننے ہیں، اس لباس کی ناپ دینے کے لیے کل لندن جا رہا ہوں۔ خیال آیا کہ اگر لگن سچی ہو تو خدا یہ دن بھی دکھاتا ہے، کہ انسان کپڑوں کی ناپ دینے کے لیے بھی لندن جاتا ہے۔ یہ سب انھوں نے اپنی محنت اور ذہانت سے حاصل کیا تھا۔ اس مقام پر پہنچ کر بھی وہ مجھ سے بڑی خندہ پیشانی سے ملے، شاعری کے بارے میں مزید گفتگو کے وعدے کے ساتھ ہم نے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ پھر کبھی ملنے کا اتفاق تو نہ ہو سکا، لیکن جس گرم جوشی سے انھوں نے ہاتھ ملایا تھا اور ملنے کا وعدہ کیا تھا وہ آج بھی یاد ہے۔

راشد خان جب ہندوستانی موسیقی کے افق پر ابھر رہے تھے، اس وقت استاد بسم اللہ خان، پنڈت روی شنکر، بھیم سین جوشی ولایت خاں، گرجہ دیوی، ضیا محی الدین ڈاگر اور پنڈت جسراج جیسے بڑے بڑے اساتذہ حیات تھے لیکن ان سب کی زندگی کی شام ہو رہی تھی، اس وقت راشد خان فن کی اس بلندی پر نہ سہی، لیکن وہ فن میں پوری مہارت حاصل کر چکے تھے۔ ادب اور فنون لطیفہ میں 60-50 سال کی عمر جوانی کی عمر ہوتی ہے، جب فن اپنے عروج پر پہنچتا ہے، ابھی بہت کچھ آنا باقی تھا، فن کی اس جوانی میں ہی وہ ہم سے دور چلے گئے، اب موسیقی کے مداح حیران بھی ہیں اور مایوس بھی کہ ان کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کون پُر کرے گا؟ کوئی تو ابھر کر آئے گا۔

حواشی

1 https://en.wikipedia.org/wiki/Rashid_Khan_(musician)

2 https://thewire.in/the-arts/classical-musician-rashid-khan-obituary

3 سُمیتا اوجھا، استاد راشد خان، لاگی تو سے نین پریتم، سمالوچن، 14 جنوری 2024

4 https://ustadrashidkhan.com/#achievements

■

Dr Rizvanul Haque
MPD, CIET, NCERT
New Delhi-110016
Mob.: 9977006995
E-mail rizvanul@yahoo.com

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

شاد عظیم آبادی

مصنف: عتیق اللہ

صفحات: 156، قیمت: 95 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: کوثر مظہری، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو شاعری میں اور بالخصوص اردو غزل میں شاد عظیم آبادی کا لہجہ دور سے پہچانا جاتا ہے۔ غزل کے علاوہ دوسری شعری اصناف جیسے کہ مرثیہ نگاری، مثنوی نگاری، رباعی گوئی وغیرہ میں بھی ان کی اہم نگارشات ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ناول بھی لکھا اور مضامین بھی تحریر کیے۔ یعنی ان کی ادبی زندگی کے کئی پڑاؤ ہیں۔ ان کی زندگی اور شخصیت کے بھی متنوع نقوش ہیں، لہٰذا ایسی ادبی شخصیت پر مونوگراف تحریر کرنے کے لیے بھی ایسے ادیب و ناقد کی ضرورت تھی جو کہ ان کے ساتھ انصاف کرسکے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے یہ مونوگراف لکھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ معتبر اور مناسب کوئی دوسرا نام نہیں ہوسکتا تھا جو شاد عظیم آبادی کی شاعری، ناول نگاری، مضمون نگاری اور شخصیت کا خوبصورت تجزیاتی مطالعہ پیش کرسکے۔

عتیق اللہ صاحب نے اس مونوگراف کے لیے جو ابواب اور ذیلی ابواب قائم کیے ہیں ان کی روشنی میں شاد کی گوناگوں شخصیت اور ان کے شعری وفکری امتیازات کو سمجھنے میں بڑی آسانیاں ہوگئی ہیں۔ شاد کے سلسلۂ نسب، تعلیم وتربیت اور خرابیٔ صحت وغیرہ کو محض چھ سات صفحات میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ ایسا ضروری بھی تھا تاکہ شاد کی جو اصل شناخت کے حوالے ہیں یعنی شعری ونثری نگارشات، ان پر پوری توجہ کی جاسکے۔ آئندہ کے صفحات سے اس موقف کی تصدیق بھی ہوجاتی ہے۔ عتیق اللہ صاحب نے شاد کی غزل گوئی کے لیے اس عہد کے دو اہم اور مختلف غزلیہ اسالیب اسلوب اقبال اور اسلوب اکبر کو بھی سامنے رکھا ہے۔ داغ دہلوی اور امیر مینائی کے طوطی بولنے کا بھی حوالہ دیا ہے۔ منیر شکوہ آبادی، جلیل مانک پوری اور تسلیم لکھنوی کے یہاں زبان کے نوک پلک کی درستی اور مناسبتوں کا خیال رکھنے کی بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شاد چونکہ اپنے جملہ غزل گو معاصرین سے زیادہ شعر کی فہم رکھتے تھے اس لیے انھوں نے رسمی مضامینِ غزل کو ادا کرنے کے ایک بے حد صاف ستھرے اسلوب پر توجہ قائم رکھی... وہ خوب جانتے تھے کہ شعر کا کام ان جبلتوں کو حرکت دینا ہے جو عام حالتوں میں انسان کے اندر خوابیدہ رہتی ہیں۔'' (ص 8)

شادعظیم آبادی کی غزلوں میں انسانی جذبات و احساسات کی سچی عکاسی نظر آتی ہے۔ وہ دور کی کوڑی نہیں لاتے۔ عتیق اللہ صاحب نے اپنی تنقیدی بصیرت کی روشنی میں ان کے تخلیقی اظہار اور مضامین شعر کی فطری ہم آہنگی کو نشان زد کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ خود شاعر بھی ہیں، ڈراما نگار بھی ہیں، خاکہ نگار بھی ہیں اور ایک اہم اور نمائندہ نقاد تو ہیں ہی۔ لہٰذا کسی دوسرے شاعر یا ادیب کے متون میں اترنا اور ان سے گہر ہائے تابندہ نکال لے آنا ان کے لیے بہت مشکل نہیں۔ یہاں شاد کی غزلیہ شاعری پر جوان کی قیمتی آرا ہیں وہ سب کی سب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ مختصر مختصر فقرے دیکھ لیجیے:

''شاد نے یہ بھی باور کرایا کہ روایت کسی تجّر وراثت کی منتقلی کا نام نہیں ہے، بلکہ روایت تخلیقی بصیرتوں میں سرایت کر کے بین المتونیت کا سراغ فراہم کرتی ہے۔'' (ص 13)

''شاد کے مضامین شعر میں ان اجزا کی کمی نہیں ہے جو ان کے باطنی اضطراب اور تناؤ کے مظہر ہیں، جو خارجی اور باطنی زندگی کے تصادم کا نتیجہ ہوتا ہے۔'' (ص 15)

عتیق اللہ صاحب نے شاد کی غزل گوئی پر روایتی اور سرسری طور پر اپنے موقف کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ ان غزلیہ اشعار کے باطن میں اتر کر کم از کم شاد کی غزل کے دو رنگوں تک رسائی ضرور حاصل کر لی ہے۔ ایک مونوگراف میں انھوں نے شاد کی غزلوں کو سامنے رکھتے ہوئے جس طرح تجزیاتی انداز میں اپنی تنقیدی بصیرت کا ثبوت پیش کیا ہے وہ کم کم ہی نظر آتا ہے۔ زیادہ تر نقاد تو سیاسی بیان بازی سے کام لیتے ہوئے آگے گزر جاتے ہیں۔ انھوں نے غزل کی روایت کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا موقف پیش کیا ہے کہ اقبال کے عہد ہی میں شاد کی ایسی مثال ہے جو فانی، اصغر، حسرت، یگانہ اور فراق سے پہلے غزل کو از سر نو قائم کر دیتے ہیں۔ شاد کی غزلوں کے دو رنگ میں ایک تو ان کی مابعد الطبیعیات، اخلاقیات اور فلسفۂ الٰہیات سے متعلق رجحانات والا رنگ ہے۔ دوسرا رنگ عشقیہ رموز والے رجحان کو پیش کرتا ہے۔ دونوں ہی رنگوں کے ذیل میں عتیق اللہ صاحب نے اشعار پیش کر کے اپنی موقف کو مستحکم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''شاد کی غزل کی کل جمع پونجی یہی درویشانہ سادگی، تفکر آمیز اداسی اور ذہنی اور جذباتی کشاکش نہیں ہے۔ تصویر کے اس دوسرے رخ پر غور کیے بغیر شاد فہمی کا حق ادا نہیں ہو سکتا جس کی معاملات حسن و عشق کے شوخ رنگوں سے تشکیل ہوئی ہے۔'' (ص 22)

شاد کا یوں تو اردو غزل میں ایک نمایاں مقام ہے لیکن انھوں نے دوسری متداول اصناف سخن میں بھی اچھی خاصی نگارشات چھوڑی ہیں۔ اسی لیے عتیق اللہ صاحب نے 'شاد اور متفرق اصناف سخن' کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے جس کے تحت شاد کی مرثیہ نگاری، مثنوی نگاری، رباعی گوئی اور قطعہ گوئی کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ شاد نے اپنی زندگی کے مختلف تجربات و مشاہدات کو مختلف اصناف سخن میں الگ الگ انداز میں پیش کیا ہے۔ یعنی شاد کسی ایک صنف کے شاعر نہیں ہیں۔ اس لیے شاد کے فکر و فن کو سمجھنے کے لیے ان کی متنوع تخلیقی اصناف کا مطالعہ ضروری ہے۔ عتیق اللہ صاحب نے اسی لیے تو لکھا ہے کہ ''شاد کے یہاں زندگی اپنی کلیت میں اظہار پاتی ہے۔'' (ص 47)

شاد کی نثری تصانیف میں عتیق اللہ صاحب نے ان کے تذکرے فکر بلیغ، ناول، صورت الخیال عرف ولایتی کی آپ بیتی، شاد کی کہانی شاد کی زبانی (خود نوشت)، حیاتِ فریاد (استادِ شاد فریاد عظیم آبادی کی سوانح عمری) اور مکتوب نگاری وغیرہ کو اپنے مطالعے کا حصہ بنایا ہے۔ جس کتاب یا صنف کے حوالے سے مطالعہ پیش کیا گیا ہے، لگتا ہے کہ وہی اہم حصہ ہے، یہ عتیق اللہ صاحب کی تنقیدی بصیرت کا کمال ہے۔ انھوں نے کسی بھی گوشے کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ ساتھ ہی، ہر جگہ تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیقی رنگ بھی نظر آتا ہے۔

آخر میں اپنے پورے مطالعۂ شاد کا نچوڑ بھی مطالعات شاد کا حاصل جمع اور حاصل کلام پیش کیا ہے اور پھر نثری اور شعری نمونے دیے گئے ہیں۔ شاد کے مونوگراف کو پڑھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عتیق اللہ صاحب نے شاد کی زندگی، شخصیت اور تخلیقات کو پوری طرح اپنے باطنی اور تخلیقی و تنقیدی شعور سے ہم آہنگ کرنے کے بعد ہی یہ کتاب تصنیف کی ہے۔ یوں بھی ان کا ادبی سفر بہت ہی تابناک اور توانا رہا ہے اور اسی لیے کہیں بھی کسی طرح کا ایسا Gap نظر نہیں آتا جس پر کوئی انگشت نمائی کر سکے۔ میرا تو ماننا ہے کہ شاد فہمی میں یہ مونوگراف ایک مشعل ہے جس سے تمام تر تاریکیاں دور ہو سکتی ہیں نیز شاد اور شاد کا تخلیقی چہرہ بہت ہی شفاف اور شگفتہ نظر آسکتا ہے۔

قومی کونسل نے عتیق اللہ صاحب سے شاد پر مونوگراف لکھوا کر ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ کسی بھی اسکالر یا استاد کے لیے شاد فہمی میں دلچسپی لیتے ہوئے اس مونوگراف کا مطالعہ لازمی ہوگا۔

نظری تنقید: مسائل و مباحث

مرتبہ: عفت آرا
صفحات: 233، قیمت: 125 روپے، سنہ اشاعت: 2022
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال
N-93، فورتھ فلور، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 25

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے کہ ''نظری تنقید میں اصولوں کی بحث ہوتی ہے یعنی اس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ادب اور آرٹ کیا ہیں؟ ان کی اہمیت اور ضرورت کیا ہے؟ ان کا حسن کاری سے کیا تعلق ہے؟ ان کو زندگی کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہیے یا نہیں۔''

اس کی روشنی میں جب زیر نظر کتاب 'نظری تنقید: مسائل و مباحث' جو پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے مضامین کا مجموعہ ہے اور جس کو پروفیسر عفت آرا نے مرتب کیا ہے، کا جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اعلیٰ ادب اور اس کی تنقید سے نہ صرف فنکار کے ذاتی میلانات کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نظری اور عملی تنقید کے بغیر ہمارے لیے کسی فن پارہ کو سمجھنا ایک مشکل امر ہے، اس کتاب میں 22 مضامین شامل کیے گئے ہیں جن میں شعری صداقت، سائنٹفک نظریۂ تنقید، ادبی تاریخ اور ادبی تنقید، تخلیق اور تنقید، اردو میں تنقید نگاری کی روایت، تنقیدی تجزیہ کے تین بنیادی عناصر، اسطوری تنقید، اور ترقی پسند ادب اور تنقید جیسے اہم مضامین اپنے موضوعات کے اعتبار سے وسیع اور متنوع ہیں۔

کتاب کی مرتب پروفیسر آرا نے یہ لکھا ہے کہ اردو فکشن میں اسلوب صاحب کی دلچسپی پر بھی بطور خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے ایک جگہ لکھا ہے:

''ادبی تاریخ سے ہٹ کر جب ہم ادبی تنقید کا رخ کرتے ہیں تو ہمیں فوراً یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم باہر کی دنیا سے سفر کر کے اندر کی دنیا میں آگئے ہیں۔ ادبی تنقید ادبی تاریخ نگاری کا ضمیمہ نہیں ہے، بلکہ دونوں جداگانہ حیثیت کی مالک ہیں اور ایک دوسرے کا تکملہ کرتی ہیں۔ وہ سب امور جو تاریخ نگاری میں مسلمات کا درجہ رکھتے ہیں یا مرکزی کہے جا سکتے ہیں ادبی تنقید نگاری میں فروعی حیثیت رکھتے ہیں۔''

انھوں نے اپنی بات کو بڑے معروضی انداز میں سمجھاتے ہوئے یہ بتانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ ادبی تاریخ اور ادبی تنقید اپنے اپنے مقام پر اپنا انفراد رکھتی ہیں۔ان کے نظریات کے پس منظر میں تجربات اور ان کے متعلقات کو سمجھنے کے لیے ہر ایک کو اس کے توسیع پسندانہ اور منفرد انداز میں سمجھے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔

نقاد کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اس کا مطالعہ وسیع ہو اور اپنی زبان و ادب کے علاوہ دیگر زبانوں کے ادب پر بھی اس کی گہری نظر ہو۔مختلف علوم سے بڑی حد تک واقف ہو اور جو موضوع اس کے زیر قلم ہے اس پر اسے عبور بھی حاصل ہو۔

تنقید نگار یہ بھی دیکھتا ہے کہ فن پارے میں جن تجربات کی عکاسی کی گئی ہے یا جس موضوع پر اظہار خیال کیا جا رہا ہے، اس کی کتنی اہمیت ہے اور جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس میں کوئی نئی بات پیش کی جا رہی ہے یا نہیں۔

اس حوالے سے جب ہم پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی تنقیدوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہماری آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں کہ انھوں نے تنقید کے میدان میں کیسے کیسے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

کتاب میں شامل مضمون 'نثر کا آہنگ' میں پروفیسر انصاری لکھتے ہیں ''اچھی اور معیاری نثر چونکہ خیال کو پیش کرنے، ذہنی اتفاق اور ہمراہی کو حاصل کرنے اور اعصاب پر چھا جانے کی بجائے عقلی سطح پر ترغیب دلانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے، اس لیے اس کے لیے ایک منطقی سانچے کی ضرورت ہوتی ہے، جس میں اس کے مقدمات کامل ہم آہنگی کے ساتھ جگہ پا سکیں۔ وہ سوچنے کے انداز میں وضاحت پیدا کرتی ہے اور بیان کے حدود کو واضح اور روشن طور پر سامنے لاتی ہے اس لیے اس میں حشو و زوائد اور غیر ضروری تفصیلات سے احتراز پایا جاتا ہے۔''

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جب نثر اعلیٰ شان والی ہوگی، اسی وقت اس پر معیاری تنقید بھی ہو سکے گی۔ ورنہ تنقید کا دامن خالی رہے گا اور یہ بات تنقید کے اصولوں اور مباحث کے خلاف قرار پائے گی۔

اپنے ایک اور مضمون جو کتاب میں شامل ہے 'تشریح اور تعبیر کا فن' میں پروفیسر انصاری رقم طراز ہیں ''ادبی تنقید ادبی فن پارے کی بازیافت بھی ہے اور تشکیل نو بھی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مطالعے کے دوران قاری یا نقاد متن سے اس حد تک سروکار رکھے کہ وقتی طور پر اس سے کامل ہم آہنگی پیدا کرے۔ گو انتقادی عمل کے دوران ادبی فن پارے میں جتنا مدغم ہونا ضروری ہے، اتنا ہی محاکے میں اور پایانِ کار اس سے دوری اور لاتعلقی بھی۔ (یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ) خارجی زندگی کے کوائف فن پارے میں براہِ راست دخیل نہیں ہوتے۔''

مصنف اپنی بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ کوئی بھی فن پارہ اس وقت تک دلوں میں جگہ نہیں بنا سکتا جب تک اس میں فن کی چاشنی اور زبان و ادب کی شیرینی نہ ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ اور نظر سے نظر ملا کر چلنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ شاعر و ادیب کا کمال یہ بھی ہونا چاہیے کہ وہ فن پارے میں دلی جذبات و احساسات کو اس طرح برتے کہ وہ فن پارہ جو بھی دیکھے اور پڑھے اس کے دل میں نہ صرف گھر کرتا چلا جائے بلکہ کتاب کے صفحوں پر ایسے نقوش مرتسم کر دے کہ وہ تادیر ذہنوں اور دماغوں سے محو نہ ہو سکیں۔

اگر ہم اردو تنقید و ادب کی ابتدائی کتاب صرف 'مقدمہ شعر و شاعری' کے حوالے سے بات کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ حالی نے نہ صرف غزل کی اصلاح کی کوشش کی بلکہ خود بھی اپنی غزل گوئی کے ذریعے اردو شاعری کو ایسے نمونوں سے مالا مال کیا جو ان کے اصولوں پر پورے اترتے تھے، اور ان کی تمام شاعری ان تمام نظریات کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے جو انھوں نے اپنے 'مقدمہ شعر و شاعری' میں پیش کیے ہیں۔ پھر اسی پر تنقید کے اصول و مباحث کی عمارت تعمیر کی گئی اور نئی تنقید کی عمارت اپنے بلند و بالا تصور نقد کے سبب سنہری دور میں داخل ہو گئی۔

پروفیسر انصاری کے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تخلیقی فن پارے ایک نوع کے آزادانہ عضوی کل ہوتے ہیں، جن کی تفہیم اور گرہ کشائی تنقید نگار کا وظیفۂ خاص ہے۔

امید ہے پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی دوسری تحریروں کی طرح یہ کتاب بھی قبول عام کی سند حاصل کرے گی اور اساتذہ اور ریسرچ اسکالروں کے لیے ایک اہم تحفہ ثابت ہوگی۔

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا
نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔
صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

تحقیق و تنقید

اظہار خیال

مصنف: نسیم احمد نسیم
صفحات: 244، قیمت: 250 روپے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: ڈاکٹر خان محمد رضوان، D-377 ایم ایم پبلی کیشنز، جامعہ نگر نئی دہلی 25

اردو تنقید و تحقیق کے معیار و اسلوب کو بیسویں صدی کے نصف آخر کے بعد جن نقادوں نے خون جگر سے آبیاری کی ہے ان میں ایک اہم نام ڈاکٹر نسیم احمد نسیم کا ہے۔ اکیسویں صدی کی ابتدا میں ادب کی شناخت اور قدیم ادبی روایت کے انسلاکات کو مستحکم کرنے کے لیے معتدل رویے کی بنیاد ڈالنے اور اس کی آبیاری کرنے والوں میں ڈاکٹر نسیم احمد کا نمایاں کردار رہا ہے۔ آپ نے تنقید و تحقیق اور فکشن کی روایت پر بنیادی کام کیا اور اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔ یوں تو آپ نے تقریباً تمام اصنافِ ادب پر خامہ فرسائی کی ہے مگر تحقیق و تنقید ان کا اصل میدان ہے۔ ڈاکٹر نسیم احمد معتدل نقاد اور منفرد طرزِ اسلوب کے ادیب ہیں۔ آپ ادب کے پارکھ اور زبان کے رمز شناس ہیں، ان کے ادبی خطبات اور لیکچرس سے ان کی زبان دانی اور طلاقت لسانی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی زبان پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی شستہ اور سہل زبان دبستان عظیم آباد کی مخصوص اور پر تکلف زبان کی یاد تازہ کرتی ہے۔ ان کی مرنجاں مرنج شخصیت کا امتیازی پہلو بے ضرری اور بے نیازی ہے۔ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم کی تحریر کا امتیازی وصف، سادہ اور سلیس لفظیات کے دلکش استعمال اور پرکشش ادبی زبان کے برتاؤ کے ساتھ امیجری پیرایہ بیان کی ساحری بھی ہے۔ ان کا انتقادی پہلو تنقید کو پیچیدگیوں، ناہمواریوں اور مشرق و مغرب کے روایتی اور غیر فطری نظریات سے باہر نکال کر تنقید کے اصل جوہر سے آشنا کرانا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کا انتقادی مطمحِ نظر مسلم الثبوت، مستند اور غیر محقق نکات کی تہہ تک رسائی کر کے راس الاصل تک پہنچنے سے عبارت ہے۔ انھوں نے اب تک جن موضوعات پر لکھا ہے وہ غیر روایتی نوعیت کے ہیں۔ اس امر کا بخوبی اندازہ ہمیں ان کی کتاب 'نیپال میں اردو زبان و ادب' (تحقیق)، بہار میں اردو افسانہ: تنقیدی جائزہ، 1960 کے بعد اردو افسانہ (تنقیدی مطالعہ)، غیاث احمد گدی (مونوگراف، ساہتیہ اکیڈمی)، رمز عظیم آبادی (مونوگراف، راج بھاشا بہار) ایجاب وانحراف (تنقید وتحقیق) اور تنقیدی جہات کو پڑھ کر ہوتا ہے۔

ان کی تازہ ترین کتاب 'اظہار خیال' میں تقریباً دو درجن مضامین شامل ہیں۔ ان کی خاص بات یہ ہے کہ نثر و نظم کی اہم ترین شخصیات اور ان کے فن پر لکھے گئے ہیں۔ اہم ترین شخصیات میں امداد امام اثر کا انتقادی اختصاص، رامائن کا منظوم اردو ترجمہ، فلسفہ مارکسیت اور پروفیسر وہاب اشرفی، نیپالی ادب پر اردو کے اثرات، 1960 کے بعد مغربی بنگال میں اردو فکشن، جدیدیت، مابعد جدیدیت: چند باتیں، اردو میں جمالیاتی تنقید اور پروفیسر شکیل الرحمٰن، 1857 اور سرسید کا نظریہ تعلیم، مابعد جدیدیت اور اردو ادب، علامہ شوق نیموی کی غزلیہ شاعری، آپ بیتی اختر حسین رائے پوری، لطف الرحمٰن کی نظمیہ شاعری، ڈاکٹر کلیم عاجز کی نثری خدمات، اردو شاعری میں مہاتما گاندھی، رمز عظیم آبادی کی غزلیں، اردو اور بھوجپوری کا لسانی اور ادبی رشتہ اور غیاث احمد گدی کی خطوط نگاری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

متذکرہ بالا عنوانات سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم کا فکری اور لسانی منطقہ کس قدر وسیع اور متنوع ہے۔ یہ بڑی سچائی ہے کہ لسانیات پر بحث کرنا وادیِ غیر ذی زرع میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے کسی طور کم نہیں اسی طرح تحقیقی اور تنقیدی نظریات کا واضح اظہار پر خطر وادی میں یکہ وتنہا سفر کرنے کے مرادف ہے۔ اس کے باوجود اگر کسی ادیب کے ادبی سفر کا منہجِ اولین ہی اپنے نظریات وخیالات کی پرورش، ہوش مندی اور دانشمندی سے کرنا قرار پائے تو یہ اہم بات ہے اور ڈاکٹر نسیم نے یہی کیا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے خیالات کا برملا اظہار دلائل وبراہین کے ساتھ کیا ہے۔ اسی اختصاص اور پرفیکشن کی وجہ سے ماہرینِ ادب اور اردو کے مستند ناقدین نے انھیں خاطر خواہ سراہا ہے اور غیر رسمی طور پر پذیرائی بھی کی ہے۔ ادب یا ادبی اظہار میں سب سے زیادہ اہمیت مدلل گفتگو اور مستند تحقیقی رویے کا ہوتا ہے جو ہمیں ڈاکٹر نسیم کے یہاں بخوبی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی کتاب 'اظہار خیال' اس کا بین ثبوت ہے اگر ہم اس کے مضامین کا غائر مطالعہ کریں تو محسوس ہوگا کہ انھوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت و فطانت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے بیشتر مضامین میں عرق ریزی کے ساتھ متقدمین ادبا کے فکری اور تحقیقی وتنقیدی رویے پر مبسوط اور مدلل گفتگو کی ہے۔ ان کا تنقیدی اور استدلالی رویہ کسی بھی طرح کے ابہام و اغلاق سے پاک ہے۔

یہ کتاب ڈاکٹر نسیم احمد صاحب کے افکار وخیالات کے ساتھ ان کے نظریہ ادب کو سمجھنے میں بھی میں معاون ثابت ہوگی۔ میں اس گرانقدر مجموعہ کے مصنف کو صمیم قلب سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ ساتھ ہی پرکشش طباعت کے لیے عرشیہ پبلی کیشنز کو بھی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ امید ہے یہ کتاب بھی ان کی دیگر کتابوں کی طرح مقبول ہوگی اور ادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

میں سلسلہ ہوں صداؤں کے حرف بننے کا

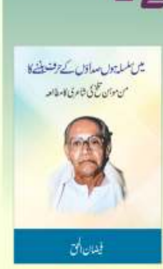

(من موہن تلخ کی شاعری کا مطالعہ)
مصنف: فیضان الحق
ضخامت: 232 صفحات، قیمت: 400 روپے
ناشر: عذرا بک ٹریڈرس، نئی دہلی
مبصر: عبدالوارث
روم نمبر 52، سابرمتی ہاسٹل، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی 67

نئی نسل کے قلم کاروں میں فیضان الحق کا نام نمایاں ہے۔ انھوں نے جے این یو سے ایم اے کیا اور اس کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ایم فل اور پھر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ حالیہ دنوں میں فیضان الحق کی تازہ ترین کتاب 'میں سلسلہ ہوں صداؤں کے حرف بننے کا' منظر عام پر آئی ہے۔ اس کتاب میں جدید شاعر من موہن تلخ کی شخصیت اور ان کی شاعری کا نہایت باریک بینی سے تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب سے قبل موصوف کی دو کتابیں بعنوان 'انور عظیم کی ادبی کائنات' (تنقید) مطبوعہ: انجمن ترقی اردو، ہند (2023) اور 'کلکتے کا جو ذکر کیا' سفر نامہ (2020) شائع ہو چکی ہیں۔ موصوف کا یہ وتیرۂ خاص رہا ہے کہ جب بھی وہ کسی کام کا قصد کرتے ہیں تو اس کو نہایت سنجیدگی اور دل جمعی سے انجام تک پہنچاتے ہیں۔ اس کی واضح اور عمدہ مثال من موہن تلخ کی شاعری کے تنقیدی مطالعہ پر مبنی کتاب 'میں سلسلہ ہوں صداؤں کے حرف بننے کا' اور انور عظیم کی سوانح، شخصیت اور ان کی تمام تحریروں وتراجم کے مطالعے پر مبنی کتاب 'انور عظیم کی ادبی کائنات' ہیں۔ فی الوقت میری توجہ کا مرکز 'میں سلسلہ ہوں صداؤں کے حرف بننے کا' ہے۔ جس میں نئی غزل

کے نمائندہ شاعر من موہن تلخ کی شعری انفرادیت کو دریافت کرنے کی عمدہ کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کا عنوان من موہن تلخ کے ہی اس معنی خیز شعر سے ماخوذ ہے۔

میں سلسلہ ہوں صداؤں کے حرف بننے کا
تو سوچ کر ہی دوبارہ صدا بنا مجھ کو

استاد الاساتذہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر شافع قدوائی اور محترم حقانی القاسمی جیسے معتبر ناقدین کے تاثرات اس تنقیدی و تحقیقی کتاب کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرتے ہیں۔ آپ سب نے کتاب کو نہ صرف اہم قرار دیا ہے بلکہ فیضان الحق کی تنقیدی بصیرت کو بھی سراہا ہے۔ کتاب کے شروع میں من موہن تلخ کا سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے، جس میں تلخ کے متعلق تمام اہم معلومات کو جمع کر دیا گیا ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ 'من موہن تلخ: سوانح، شخصیت اور عہد' ہے، جس میں پیدائش سے لے کر وفات تک شاعر کی ذاتی زندگی سے متعلق تمام احوال و کوائف درج ہیں۔ 'تلخ' تخلص اختیار کرنے کا سبب، ابتدائی تعلیم و تربیت، ہجرت، صحافت، مختلف اخبار و رسائل سے وابستگی، ترجمہ نگاری، کالم نگاری، معاصر ادبی معاشرہ اور اہم ادبا و شعرا سے تلخ کے تعلقات پر تحقیقی و تنقیدی بصیرت کو بروئے کار لاتے ہوئے بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

جیسا کہ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ من موہن تلخ نے اپنا تخلص 'تلخ' اسرار الحق مجاز کے کہنے پر اختیار کیا۔ تلخ نے ابتدا میں احمق پھپھوندوی اور جوش ملسیانی جیسے کہنہ مشق شعرا سے اصلاح لی لیکن تلخ کی تلخ مزاجی کو یاس یگانہ چنگیزی جیسا موقر استاد ہی موزوں تھا۔ لہٰذا انھوں نے بڑی آرزوؤں اور کوششوں کے بعد یاس یگانہ چنگیزی کی شاگردی حاصل کی اور اخیر وقت تک ان سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ فیضان الحق نے اس کتاب میں 'من موہن تلخ اور یاس یگانہ چنگیزی' کے عنوان سے ایک مستقل باب قائم کیا ہے، جس میں تلخ کی یاس یگانہ چنگیزی سے پہلی ملاقات، دونوں کی قربت، استاد اور شاگرد کا باہمی رشتہ، ادبی معاملات، مختلف امور میں صلاح و مشورہ اور قلبی تعلق کو دونوں کے مابین خط و کتابت اور تلخ کے کالم کی روشنی میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور تمام حقائق کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں مصنف کی تحقیقی کاوش قابل تحسین ہے۔ انھوں نے تلخ اور یگانہ کے درمیان تعلق کی جن بنیادوں کو مدلل طریقے سے واضح کیا ہے، وہ اس سے قبل پردۂ خفا میں تھیں۔ اس مضمون کا مطالعہ کرنے کے بعد پہلی دفع تلخ اور یگانہ کے تعلقات کی نوعیت سے واقفیت ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تلخ کو اپنے استاد سے قلبی لگاؤ تھا۔ اس کا ایک ثبوت ان کی نظم بعنوان 'آہ یگانہ' اور مندرجہ ذیل رباعی ہے، جو انھوں نے اپنے استاد کی رحلت پر کہی تھی۔

اس عمر پہ یوں موت تری کیا ہے عجب   اے یاس و یگانہ ترا مرنا ہے غضب
یوں جان پڑا جیسے کوئی یہ کہہ دے   مینار قطب گر گیا ہے کل شب

کتاب کے تیسرے باب میں تلخ کی غزل گوئی کے انفرادی پہلوؤں پر بہت باریکی سے نظر ڈالی گئی ہے۔ اس حصے کا مطالعہ کرتے ہوئے تلخ کی مختلف شعری جہات سے واقفیت ہوتی ہے اور مصنف کی سنجیدہ و مرتکز قرأت کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ اس مضمون میں تلخ کی شاعری کے غالب موضوعات کے ساتھ ان کی زبان واسلوب کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

اس کے بعد تلخ کی شاعری کے اہم پہلوؤں پر الگ الگ عنوانات کے تحت تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اور تلخ کی غزلوں میں موجود صدا، آواز، چپ، خاموشی، سکوت، سماعت، گاؤں، بستی، شہر، گھر، یاس، اداسی اور کھنڈر' جیسے کلیدی الفاظ پر خاصا غور کیا گیا ہے اور ان لفظوں کے لغوی و اصطلاحی معانی کے ساتھ ان کے تخلیقی رویوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف نے مختلف اوقات میں کہے گئے اشعار پر گفتگو کرتے ہوئے مضمون میں ایک نامیاتی اور ارتقائی صفت پیدا کر دی ہے اور ان کے درمیان ربط کو قائم رکھتے ہوئے اصل مفہوم تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

من موہن تلخ نے غزلوں کے ساتھ ساتھ کچھ عمدہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ یہ نظمیں ابتدائی تین مجموعوں میں شامل ہیں۔ مصنف نے ان تمام نظموں کا مطالعہ نہایت عرق ریزی سے کیا ہے اور ان کا تفصیلی تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ تلخ کی طویل نظم 'بیگانہ و تنہا' پر ایک الگ باب کے تحت تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ شامل ہے۔ جس میں ایک تخلیق کار کی ذہنی تنہائی کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب میں من موہن تلخ کی غزلوں اور نظموں کے علاوہ ان کی رباعیات (جن کی تعداد 38 ہے) پر بھی مفصل اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اور مصنف نے ان کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تلخ کی رباعیات گرچہ کم ہیں لیکن فنی اعتبار سے ان میں پختگی موجود ہے۔ البتہ موضوعات کی سطح پر رباعیات بھی غزلوں اور نظموں سے قریب ہیں۔

اخیر میں من موہن تلخ پر لکھے گئے تنقیدی مضامین اور تلخ کے ناقدین کی آرا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ موجودہ زمانے کے ہمارے ناقدین نے من موہن تلخ سے بے اعتنائی برتی اور ان کی وفات کے ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بھی انھیں یاد نہیں کیا گیا، جب کہ ہماری ادبی تاریخ کے اہم ناقدین شمس الرحمٰن فاروقی، نثار احمد فاروقی، محمد حسن، شمیم حنفی، خلیق انجم، شارب ردولوی اور عتیق اللہ وغیرہ جیسے بزرگوں نے تلخ کی شعری انفرادیت کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اسے جدید اردو غزل کی روایت میں ایک منفرد اور معتبر آواز کے طور پر محسوس کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس کی شاعری کی مطالعے کی ضرورت وقت کے ساتھ بڑھتی جائے گی۔ اس طرح فیضان الحق نے ناقدین کے خیالات کا جائزہ لے کر تلخ کی شاعری کے مطالعے کو وسعت عطا کر دی ہے۔

کتابیات کے علاوہ کتاب کا ایک اہم اور آخری حصہ 'اشاریہ' ہے۔ اس کے تحت مصنف نے کتاب میں مذکور تمام شخصیات کی فہرست مرتب کرتے ہوئے ان کے نام کے آگے صفحہ نمبر بھی درج کر دیا ہے۔ جس سے قاری اگر کسی بھی نام کے متعلق مواد تک پہنچنا چاہے تو بہ آسانی پہنچ سکتا ہے۔ چھ صفحات پر مشتمل اس اشاریے میں تقریباً 112 شخصیات کے نام شامل ہیں، جن کا ذکر کسی نہ کسی حوالے سے کتاب میں موجود ہے۔ اشاریہ کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مصنف نے اس کتاب میں گرچہ من موہن تلخ کو اپنی گفتگو کا مرکزی حوالہ بنایا ہے لیکن متعدد شعرا و ادبا بھی اس گفتگو کا حصہ رہے ہیں، جس سے تلخ کے ادبی انسلاکات کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس طرح اپنے مشمولات اور باریک بینی کے ساتھ کیے گئے تنقیدی مطالعات کے سبب فیضان الحق کی یہ کتاب تلخ شناسی کے حوالے سے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

تاریخ

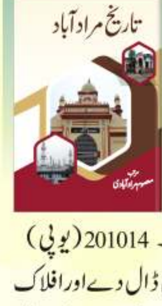

تاریخ مراد آباد

مرتب: معصوم مرادآبادی

صفحات: 440، قیمت: 600 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: خبردار پبلی کیشنز، 1/45، للتا پارک، لکشمی نگر، دہلی 110092

مبصر: سراج نقوی، A-101، ایسٹ ایونیو، (شانتی بھوپال اسپتال کے پیچھے)، اہنسا کھنڈ-2، اندراپورم، غازی آباد۔ 201014 (یوپی)

دنیا ترقی کی خواہ کتنی ہی منازل طے کر لے، چاند پر کمندیں ڈال دے اور افلاک کو گرد راہ بنا دے یا پھر افتخار عارف کی طرح 'شکم کی آگ' اسے شہر بہ شہر ہجرت کے لیے

مجبور کر دے، لیکن اپنی زمین اور اپنے وطن سے وابستگی کی کسی نہ کسی شکل میں خواہش دنیا کے تقریباً ہر فرد میں موجود رہتی ہے۔ یہ خواہش ہی اسے تاریخ نویسی کا شعور بخشتی ہے، اور یہی خواہش اسے اپنے اسلاف اور اپنی سرزمین پر فخر کرنے اور اس سے جذباتی تعلق کا وہ احساس بھی دیتی ہے جسے ہم انگریزی میں Nostalgia بھی کہتے ہیں۔

مراد آباد سے تعلق رکھنے والے مشہور صحافی اور عزیز دوست معصوم مراد آبادی کی اہم قلمی کاوش 'تاریخ مراد آباد' اسی جذبے کا عالمانہ اور محققانہ اظہار ہے۔ عرض مرتب میں فاضل مرتب نے لکھا ہے ''میں جس شہر میں پیدا ہوا، جہاں میں نے آنکھ کھولی،، اپنا بچپن اور لڑکپن گزارا، اس کی تاریخ، تہذیب اور تمدن کے بہت سے پہلوؤں کو میں نے اپنی طفلانہ نظروں سے دیکھا۔ میری شدید خواہش تھی کہ اس شہر کی تاریخ وتہذیب کو ان لوگوں کی نگاہ سے بھی دیکھوں جنھوں نے یہاں کی معاشرت، تہذیب وتمدن اور ثقافت کو مالا مال کیا۔'' یہی سبب ہے کہ معصوم مراد آبادی نے 'تاریخ مراد آباد' میں نہ صرف اپنے بلکہ دیگر مستند قلم کاروں کے بھی ایسے مضامین کو یکجا کر دیا ہے جو اس تاریخی شہر کی تہذیب، ثقافت، ادب اور سیاست جیسے اہم موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں اور اس شہر کو ماضی کے حوالے سے بہتر طور پر سمجھنے میں مدد کرتے ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے خطہ روہیل کھنڈ کا یہ شہر جتنا اہم ہے اتنا ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم اپنی ثقافتی اور سیاسی تاریخ کے اعتبار سے ہے، اپنی ادبی وتہذیبی تاریخ کے اعتبار سے ہے۔ اس شہر نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ہندوستان ہی نہیں بلک دنیا کو ایسے گوہر نایاب دیے ہیں کہ جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ مراد آباد کی تاریخ کا وہ پہلو ہے کہ جس سے ملک کے بیشتر دانشور، قلم کار اور ادیب واقف ہیں۔ جبکہ معصوم مراد آبادی کی زیر تبصرہ کاوش کا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ اس شہر کی ایسی بہت سی شخصیات سے بھی متعارف کراتی ہے جن کا اس شہر کو چار چاند لگانے میں اہم رول تو رہا لیکن ان کی خدمات پر زیادہ کچھ نہیں لکھا گیا۔ اس اعتبار سے معصوم مراد آبادی کی 'تاریخ مراد آباد' ایک محققانہ کاوش بھی ہے۔ 'تاریخ مراد آباد' میں اس شہر کے ایسے بہت سے اہم پہلوؤں کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جو اسے 'پیتل نگری' سے الگ اور ایک تہذیبی وثقافتی بستی کے طور بھی بہتر ڈھنگ سے سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔ 'تعارف' کے عنوان سے سپردِ قلم کی گئی اپنی تحریر میں معصوم مراد آبادی نے اس طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

'تاریخ مراد آباد' مجموعی طور پر کل چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلے باب کا عنوان بھی 'تاریخ مراد آباد' ہے۔ اس باب میں کل پانچ مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ پہلا مضمون مشہور شاعر، ادیب اور صحافی مرحوم تاباں امروہوی کا ہے۔ جس وقت تاباں امروہوی نے یہ مضمون تحریر کیا تھا، اس وقت امروہہ ضلع مراد آباد میں ہی شامل تھا۔ اس مضمون کا عنوان بھی 'تاریخ مراد آباد' ہی ہے۔ اس مضمون کو مرتب نے کلیدی حیثیت دیکر شامل اشاعت کیا ہے اور چند سطور میں تاباں امروہوی کا تعارف بھی پیش کیا ہے۔ اس تفصیلی مضمون میں مراد آباد کی سیاسی تاریخ کے ساتھ یہاں کی اہم شخصیات کا بھی مختصر الفاظ میں تعارف پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا مضمون دراصل مشہور عالم ناول نگار، افسانہ نگار وادیبہ قرۃ العین حیدر کی معرکتہ الآرا آپ بیتی 'کار جہاں دراز ہے' کے ان اقتباسات پر مشتمل ہے کہ جن میں مراد آباد کا تفصیلی ذکر ہے۔ 'لانکڑی والاں' کے عنوان کے تحت اس مضمون میں سادات کے اس محلے یعنی لانکڑی والاں کے دور شاہجہانی اور بعد کے دور کے کچھ سیدوں کا ذکر ہے۔ مراد آباد میں عہد مغلیہ اور نوابین اودھ کے دور کے بہت سے واقعات اور اہم شخصیات کا ذکر بھی اس مضمون میں ہے۔ اس سے اس دور کے حالات اور سیاست کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

دو مضامین ڈاکٹر محمد آصف حسین کے ہیں۔ پہلا 'جامع مسجد مراد آباد' اور دوسرا 'شہزادہ مراد بخش رستم خاں' کے عنوان سے ہے۔ دونوں ہی مضامین اس شہر کی تاریخ کے کچھ خاص پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ آخر الذکر مضمون میں جس رستم خاں کا ذکر ہے مراد آباد کو بسانے کا سہرا اسی کے سر ہے جبکہ شہزادہ مراد بخش شاہجہاں کا بیٹا تھا جس کے نام پر رستم خاں نے یہ شہر بسایا۔ 'مراد آباد: تاریخ کے جھروکوں سے' کے عنوان سے پانچواں مضمون افضال الرحمٰن کا ہے۔ مضمون میں مغلوں کے دور اقتدار سے انگریزوں کے دور اقتدار تک کی سیاسی اتھل پتھل کو بہت جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی مضمون میں مراد آباد کے قاضی صاحبان، مراد آباد کے صوفیا اور مراد آباد کی چند اہم شخصیات کے ذیلی عنوانات قائم کر کے اس شہر کی سماجی زندگی کو متاثر کرنے والی اہم شخصیات کا ذکر شامل کیا گیا ہے۔ مراد آباد کی پرانی عمارتوں پر بھی مختصر الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب دوم 'جنگ آزادی اور مراد آباد' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں خورشید مصطفیٰ رضوی، مولانا امداد صابری، ڈاکٹر محمد آصف حسین، حماد احمد ایڈووکیٹ اور مولانا اشفاق حسین قاسمی کے مضامین شامل ہیں۔ ان میں بھی اول الذکر دونوں قلم کاروں کے مضامین اس اعتبار سے کلیدی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان میں خورشید مصطفیٰ رضوی کے مضمون میں 1857 کی تحریک آزادی میں مراد آباد کے رول کا کافی تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے، جبکہ مولانا امداد صابری کے مضمون 'شہیدان وطن مراد آباد' میں مراد آباد سے تعلق رکھنے والے چار اہم شہیدان وطن کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چار مضامین الگ الگ شہیدان مراد آباد سے متعلق ہیں۔ حماد احمد اور مولانا اشفاق حسین قاسمی کے مضامین میں سے اول الذکر مراد آباد کے مجاہدین آزادی کا مجموعی طور پر احاطہ کرتا ہے، اور آخر الذکر 'تحریک آزادی میں وابستگانِ شاہی کا کردار' کے اہم موضوع سے متعلق ہے۔ اس باب کے تمام ہی مضامین مراد آباد کی تاریخ کا ایسا درخشاں باب قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ جن سے واقفیت نہ صرف اہل مراد آباد بلکہ تحریک آزادی کی تاریخ کو گہرائی سے سمجھنے کے خواہش مند ہر قاری کے لیے ضروری ہے۔

باب سوم 'سرسیّد اور مراد آباد' سے متعلق ہے۔ سرسید کے تعلق سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ موصوف کا مراد آباد سے قریبی تعلق رہا ہے۔ معصوم مراد آبادی نے ہندوستانی مسلمانوں کو اے ایم یو کی شکل میں تعلیمی انقلاب کا تحفہ دینے والی سرسید جیسی شخصیت کا مراد آباد کے حوالے سے جائزہ لے کر نہ صرف مراد آباد بلکہ دنیا بھر میں سرسید کے مداحوں کے سامنے ان کی شخصیت کا ایک اہم رخ پیش کر کے قابل قدر کام کیا ہے۔ اس باب میں مولانا الطاف حسین حالی، افتخار عالم خاں، ڈاکٹر حسن احمد نظامی، پروفیسر اصغر عباس اور ڈاکٹر محمد آصف حسین کے مضامین شامل ہیں۔ پروفیسر اصغر عباس کے تعلق سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ موصوف کا سرسید کے تعلق سے کافی تحقیقی کام منظر عام پر آچکا ہے۔ باقی مضامین بھی سرسید اور مراد آباد کے تعلق سے کئی اہم گوشوں کا احاطہ کرتے ہیں۔

باب چہارم دراصل تاثراتی نوعیت کا ہے، لیکن اس میں بھی مراد آباد سے تعلق رکھنے والی کئی اہم شخصیات اور اس شہر کے تہذیبی اور ثقافتی منظر نامے پر روشنی پڑتی ہے۔ سر رضا علی کا مضمون 'مراد آباد کے وکیل، روٗسا اور دیگر اہل کمال' سے متعلق ہے اور یہ دراصل مضمون نگار کی خود نوشت کے اہم اقتباسات پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں مراد آباد کے وکلاء اور روٗسا کا ذکر جس انداز سے کیا گیا ہے اس سے شہر کی ثقافتی فضا اور سماجی ہم آہنگی کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ مولوی مظہر جلیل شوق کا مضمون 'میرے زمانے کا مراد آباد' آزادی سے پہلے کے مراد آباد کے تہذیبی وثقافتی ماحول اور شہر کی اہم

شخصیات کا تعارف پیش کرتا ہے۔ بہت مختصر الفاظ میں اس دور کے مرادآباد ضلع میں آنے والے شہروں کا تعارف بھی چند سطور میں پیش کیا گیا ہے۔ ’مرادآباد کی سرزمین‘ ذیلی عنوان کے تحت شہر کی آب وہوا اور جغرافیائی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مقامی صنعتوں کا بھی تکنیکی وضاحت اور تشریح کے ساتھ دلچسپ پیرائے میں بیان ہے۔ ’میرا وطن‘ محمد عبدالملک جامعی کا مضمون ہے۔ حالانکہ جامعی صاحب نے یہ اعتراف کیا ہے کہ مرادآباد میں ان کا قیام بہت کم رہا لیکن ان کے دادا ترک وطن کر کے مرادآباد آبسے تھے، اس لیے جامعی صاحب کو بھی اس شہر سے وہی انسیت رہی جو کسی محبّ وطن کو ہوتی ہے۔ یہ مختصر مضمون تاثراتی بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ پروفیسر محمد حسن اردو کے معتبر اور مستند نقاد کی حیثیت سے پوری دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ اردو تنقید کا یہ ہیرا بھی مرادآباد کی ہی دین ہے۔ موصوف کا مضمون اس باب میں ’نثار میں تری گلیوں کے‘ عنوان سے شامل ہے، جس میں مرادآباد کی سیاست، ثقافت اور ادب سے متعلق ایسی بہت سی کہانیاں بیان کی گئی ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس باب کا آخری مضمون ’کاملانِ مرادآباد‘ خود معصوم مرادآبادی کا ہے۔ ایک پختہ کار صحافی کس طرح اپنے سماج اور معاشرے کی ان کہی کہانیوں، ان چھوئے گوشوں اور غیر معروف شخصیات کے قابل قدر کارناموں کا احاطہ کر کے اپنا صحافتی فرض ادا کرتا ہے اس کا ثبوت یہ مضمون ہے۔ کاملانِ مرادآباد میں جن کرداروں کو پیش کیا گیا ہے وہ ایوان اقتدار سے دور رہنے والے ایسے مثبت کردار ہیں جو کسی بھی سماج کی تعمیر میں بہت خاموشی سے اپنا رول ادا کرتے رہتے ہیں۔

باب پنجم ’مرادآباد کی علمی، ادبی اور سماجی زندگی‘ کا احاطہ کرتا ہے۔ اس حوالے سے مرادآباد کی علمی وادبی تاریخ، مرادآباد کی تاریخی دینی اور عصری درسگاہیں، اردو صحافت میں مرادآباد کا حصہ اور مرادآباد کی پیتل کی صنعت جیسے موضوعات پر مضامین اس باب میں شامل ہیں۔

آخری باب ’چند مشاہیر مرادآباد‘ ہے۔ خود معصوم مرادآبادی کا اسی عنوان کے تحت مضمون بھی اس باب میں شامل ہے۔ جگر مرادآبادی پر ظ۔ انصاری، قاضی عبدالغفار پر پروفیسر عابدہ سمیع الدین، منشی عبدالقیوم خاں خطاط پر محمد عبدالملک جامعی، مسلم انٹر کالج کے بانی مولوی ابرار حسین پر ڈاکٹر محمد آصف حسین، مولوی عبدالملک مرادآبادی مہاجر مدنی پر مولانا ماجد مسعود شمیم کے مضامین بھی اس باب کی زینت ہیں۔ اس باب کا آخری مضمون ’مرادآباد کے سیاسی قائدین‘ بھی مرتب معصوم مرادآبادی کا ہے اور یہ بھی ان کی صحافتی نگاہ کا ثبوت ہے۔

بہرحال ’تاریخ مرادآباد‘ ایک ایسے صحافی کے صحافتی اور تاریخ نویسی کے شعور کا آئینہ ہے، جس کی اب تک کی زندگی کا بڑا حصہ بھلے ہی دلی میں گزرا ہو لیکن اپنے وطن کو مختلف زاویوں سے سمجھنے کی جس کی کوششوں نے ایک ایسے موضوع پر کتاب مرتب کرنے پر آمادہ کیا، جس کی افادیت نہ صرف اہل مرادآباد بلکہ ہر اس شخص کے لیے مسلم ہے، جو اس ملک کی تہذیبی وثقافتی زندگی کو اس کی ممتاز بستیوں کے حوالے سے جاننا چاہتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔

افسانے

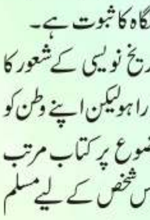

کرب ناتمام

افسانہ نگار: شاہین نظر

صفحات: 104، قیمت: 120 روپے

ناشر: ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس شاہین باغ، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر جہاں گیر حسن، شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں، کوشامبی (یوپی)

گیا، بہار جو شروع سے ہی قدیم وجدید علوم وفنون کا ایک عظیم گہوارہ رہا ہے اور اپنی علمی وثقافتی زرخیزی کے باعث بین الاقوامی سطح پر متعارف ومشہور بھی رہا ہے، شاہین نظر کا تعلق اسی قدیم وجدید تاریخی وعلمی شہر سے ہے۔ آپ کا ذریعہ معاش صحافت رہا ہے اور باوجودیکہ آپ انتہائی مجرب اور بالغ نظر صحافی کی حیثیت سے اپنی ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ لیکن اِس کے ساتھ ہی آپ ایک حساس اور دردمند دل کے مالک بھی ہیں، چنانچہ آپ کی یہی حساسیت اور دردمندی؛ جب آپ کے تخیلات وتفکرات سے معانقہ کرتی ہے تو ’آپ بیتی‘ اور ’جگ بیتی‘ قصوں اور کہانیوں کے قالب میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ شاہین نظر خود بیان کرتے ہیں:

’’میں پیشے کے اعتبار سے صحافی ہوں اور غیر جانبدارانہ طریقے سے کسی واقعے، حادثے یا حقیقت کو نیوز اِسٹوری کی طرح پیش کرنا میرا کارِ منصبی ہے، لیکن ہر حساس دل انسان کی طرح واقعات اور مشاہدات مجھے بھی متأثر کرتے ہیں اور میرے وجود کا حصہ بن کر مجھے بے چین رکھتے ہیں۔ اور پھر خود بخود دیر سویر نوک قلم تک افسانوں کی شکل میں آہی جاتے ہیں۔‘‘ (پیش لفظ)

شاہین نظر چونکہ ایک صحافی ہیں اور صحافت کے سلسلے میں اندرون ملک و بیرون ملک کا اچھا خاصا تجربہ رکھتے ہیں، اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو آپ کے افسانے آپ کے ذاتی مشاہدات وتجربات کے بہترین عکاس اور حقیقی آئینہ دار معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے علم کے مطابق اب تک آپ کے دو ہی افسانوی مجموعے (’سرکٹے لوگ‘ اور ’کرب ناتمام‘) منظر عام آئے ہیں لیکن اِس کے باوجود آپ دنیائے افسانہ میں اپنی ایک محسوس چھاپ چھوڑنے میں کامیاب ہیں اور ایک حد تک سنجیدہ ناقدین کو خامہ فرسائی پر مجبور بھی کرتے ہیں۔

زیر نظر افسانوی مجموعہ ’کرب ناتمام‘ پندرہ افسانوں، ’پیش لفظ‘ اور ’حرف معتبر‘ جیسی نگارشات پر مشتمل ہے۔ اِس میں شامل تمام تر افسانے تجربات سے لبریز، مشاہدات سے مملو اور اِنتہائی سبق آموز ہیں۔ یہ صرف کہانی کار کے محسوسات نہیں بلکہ عام انسانوں کے دل کے خطرات معلوم ومحسوس ہوتے ہیں۔ اگر غایت نظر سے دیکھا جائے تو اِس مجموعے کی کہانیوں میں ’کربناکی اور محرومی‘ ایسی چیزیں ہیں جو تقریباً ہر کہانی میں کمال کی حد تک مشترک ہیں۔ بایں سبب ہر کہانی اپنے قاری کے دل پر اپنا کربیہ اثر ضرور چھوڑتی ہے اور اگرچہ وہ ایک لمحے ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔

اِس مجموعے میں شامل افسانوں کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اِس میں بعض افسانوں کی زمین ہندوستان سے متعلق ہے اور بعض افسانوں کی زمین خلیجی ممالک سے وابستہ ہے۔ مثال کے طور پر جنت باجی، کرب ناتمام، بارود، گھر، قیدی، یا اللہ، بلا، اٹکی ہوئی سانس وغیرہ افسانے ہندوستانی حالات کے عکاس ہیں اور تعاقب، کرب شناسائی، پانی پانی، متاع رائیگاں، نامراد، سرکٹے لوگ بیرون ہند اور خلیجی ممالک میں رہ رہے مزدوروں اور ملازموں کے شب وروز کے ترجمان ہیں۔

شاہین نظر بالخصوص انسانی معاشرے کے اُن افراد کی ترجمانی کرتے ہیں جو فطری طور پر وفادار، محنتی اور مخلص ہوتے ہیں اور اپنی طاقت وقوت سے زیادہ کام کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی عزت وناموس کو بھی داؤ پر لگانے سے دریغ نہیں کرتے۔ صرف اور صرف اِس لیے کہ کسی کو گھر چلانا ہے، کسی کو بچے بچیوں کا مستقبل سنوارنا ہے، لیکن اجر ومعاوضے کے نام پر اُنھیں ملتا کیا ہے؟ درد، کرب، ظالمانہ وآمرانہ سلوک، محرومی، نامرادی، غلامی اور محض سرکٹے لوگ جیسی صورت حال۔ شاہین نظر کے یہ وہ امتیازات ہیں جن کے باعث وہ ایک عام کہانی کار کی صفوں سے نکلتے ہیں اور خاص کہانی کار کی صفوں میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔

’جنت باجی‘ ایک خوددار بیوہ خاتون کی داستان حیات ہے اور ہمدردی کے لباس میں روپوش حریص ومطلبی انسانوں کی روداد۔ ’کرب ناتمام‘ ایک حوصلہ مند اور بہادر خاتون کا قصہ ہے جو بیوگی کے بعد بھی شوہر کی موت کا کرب اپنے اوپر طاری نہیں ہونے

دیتی۔ افسانہ 'گھر' ایک انسان کی کہانی ہے کہ تمام تر اخلاص و وفاداری کے بعد بھی اسے نامرادی ہی ہاتھ آتی ہے۔ 'وہ' ایک نفسیاتی کہانی ہے۔ یہ کہانی خودکلامی والی کیفیت سے دوچار کرتی ہے۔ افسانہ 'بلا' اتحاد و اتفاق کے فوائد اور اختلاف و انتشار کے مضرات سے ہم آغوش کرتا ہے۔ 'قیدی' افسانوی جامے میں احوال واقعی کا چشم دید راوی ہے۔ 'یااللہ' سیاست کی بھینٹ چڑھتی اقلیت کا قصہ ہے۔ 'بارود' فساد کی چپیٹ میں پھنسی اور سسکتی انسانیت کی روداد ہے۔ 'تعاقب' اولاد کی محبت میں تڑپتے ایک مجبور و بے بس باپ کی دلی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ جب کہ 'کرب شناسائی' میں قربت و شناسائی کی کیفیت کے ساتھ ہجر و فراق کے درد و کرب کا ذکر ہے۔

علاوہ ازیں 'اٹکی ہوئی لاش' کا آغاز کہانی کا محور بیاں کر دیتا ہے کہ اس کے باعث انسانی قلب میں صرف ٹیس پیدا نہیں ہوتی بلکہ اُس کی شدت کرب سے انسان مضطرب ہو اٹھتا ہے۔ ''ابے کم بخت، تو جب روزی کمانے نکلا تھا تو تو نے اپنی غیرت اپنے وطن ہی میں بیچ ڈالی تھی؟'' اس جملے سے 'نامراد' کہانی کا آغاز ہوتا ہے اور کہانی نگار ایک انتہائی بے حس و بے غیرت انسان کی داستان کرب بیان کرتا ہے جس کے پاس غصہ، نفرت اور انتقام کا مادّہ تو ہے ہی نہیں۔ 'متاع رائیگاں' ایک ایسے انسان کا قصہ ہے جو جان سے ہاتھ تو دھو بیٹھتا ہے لیکن اس کی ضرورتیں پوری نہیں ہو پاتیں۔ یہ ان افراد کے لیے ایک سبق ہے جو اپنے گھربار سے دور ایک خواب سجائے بیرون ملک جاتے ہیں لیکن ان کے خواب، کبھی پورے نہیں ہوتے۔ البتہ وہ خود ایک خواب بن جاتے ہیں۔ 'پانی پانی' کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک محاورہ ہمارے ذہن میں ابھرتا ہے: 'پانی پانی ہونا'۔ یعنی احساس گناہ کے باعث انسان کا انتہائی شرمندہ ہونا، تو اِس کہانی میں یہ تجربہ بالخصوص محسوس ہوتا ہے۔ اِس مجموعے کا آخری افسانہ 'سر کٹے لوگ' ہے۔ یہ ایسے لوگوں کی کہانی ہے جنھیں کچھ سوچنا سمجھنا آتا ہی نہیں۔ اِنھیں ایک ہی بات معلوم ہے تابعداری اور بس تابعداری، گویا یہ لوگ محض کام-کاج کے لیے بنے ہوتے ہیں۔

القصہ! شاہین نظر نے صحافت نگاری کی مدد سے اپنے افسانوں میں خاطر خواہ جان ڈالنے کی کوشش کی ہے اور مکمل طور پر نہ سہی، کافی حد تک اس کوشش میں کامیاب بھی معلوم پڑتے ہیں۔ زبان و بیان بھی شگفتہ اور دلکش ہے۔ شاہین نظر کے یہاں ایک چیز ہمیں شدت سے کھٹکتی ہے کہ وہ یاسیت اور شدید درد و کرب کے قید میں گرفتار محسوس ہوتے ہیں اور رُومانویت سے یکسر خالی نظر آتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ بیرون ملک سے متعلق افسانے محض کربیہ ہیں، جب کہ ہمارے خیال سے کچھ طربیہ بھی ہوتے تو اچھا ہوتا۔ ہم پُرامید ہیں کہ وہ اِس پہلو پر بھی کچھ غور کریں گے۔

شاعری

پرواز

مصنف: صاحبزادہ محمد شمشیر خان 'شاہین ٹونکی'

صفحات: 400، قیمت: 600 روپے، سنہ اشاعت: 2023

پبلشر: گلوبل کمپیوٹر اینڈ پبلی کیشن، جے پور، راجستھان

مبصر: محمد چاند رضا، گلی نمبر 37، H-458 H/1، ذاکر نگر ڈھلان بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

فن شاعری مسلسل جگر سوزی کا عمل ہے، جس طرح زندگی کی کئی پرتیں ہوتی ہیں بعینہٖ اسی طرح شاعری کی بھی کئی پرتیں ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ شاعری زندگی کے اردگرد پھیلی ہوئی مایا جال کی ترجمان ہوتی ہے۔ اپنے احساسات و جذبات اور افکار و خیالات کو لفظوں کی لڑی میں پرو کر کلام موزوں کی صورت میں پیش کرنا ہی شاعری کہلاتا ہے۔ زیر نظر شعری مجموعہ 'پرواز' انھیں کیفیات و فنی خصوصیات کا کاغذی پیراہن ہے۔

اس مجموعے کے تخلیق کار صاحبزادہ کیپٹن محمد شمشیر خان شاہین ٹونک راجستھان کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، وہ ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ شاہین کا تقرر فوج میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کے عہدہ پر ہوا اور انھیں پیراشوٹ رجمنٹ اسپیشل فورسز Parachute Regiment میں خدمت کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔ کھیل کود کے میدان سے لے کر شعر و شاعری، موسیقی، گائیکی اور دیگر شعبہ ہائے زندگی میں انھوں نے نمایاں کارکردگی انجام دی ہے۔

مجموعے کے پیش لفظ شاہین کے شعری مجموعہ 'پرواز' کی اشاعت سے متعلق باتیں، دوران اشاعت پیش آنے والی مشکلات، بچپن کی زندگی، شاعری، دوران ملازمت کلچرل پروگراموں کا ذکر اور اخیر میں تمام خیر خواہوں کے نام تشکر و امتنان کا نذرانہ شامل ہے، اس کے بعد 'تبصرہ برائے پرواز' کے نام سے سید مختار ٹونکی کا مضمون اور کیپٹن صاحبزادہ محمد شمشیر خان شاہین (تعارف) سرخی کے عنوان سے سید ساجد علی ٹونکی کا مضمون شامل ہے۔ ان کے علاوہ صوفیانہ کلام (حمد و نعتیں) غزلیات، قطعات، متفرق اشعار، نظمیں، چہار بیتیں کتاب کا حصہ ہیں۔

مجموعے کے فرنٹ کور پیج پر راجستھان ساہتیہ اکادمی کے سابق صدر وید یاس کا شاہین کے ہندی مجموعے 'پرم سنتشٹی' پر اظہار خیال ہے اور بیک کور پیج پر صاحب مجموعہ نے اپنا تخلص شاہین رکھنے کے بارے میں بتایا ہے جو ان کے پیشے سے کافی مماثلت رکھتا ہے۔ شاہین نے روایتی انداز میں مجموعے کو ترتیب دیتے ہوئے حمد باری تعالیٰ سے آغاز کیا ہے۔ حمد میں خداوند قدوس کی اختیاری خوبیوں پر 'منظوم اسمائے حسنیٰ' کے عنوان سے بڑائی بیان کی ہے جس میں وحدت الشہود کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔

نعت گوئی ایک مشکل فن ہے، سیرت طیبہ کا ذکر عشق و محبت سے لبریز ہو کر شعری پیرائے میں کرنا نعت کہلاتا ہے۔ شاہین کی نعتیہ شاعری لوگوں کو مقصد حیات سے قریب کرتی ہے اور نقوش محمدی کو دلوں میں بٹھاتی بھی ہے۔ ہندی عربی و فارسی الفاظ کا برمحل استعمال اور پرشکوہ انداز بیان شاہین کی شاعری میں چار چاند لگا دیتا ہے۔

شمشیر خان شاہین کو فنی تقاضوں کو نبھانا اور غزل کی زلفوں کو سنوارنا بخوبی آتا ہے۔ طویل بحر مترنم و موسیقی سے بھرپور اشعار، زیریں لہر سے اٹھتی امید و یاس کی چنگاری، ضبط احساس، مؤدبانہ انداز تخاطب، صاف گوئی، سلیس زبان و بیان نے ان کی شعری کائنات کو منفرد شناخت عطا کی ہے، وہ خود کہتے ہیں:

نہ میں غالب ہوں، نہ میں میر ہوں، نہ میں ذوق ہوں، نہ نظیر ہوں، نہ میں مومن ہوں
نہ امیر ہوں / جسے عام فہم بھی کہیں، جسے سارے لوگ سمجھ سکیں، مرا شاہیں ایسا کلام ہے

شاہین زندگی و زمانے کے نشیب و فراز کو فنی باریک بینی سے غزل کی جمالیاتی در و بست کے ساتھ بیان کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ امید و یاس، حسن و عشق، شکوے گلے، پند و نصائح، غزل کے وہ عام موضوعات ہیں جن پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ نرم و شستہ انداز بیان، سادگی، رمز و کنایہ، دوراز کار تشبیہات، استعارات، ایجاز و اختصار، صنائع و بدائع کا انھوں نے اپنی شاعری میں کافی ژرف نگاہی سے استعمال کیا ہے۔ ساقی، جام، شراب، کباب، شباب، زاہد، ناصح، میکدہ، میخانہ، ساغر وغیرہ لفظوں کا استعمال کثرت سے کیا ہے لیکن نئے معانی و مفاہیم اور شعری خوبیوں کے ساتھ۔

کہاں پر آ گیا ناصح یہ دیوانوں کی بستی ہے
یہ تو نے جیب و داماں کا یہاں پرچم نہیں دیکھا

مرا کیف میرا نشہ ہے تو تجھے کیا بتاؤں کہ کیا ہے تو
ترا در تو ہے مرا میکدہ ترا عشق میری شراب ہے
سبووصہبا و جام و مینا یہ سب کے سب ہیں حقیر ساقی
کہاں وہ ان کی نشیلی آنکھیں کہاں یہ تیرا شراب خانا

شاہین کے مجموعے میں تقریباً پندرہ نظمیں شامل ہیں، ہر ایک نظم موضوع، مواد اور ہیئت کے اعتبار سے اچھوتا ہے، قصے واقعے، خیالات کو شعری پیکر عطا کرتے ہوئے کسی بھی نظم میں تسلسل کا دامن چھوٹنے نہیں پاتا۔ کئی نظمیں نظم معریٰ اور کئی پابند نظم کی ہیئت میں ہیں۔ متنوع موضوعات کی طرح ان کی شکلیں بھی متنوع ہیں، ترجیع بند، ترکیب بند، مثلث، مربع، مخمس، مسدس وغیرہ۔

شاہین نے چہار بیت میں بھی خوب طبع آزمائی کی ہے۔ان کی چہار بیت تصنع، مبالغہ آرائی، بھاری بھرکم الفاظ اور آورد کے بجائے آمد کا رنگ لیے ہوئے اور صاف و سلیس انداز میں ہے۔تمام چہار بیت جدید ہیئت پر ہیں جن کے موضوعات رنگا رنگ ہیں۔

ان کے علاوہ قطعات اور متفرق اشعار کو بھی مجموعے میں شامل کیا گیا ہے جن میں وہی رنگ ہے جو ماسبق غزلوں اور نظموں میں ہے۔اخیر میں کیپٹن شمشیر خان کی مختلف اوقات میں لی گئیں یادگار تصاویر ہیں جو صاحب کتاب کی پیدائش اور عہد جوانی سے لے کر تا حال کی سرگرمیوں کا بہترین البم ہیں۔

میں اپنے اس تبصرے کا اختتام وید یاس کے اس قول پر کرتا ہوں کہ ''شمشیر خان میں دل و دماغ کی ایسی گہرائی اور سنجیدگی ہے کہ انھیں تسلی کے ساتھ پڑھنا اور ان کے الفاظ کی روشنی کو گلے لگانا ضروری ہے۔''

جان شوریدہ

شاعرہ: خوشبو پروین
صفحات: 135، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2023
ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: خورشید حیات K.205 سکنڈ فلور گولف گرین، کراسنگ ریپبلک، غازی آباد

عشق، جنون کی تخلیقی کیفیتوں والی روحانی قبا کے رومانی راگ، یا پھر میوزیکل تھاٹس کا نام شاعری ہے۔ شاعری، روح دوراں میں داستان رنگ چہروں کے ارضی رقص یا پھر Rhythmic motion کا نام ہے۔شاید یہ زمانی خارجی اور داخلی تخصص کا خوبصورت اظہار یہ بھی ہے اور روایتی تہذیبی شعور کے ساتھ دروں بینی کا لامتناہی سلسلہ بھی۔

دشت کی گھنی دھوپ، کبھی چھاؤں، کبھی پاؤں پاؤں، عشق کے بدلتے محاوروں، بدلتے ہوئے موسم کے مزاج اور جنگل کی گھنی راتیں۔مختلف انسلاکات، معنوی فضا اور بھی بہت کچھ، شاعری کے نفس نفس میں ایک بجلی چھپی ہوتی ہے۔تخلیقی اظہار، شاعری میں، زیادہ کامیاب اور مقبول دکھائی دیتا ہے۔کل اور آج کی بھیڑ تو کچھ ایسا ہی کہتی ہے۔

چھوٹی سی ڈبیا میں بڑی بڑی بتیاں، بتائیں کیا۔
پھول، خوشبو اور حروف بدن کی تخلیقی تھرکن = جان شوریدہ۔
سانس سانس خوشبو کا بے تاب جزیرہ جان شوریدہ۔

خوشبو پروین نئی نسل کی ایک ایسی شاعرہ ہیں جن کے یہاں نسائی احتجاج کی زمزمی صورت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ان کا پہلا شعری مجموعہ 'خوشبو کی آواز' کے نام سے، شاعری پسند قارئین کے بیچ مقبول عام ہو چکا ہے۔

بقول حقانی القاسمی خوشبو پروین کے یہاں شاعری ''جذبات کا نغماتی اظہار ہے۔''

حقانی القاسمی 'جاڑے کی دھوپ جیسی شاعری' کے تعلق سے فرماتے ہیں:

''خوشبو پروین کے وجود میں ایک طرح کی نغمگی اور موسیقیت ہے جو ان کے تخلیقی وجود میں بھی تحلیل ہو گئی ہے۔''

عشق کے سارے شیڈس اور محسوساتی کیفیات ان کے شعری کینوس کا حصہ ہیں۔''

میرا ماننا ہے کہ روح دوراں میں شعری اظہار، گیان کے سورج کی ایک ایسی تپش کی طرح ہے جو ڈیجیٹل ہوتے جا رہے معاشرے کو بیدار کرتی ہے اور مڑ مڑ کر دیکھنے کی ادا بھی سکھاتی ہے۔

خوشبو پروین کی شاعری کا جائزہ لینے سے یہ بات بخوبی اخذ کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی تخلیقی قوتوں کے شعری پیکر میں ڈھل، پگھل کر زندگی کے مختلف گوشوں کی تکمیل کرتی ہیں۔شعری اظہار کی اسی جاگتی ہوئی کیفیت نے خوشبو کو ایک نیا مزاج عطا کیا ہے۔

مہک سے جس کی معطر ہے زندگی میری   وہ میری ماں ہے میری ماں ہے میری ماں خوشبو
وہی ہے حرف وہی لفظ اور سخن میرا   اسی کا عشق غزل کا ہے پیرہن میرا
تمھارے نام کی خوشبو ہے میری سانسوں میں   قبول ہو گئی میری وہی دعا ہو تم

ان کی شاعری کے پہلے پڑاؤ میں مدرسے کی تعلیم، والدین کی تربیت hereditary influences شامل ہیں وہیں آج ان کا عشق اقرا، ضیا اور امامہ ہیں۔ موضوع کوئی بھی ہو اسے سلیقے سے برتنے کی توانائی خوشبو میں ہے۔

خوشبو پروین کے یہاں شاعری ٹوٹے بکھرے سماج میں ٹانکی گئی چپ کی نئی آواز ہے۔ جو حواس خمسہ کے لیے الفاظ وضع کرتی ہے۔ قوتِ عقلیہ قابل رشک ہے۔

میں دھمکیوں بھرا پنجہ مروڑ سکتی ہوں   مجھے بھی حق ہے کہ میں تجھ کو چھوڑ سکتی ہوں
میں اگر فون اٹھاؤں نہیں تو شک کیسا   شرٹ پر تیرے بھی تو سرخ نشاں ہوتا ہے
کوئی کمزور اب سمجھا کرے نہ صنف نازک کو   بقا کی جنگ بزدل لڑکی ایک دن لڑ بھی سکتی ہے

آج کی عورت کی چومکھی جنگ گھر کے آنگن میں بھی ہے اور چہار دیواری سے باہر بھی۔ Commodification of female body کے اس دور میں تانیثی احتجاج کی بازگشت ادب کے اسٹیج پر سنائی دے رہی ہے۔

چپ کی آواز کی داد تو 'تخلیق کار' کے ہاتھ میں ہے، تخلیقی فنکار کیا بولے؟
ہر تخلیقی فنکار نیم وحشی ہوتا ہے اور حدیث دل، غریب۔

خوشبو پروین کے یہاں نسائی احتجاج کی تقدیس کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

جم گئی ہیں کئی حیرت زدہ آنکھیں مجھ پر   ہاتھ تو ہاتھ سے محراب کو باندھے ہوئے ہے
جب لہو گرم ہوتا ہے تو سویا ہوا شہر بھی جاگنے لگتا ہے۔

خوشبو پروین کے شعری مجموعہ 'جان شوریدہ' کو جب میں نے ٹھہر ٹھہر کر پڑھا تو کچھ اسی طرح کا احساس جاگا کہ باطنی اور داخلی محسوسات کی ترجمانی ان کی شاعری میں، لاشعوری طور پر کچھ اس طرح پیش ہوئی ہے کہ بیک وقت بصری، لمسی اور سمعی پیکر متاثر ہوتے ہیں۔

گردش کائنات سے جنم لینے والی خوشبو غزل، روح میں اترنا بھی جانتی ہے اور تھرکنا بھی جانتی ہے۔

خوشبو کے یہاں شاعری کرب کو تبسم میں بدل دینے کا عمل ہے۔
شاعری کی زمین پر خوشبو روایت پر چلتی ہوئی لکیروں کو مٹاتی ہیں۔

احتجاج کی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے انحراف بھی کرتی نظر آتی ہیں، بعض اشعار میں کچھ ایسا ہی محسوس ہوا۔

یہ مجموعہ شعری ادب میں تازہ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ شاعرہ کے منفرد انداز، نیم نیم شہد شہد طرز بیان کا نمونہ اور ان کے تابناک شعری مستقبل کا ضامن ہے۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے خبر نامہ میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی و ثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔

یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

جمہوری افکار و اقدار کا فروغ ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری: پروفیسر دھننجے سنگھ

قومی اردو کونسل میں یوم جمہوریہ کے موقعے پر تقریب پرچم کشائی

نئی دہلی: جمہوریت بہت اہم چیز ہے مگر جمہوریت میں بہت سے چیلنجز بھی ہوتے ہیں۔ آج جمہوریت، آئین اور بنیادی حقوق کو سیلیبریٹ کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ یہ باتیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر دھننجے سنگھ نے یوم جمہوریہ کے موقعے پر پرچم کشائی کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم آج یہ جشن مناتے ہیں تاکہ پورے سال ہم یہ یاد رکھیں کہ بھارت ایک جمہوری ملک ہے اور اسی کی ترقی کے لیے ہم سب مل جل کر کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل ایک بڑا ادارہ ہے جو اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہا ہے اور اس زبان کا جمہوریت سے گہرا رشتہ ہے۔ جمہوری اقدار و افکار کے فروغ و اشاعت میں اردو شاعری اور صحافت نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمن) جناب محمد احمد، ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ اور جونیئر کم آفیسر محترمہ نیلم رانی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ قبل ازاں قومی اردو کونسل کے صدر دفتر جسولہ میں پرچم کشائی تقریب کا نہایت تزک و احتشام سے اہتمام کیا گیا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر دھننجے سنگھ نے پرچم کشائی کی۔ کونسل کے عملے نے قومی ترانہ گایا اور ترنگے کو سلامی دی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 جنوری 2023

عالمی کتاب میلے میں قومی اردو کونسل اور این بی ٹی کے اشتراک سے
'ہندوستان کے کثیر لسانی منظرنامے میں اردو تہذیب کی عکاسی' پر مذاکرہ

نئی دھلی: دہلی کے پرگتی میدان میں جاری عالمی کتاب میلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور این بی ٹی (نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا) کے اشتراک سے 15 فروری کو میلہ گاہ کے تھیم پویلین میں 'ہندوستان کے کثیر لسانی منظرنامے میں اردو تہذیب کی عکاسی' کے عنوان سے ایک مجلسِ مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا، جس میں پروفیسر خواجہ اکرام الدین اور پروفیسر کوثر مظہری نے بہ طور مہمان و مذاکرہ کار شرکت کی، جبکہ اس پروگرام کی نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی۔

مذاکرے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ اردو تہذیب کا مطلب ہے ہندوستانی تہذیب، یعنی کثرت میں وحدت کا نمونہ۔ انھوں نے کہا کہ یہ زبان خالص ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی زبان ہے، اردو کے پہلے شاعر امیر خسرو نے جس زبان میں شاعری کی ہے، وہی ہندوستان کا اصل رنگ ہے جو اردو زبان کے رگ و پے میں شامل ہے، خسرو کے بعد دکن اور میر و غالب اور بعد تک کی شاعری میں یہ رنگ بہت نمایاں ہے۔ خواجہ اکرام نے کہا کہ ہندوستان جس کثیر لسانی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے، اس کا سب سے بہترین نمونہ اردو ہے۔ انھوں نے اردو پر دوسری زبانوں کے اثرات اور ہندوستانی زبانوں پر اردو کے اثرات کو شعری مثالوں سے بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کو سمجھنے کے لیے ہندوستانی زبانوں کو پڑھنا پڑے گا اور ان زبانوں میں اردو کی سب سے زیادہ اہمیت ہے، کیوں کہ ہندوستان کے تمام تہذیبی مظاہر کی نمائندگی یہ زبان بخوبی کرتی ہے۔

پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ اردو زبان کی تشکیل میں تمام قومی زبانوں اور تہذیبوں کی آمیزش رہی ہے، اس زبان میں ہر ہندوستانی زبان کے علاوہ عربی، انگریزی، پرتگیزی، ترکی اور دیگر کئی زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے انھوں نے اردو نثر کی کلاسیکی کتاب 'آب حیات' کے ایک اقتباس کا خصوصی حوالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی کلاسیکی شاعری بھی لسانی تنوع کی نمائندگی کرتی ہے، بلکہ نثر سے زیادہ شاعری میں ہندوستانی تہذیب کی عکاسی کی گئی ہے۔ پروفیسر مظہری نے کہا کہ اردو تہذیب سلیقہ و شائستگی سکھاتی ہے اور یہ بھی اس کی ایک خاص شناخت ہے، ہندوستانی فلموں کو خوب صورتی و مقبولیت عطا کرنے میں بھی اس کا اہم رول رہا ہے۔ آج گرچہ زبان کے استعمال اور اسے برتنے میں گراوٹ آئی ہے، مگر پھر بھی عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ اگر تہذیب اور سلیقہ مندی سیکھنی ہے تو اردو سیکھنی چاہیے۔

ہندی اور اردو کے روابط و اثرات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ دونوں زبانیں سب سے زیادہ ایک دوسرے سے قریب ہیں اور دونوں نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا ہے۔ انھوں نے زبانوں میں مشکل پسندی اور ضرورت سے زیادہ شدھی کرن کو نقصان دہ بتایا اور کہا کہ ہمیں اپنی تخلیقات میں ایسی زبان استعمال کرنی چاہیے، جو آسانی سے سمجھی جاسکے، تاکہ ہم اپنا پیغام وسیع پیمانے پر لوگوں تک پہنچا سکیں۔ اس موقعے پر کونسل کے عملے کے علاوہ بڑی تعداد میں شائقینِ زبان و ادب موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 16 فروری 2023

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................................. بتاریخ.. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

آئینی وژن

نئی دھلی : شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام اور اردو اکادمی، دہلی کے جزوی مالی تعاون سے سالانہ نظام خطبہ بعنوان 'آئینی وژن' کا انعقاد آرٹس فیکلٹی کے کمرہ نمبر 22 میں ہوا، اس موقعے پر شعبہ اردو کی صدر پروفیسر نجمہ رحمانی نے اپنے استقبالیہ کلمات میں مختصراً شعبے کی تاریخ اور نظام خطبات کی روایت سے روشناس کرایا، انھوں نے کہا کہ شعبہ اردو کا قیام آزادی سے بہت پہلے ہوا تھا، آزادی سے پہلے یہ شعبہ دلی کالج میں تھا اور عربی، فارسی کے ساتھ تھا، 1958 میں اس شعبے کو دہلی یونیورسٹی کے آرٹس فیکلٹی میں قائم کیا گیا، پہلا سالانہ نظام خطبہ 1966 میں ہوا تھا، اس سلسلے کے تحت بہت سے اہم موضوعات پر خطبات ہوئے ہیں، یہ سالانہ نظام خطبہ حیدرآباد کے نواب مفخم جاہ کے تعاون سے شروع ہوا تھا۔ ہمارے طلبا وطالبات اور ریسرچ اسکالرز کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے شعبے کی تاریخ سے بھی واقف رہیں۔ سالانہ نظام خطبہ پیش کرتے ہوئے ملک کے معروف قانون داں اور نیشنل لا یونیورسٹی، پٹنہ کے وائس چانسلر پروفیسر فیضان مصطفیٰ نے کہا کہ دستور ہند میں آرٹیکل 29 کہتا ہے کہ آپ کو اپنی زبان، اس کا رسم الخط اور تہذیب وتمدن کی حفاظت کی آزادی ہے، نیز لسانی اقلیتوں اور مذہبی اقلیتوں کے اداروں میں اس کے ریزرویشن کے امکانات باقی رہتے ہیں۔ وقت کا تقاضا ہے کہ آپ کو اپنے موضوع پر مہارت حاصل ہو یا نہ ہو آپ کے لیے دستور کا علم ناگزیر ہے۔ قانون سے واقفیت کا حصول ہم سب کے لیے ضروری ہے۔ آئینی وژن کیا ہے اس پر بات ہونی چاہیے، بھارت سرکار کی پالیسی ہے کہ دستور ہند کو عوام تک پہنچایا جائے، دستور کے بنیادی اصولوں کو سمجھنے کے لیے تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے، دستور سازی اور دستور کو اپنی

زندگیوں میں ڈھالنے کے لیے جن تیاریوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس پر پہلے محنت نہیں کی گئی، جمہوریت صرف یہ نہیں کہ ہم جا کر اپنا ووٹ ڈال دیں، ہماری زندگیوں اور گھروں میں عمومی طور پر جمہوریت نہیں ہے، ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی زندگیوں اور گھروں میں بھی جمہوری اقدار کو اپنائیں۔

آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر امیتابھ چکرورتی نے کہا کہ آج کا لیکچر بہت ہی عمدہ تھا، ہم لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ آرٹس فیکلٹی کے تمام شعبہ جات کے ساتھ مل کر کام کریں، شعبہ اردو کا شکر گزار ہوں کہ اتنے اچھے پروگرام کا انعقاد کیا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی محمد احسن عابد، سکریٹری اردو اکادمی، دہلی نے کہا کہ آج کا اتنا عمدہ خطبہ تھا کہ اس پر بہت زیادہ بات نہیں کی جاسکتی، نظام خطبات کی اشاعت اردو اکادمی کے تعاون سے ہوگی، ہم اس کے لیے عہد بستہ ہیں، مجھے امید ہے کہ شعبہ اردو اس طرح کے بامعنی پروگراموں کا انعقاد کرتا رہے گا۔ پروفیسر انجو ولی ٹکو، ڈین لا فیکلٹی، دہلی یونیورسٹی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ آج کے خطبے کا موضوع وقت کا تقاضا ہے، آئینی وژن کا آغاز ہمارے گھروں سے ہوتا ہے، جب بھی کبھی ہم حق کی بات کرتے ہیں تو ہم دوسرے کو الگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب ذمے داریوں کی ادائیگی کی بات کرتے ہیں تو ہم لوگوں کو اکٹھا کرتے ہیں اور یہیں سے سوچ میں ایک فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ پروگرام کی نظامت پروفیسر ابوبکر عباد نے بحسن وخوبی انجام دیتے ہوئے تمام مہمانوں بالخصوص پروفیسر فیضان مصطفیٰ کا تعارف کرایا۔ اس پروگرام کے کنوینر پروفیسر متھن کمار نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہمارا آئین سب سے اچھا ہے، لیکن اس کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس کے استعمال کرنے والوں پر ہے۔

اس پروگرام میں خصوصی طور پر پروفیسر چندر شیکھر، پروفیسر ریاض عمر، پروفیسر وجیاوینکٹ رمن، پروفیسر مظہر احمد، پروفیسر محمد کاظم، پروفیسر مشتاق عالم قادری، ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر ارشاد نیازی، ڈاکٹر شاذیہ عمیر، ڈاکٹر علی احمد ادریسی، ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر ہردے بھانو پرتاپ، ڈاکٹر عارف اشتیاق، ڈاکٹر فرحت کمال اور دوسرے شعبوں خاص طور سے لا فیکلٹی کے متعدد اساتذہ، طلبا وطالبات شریک ہوئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 جنوری 2023

خدائے سخن میر تقی میر کا تین سو سالہ جشن

نئی دھلی: انجمن ترقی اردو (ہند) کی جانب سے خدائے سخن میر تقی میر کی تیسری صدی تقریبات کا اہتمام نہایت فخر واحتشام کے ساتھ انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر نئی دہلی کے اسٹین آڈیٹوریم میں کیا گیا۔ اس جشن کے دوران میر کی خودنوشت سوانح عمری ذکر میر کے مکمل متن کے اردو ترجمے کی پہلی اشاعت کی رونمائی اہم شخصیات کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ قابل ذکر ہے کہ میر نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ذکر میر کے عنوان سے فارسی میں لکھی تھی، لیکن فارسی میں بھی یہ مکمل متن آج تک شائع نہیں ہوا ہے۔ اردو میں یہ ترجمہ ڈاکٹر صدف فاطمہ نے کیا ہے، جنھوں نے حال ہی میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی

سے پی ایچ ڈی کی ہے۔ اس موقعے پر وپن گرگ کے دیوان میر کا افتتاح بھی ہوا جو انھوں نے ناگری لپی ہی میں نہ صرف مرتب کیا ہے، بلکہ مشکل الفاظ کے معنی اس طرح حواشی میں دیے ہیں کہ قاری کی میر کے استعاروں تک رسائی ہو سکے۔ اس موقعے پر محمود فاروقی جنھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ہے اور دہلی کی تاریخ ان کا اختصاص ہے، نے کہا کہ ذکر میر کے مکمل متن کی اشاعت ہندوستان کی ادبی تاریخ کا اہم واقعہ ہے۔ انھوں نے اس بات کا بھی خصوصی طور پر ذکر کیا کہ انجمن ترقی اردو (ہند) وہ واحد ادارہ ہے جو اردو دنیا کے باہر بھی اردو ادب کی روشنی پھیلا رہا ہے۔ انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر کا آڈیٹوریم اردو کے اس عظیم شاعر کی تیسری صدی تقریبات کے موقعے پر ناظرین سے بھرا ہوا تھا۔ اس تقریب کا ایک مخصوص پہلو محمود فاروقی کی مسحور کن داستان سرائی بھی تھی۔ محمود فاروقی نے داستان کی مکمل طور پر ختم ہو چکی روایت کا نہ صرف احیا کیا ہے، بلکہ اس داستان کو ایک مرتبہ پھر بام عروج تک اس احتشام کے ساتھ پہنچایا کہ دوسری زبان والے رشک کرتے ہیں۔ محمود کی داستان گوئی کے ذریعے بھی اردو غیر روایتی حلقوں میں خوب مقبول ہو رہی ہے۔ میر کی تیسری صدی کی نسبت سے محمود فاروقی نے خصوصی داستان تیار کی جسے اس موقعے پر انھوں نے دارین شاہدی کے ساتھ پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 جنوری 2024

ممتاز شخصیات کو خراج عقیدت

نئی دھلی: عظیم مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر کی برسی کے موقعے پر اے ٹی یو دہلی نے تسمیہ آڈیٹوریم، نئی دہلی میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا۔ پروگرام کے چیئرمین ڈاکٹر سید فاروق نے اپنے صدارتی خطاب میں مولانا محمد علی جوہر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اپنے محسنوں کو یاد رکھنا ہمارا فرض ہے، جن کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ سماجی کارکنوں، ادیبوں اور شاعروں کو یاد کرنا نہ صرف انسانیت ہے بلکہ ان نوجوانوں کے لیے بھی یاددہانی ہے جو اپنے خیرخواہوں کو بھول جاتے ہیں۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے مولانا محمد علی جوہر، پروفیسر بدرالدین الحافظ، قاضی ابرار کرت پوری، واجد سحری، ایم سلیم اور ڈاکٹر راشد خان کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ پروفیسر خالد محمود نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انجمن کا یہ قدم قابل تحسین ہے، ہم اپنے بزرگوں، قابل قدر شخصیات اور بے لوث خدمت گزاروں کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے پروفیسر شہپر رسول نے مرحوم کی اردو سے محبت اور ان کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ فاروق بخشی نے مرحوم کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا اور اے ٹی یو کی خدمات کو سراہا۔ انھوں نے مولانا محمد علی جوہر اور گلزار دہلوی کو بھی خراج عقیدت پیش کیا۔ سوسائٹی کے جنرل سکریٹری جناب رؤف رامیش نے اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 7 جنوری 2024

عربی زبان شعر اور فنون کی زبان

نئی دھلی: عالمی یوم عربی کے موقعے پر مرکز برائے عربی وافریقی مطالعات، جے این یو اور کلچرل اتاشی، سفارت خانہ سعودی عربیہ کے اشتراک سے 'عربی زبان شعر اور فنون کی زبان' کے عنوان پر ایک روزہ سمینار کا انعقاد جے این یو کنونشن سینٹر کے آڈیٹوریم میں کیا گیا، جس کے افتتاحی پروگرام کی صدارت جے این یو ریکٹر پروفیسر ڈاکٹر ایس ٹی گرکوٹی نے کی، جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر سعودی سفیر برائے ہند صالح بن عیدالحسینی اور مہمان اعزازی کے طور پر صومالیہ کے سفیر برائے ہند احمد علی طاہر شریک ہوئے۔ مرکز برائے عربی وافریقی مطالعات کے صدر پروفیسر ڈاکٹر مجیب الرحمٰن نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ عربی زبان ایک ایسی وسیع عالمی زبان ہے، جس کے اندر شعر سے لے کر اقتصادیات، ریاضیات، طبعیات، سائنس اور ٹیکنالوجی سمیت دیگر علوم کو سمیٹنے کی صلاحیت موجود ہے، سعودی کلچرل اتاشی، سفارت خانہ سعودی عربیہ برائے ہند پروفیسر ڈاکٹر خالد بن یوسف برقاوی نے بھی مہمانوں کا استقبال کیا اور کہا کہ مملکت سعودی عربیہ ہمیشہ عربی زبان کے فروغ کے لیے کوشاں ہے اور ہر ممکن طریقے سے ان سے جڑے افراد کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ مہمان خصوصی سعودی سفیر برائے ہند صالح بن عیدالحسینی نے اپنے خطبے میں کہا کہ ہندوستان اور مملکت سعودی عربیہ کے تعلقات آج نہایت خوش آئند مرحلے میں ہیں، انھوں نے عربی زبان کی خدمات کے لیے مملکت سعودی عربیہ کی کوششوں کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ عربی زبان وادب کے لیے سعودی نے نہ صرف سالانہ عالمی انعامات مختص کیے ہیں، بلکہ مختلف اکیڈمیز اور معاہد عالمی پیمانہ پر کام کر رہے ہیں، اور غیر عرب مبتدئین کو اسکالرشپ بھی فراہم کر رہے ہیں۔ اس موقعے پر عربی زبان کے فروغ اور ترقی کے لیے مرکز برائے عربی وافریقی مطالعات، جے این یو کی طرف سے سفیر برائے ہند صالح بن عیدالحسینی کو مومنٹو بھی پیش کیا گیا۔ صومالیہ کے سفیر برائے ہند احمد علی طاہر نے کہا کہ صومالیہ میں عربی زبان اسلام کی آمد سے پہلے داخل ہوگئی تھی، اور صومالی زبان ایک مدت تک عربی ابجد میں لکھی جاتی تھی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر زبیر احمد فاروقی نے کہا کہ عربی زبان اپنی فطری سلاست کی وجہ سے ہر ملک اور ہر زمانے کے لیے موزوں ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر حبیب اللہ خان ندوی نے کہا کہ عربی زبان کا شمار دنیا کی ان پانچ قدیم زبانوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے قدیم تہذیب اور تاریخ کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے جے این یو ریکٹر پروفیسر ڈاکٹر ایس سی گرکوٹی نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ عربی زبان کا اثر ہندوستان کی مختلف زبانوں پر ہوا ہے اور یہ دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں ہے، میری نیک خواہش ہے کہ یہ زبان مزید ترقی کرے، پروگرام کے اخیر میں شعبہ عربی کے استاد ڈاکٹر عبدالقدوس نے تمام مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جنوری 2024

شہید صحافی مولوی محمد باقر

نئی دھلی: پہلی جنگ آزادی میں شہید ہونے والے اردو صحافی مولوی محمد باقر کی عظیم قربانی کی یاد میں پریس کلب آف انڈیا میں پورٹریٹ کی نقاب کشائی کی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اس یادگار تقریب میں سابق ممبر پارلیمنٹ کے سی تیاگی، پریس کلب کے صدر گوتم لہری، مورخ رعنا صفوی اور مولوی باقر کے وارثین میں شامل محترمہ عذرا موسوی اور محترمہ ترانہ حسین نے شرکت کی۔ اس موقعے پر کے سی تیاگی اور گوتم لہری کے ہاتھوں مولوی باقر کے پورٹریٹ کی نقاب کشائی کی رسم ادا کی گئی۔ تقریب کی نظامت کرتے ہوئے اے یو آصف نے 1857 کے حالات اور مولوی باقر کی صحافتی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر مورخ رعنا صفوی نے کہا کہ 1857 میں چھوٹے پیمانے پر جگہ جگہ لڑائیاں شروع ہوئیں۔ دہلی سے اس کا آغاز ہوا، دہلی اردو اخبار کا رول اس اعتبار سے اہم تھا کہ شاہ جہان آباد میں فوج اور سپاہیوں کو اسی اخبار کے ذریعے باہر ہونے والے واقعات کی خبریں مل رہی تھیں۔ مولوی محمد باقر نے اس زمانے میں جا کر وہاں کے حالات کی خبریں جمع کیں اور اخبار کے ذریعے عوام کو باخبر کیا اور جنگ آزادی میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔

عذرا موسوی نے کہا کہ بچپن سے ہم اپنے بڑوں سے مولوی محمد باقر کے بارے میں سنتے آرہے تھے، بچپن میں ان باتوں کی اہمیت سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن دس بارہ سال پہلے میری والدہ کو جب دہلی بلایا گیا تب ہمیں اسی کی اہمیت کا اندازہ ہوا کہ ان کی شہادت بڑا غیر معمولی واقعہ تھا، لہٰذا اب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ملک کی تعمیر و ترقی میں ہمیں بھی اپنا تعاون پیش کرنا چاہیے۔ ترانہ حسین نے کہا کہ مولوی محمد باقر اور ان کے بیٹے محمد حسین آزاد نے ملک کی آزادی کے لیے جو خدمات پیش کیں اور جو بلندی حاصل کی وہ غیر معمولی بات ہے۔ میں خود کو خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ میں ان کے خاندان سے ہوں۔ مہمان خصوصی کے سی تیاگی نے کہا کہ پوری دنیا میں تمام قوموں نے آزادی اور برابری کے حق کے لیے لڑائیاں لڑیں۔ ہمارے ملک میں بھی آزادی کے لیے لڑائی لڑی گئی جس میں سبھی مذاہب کے لوگوں نے حصہ لیا۔ مولوی محمد باقر بھی ان میں سے ایک تھے۔ میرا ماننا ہے کہ بندوق کی مار سے زیادہ قلم کی مار میں دم ہوتا ہے اور اسی قلم کو ہتھیار بنا کر مولوی باقر نے عوام کو انگریزوں کے مظالم سے روشناس کرایا اور جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لیے ان میں جوش بھرا، ایسے عظیم مجاہد کی یاد میں آج یہاں پورٹریٹ کی نقاب کشائی کی تقریب میں مجھے مدعو کیا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرے لیے خوش نصیبی کی بات ہے۔ پریس کلب آف انڈیا کے صدر گوتم لہری، سینئر صحافی سہیل انجم، شعیب رضا فاطمی اور دہلی پردیش کانگریس کمیٹی آئی ٹی سیل کے چیئر مین محمد ہدایت اللہ نے بھی اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے شہید صحافی مولوی باقر کی قربانی کو یاد کیا اور انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 جنوری 2024

اردو اور ہندی کے تخلیقی رشتے

نئی دهلی: ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 'نقاد سے ملاقات' پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس کے تحت ہندی اور

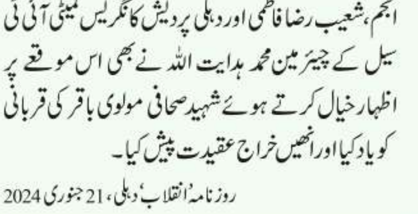

اردو کے اہم نقاد ڈاکٹر جانکی پرساد شرما نے 'اردو اور ہندی کے تخلیقی رشتے' پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر جانکی پرساد شرما نے کہا کہ میں تقریباً چالیس برسوں سے 'اردو اور ہندی کے تخلیقی رشتے' موضوع کی مختلف جہتوں پر کام کر رہا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ اردو غیر ملکی زبان نہیں ہے، یہ تو خالص ہندوستانی زبان ہے۔ اس میں موجود 75 فیصد الفاظ اصل سنسکرت اور پراکرت سے آئے ہیں انھوں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ پروفیسر نارنگ کہا کرتے تھے کہ کوئی خالص فارسی داں ایرانی اردو کے ایک پیرگراف کی قرأت ٹھیک سے نہیں کرسکتا۔ ڈاکٹر جانکی پرساد شرما نے مزید کہا کہ کئی اساتذہ کا ماننا ہے کہ اردو شاعری میں لوک ادب کا فقدان ہے۔ یہ غلط نظریہ ہے۔ دراصل ہندی اور اردو کا لوک ادب مشترک ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں اردو اور ہندی کی ایکتا کا حامی ہوں لیکن اردو رسم الخط کا خون کر کے میں یہ ایکتا بالکل نہیں چاہتا۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی اپنی اپنی اصناف ہیں۔ ہندی غزل اردو غزل سے مختلف ہے۔ دوہا حالانکہ ہندی کی صنف ادب ہے مگر اردو دوہا اردو کی جاگیر ہے، اسے ہندی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر جانکی پرساد شرما نے مشترکہ کلچر کے حوالے سے کھل کر بات کی جسے سامعین نے خوب پسند کیا۔ اس موقعے پر دیگر سامعین کے علاوہ اکادمی کے اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر چندر بھان خیال، ہندی کے معروف ادیب مہیش درپن اور ہریش رائے بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 جنوری 2024

طلبہ کی زبان دانی اور مہارت کے فروغ کے طریقے و وسائل

نئی دهلی: دہلی یونیورسٹی (ڈی یو) شعبہ عربی میں 'طلبہ کی زبان دانی اور مہارت کے فروغ کے طریقے و وسائل' کے موضوع پر توسیعی لیکچر کا انعقاد کیا گیا جس میں کلیدی مقرر کے طور پر مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات جے این یو کے صدر پروفیسر مجیب الرحمٰن نے کہا کہ کسی بھی زبان میں مہارت پیدا کرنے کے لیے طالب علم میں جنون کا ہونا ضروری ہے، عربی زبان ایک عالمی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ معیشت کی زبان بھی ہے، اگر آپ اس زبان پر قدرت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اس زبان کے ساتھ جینا ہوگا، اسے گفت و شنید کی زبان بنانا ہوگا اور اپنی محنت میں تسلسل اور دوام پیدا کرنا ہوگا۔ انھوں نے زبان دانی کے عناصر اربعہ یعنی پڑھنا، لکھنا، سننا اور بولنا کو عربی زبان کے تناظر میں تفصیل کے ساتھ طلبا کو سمجھاتے ہوئے کہا ہمیں اپنا موازنہ دوسری فارن لینگویجز سیکھنے والے طلبہ سے کرنا چاہیے اور عربی مخارج پر خصوصی اہمیت دینی ہوگی۔ اس سے قبل توسیعی لیکچر کا تعارف کراتے ہوئے شعبہ عربی ڈی یو کے صدر پروفیسر سید حسنین اختر نے کہا کہ طلبہ کی علمی سرگرمیوں کو نئی سمت دینے کے لیے شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی نے توسیعی لیکچر کا ایک سنہرا سلسلہ شروع کیا ہے جس کی آج یہ دوسری کڑی ہے۔ شعبہ کی کوشش ہے کہ ہندوستان میں عربی کے سینئر اساتذہ کے علمی ورثے سے اپنے طلبہ کو استفادے کا موقع فراہم کرایا جائے، انھوں نے کلیدی خطبہ پیش کرنے آئے پروفیسر مجیب الرحمٰن، پروگرام کے صدر پروفیسر شفیق احمد خان ندوی اور مہمان خصوصی ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر ایتابھ چکرورتی کا شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر ایتابھ چکرورتی نے طلبہ سے زبان سیکھنے کے عمل میں جدید ٹیکنالوجی کی مدد لینے کی صلاح دی اور شعبہ عربی کی علمی سرگرمیوں کی ستائش کی۔ پروگرام کے صدر پروفیسر شفیق احمد خان ندوی ریٹائرڈ پروفیسر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے پروفیسر مجیب الرحمٰن کے خطبے کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ عربی زبان پر قدرت جب ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ جب ہم اسے اپنی زندگی کا حصہ بنالیں۔ انھوں نے شعبہ عربی کے اس اقدام کی سراہنا کی اور اس نوعیت کے لیکچر کو طلبہ کے لیے نہایت مفید قرار دیا۔ پروگرام کی نظامت شعبہ کے استاذ ڈاکٹر مجیب اختر نے کی جب کہ شعبہ کے دوسرے استاذ ڈاکٹر اصغر محمود نے شکریے کی رسم ادا کی۔ پروگرام میں پروفیسر نعیم الحسن سابق صدر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی، ڈاکٹر محمد اکرم شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی، پروفیسر محمد کاظم، پروفیسر مشتاق عالم، پروفیسر علیم اشرف، ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر محمد قاسم، ڈاکٹر ظفیر الدین شعبہ عربی ذاکر حسین کالج، ڈاکٹر مشتاق سینٹ اسٹیفن کالج، ڈاکٹر آصف اقبال، ڈاکٹر ابوتراب، محمد اسامہ کے علاوہ بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالر و طلبہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 جنوری 2024

اتر پردیش

ڈاکٹر یونس غازی کی ادبی خدمات

میرٹھ: اسماعیل میرٹھی کی وجہ سے میرٹھ کا نام دور دور تک مشہور رہے۔ ڈاکٹر یونس غازی نے میرٹھ کی ادبی روایت کو قائم رکھا ہے اور یونس غازی کی تمام تخلیقات اس بات کا ثبوت ہیں۔ یہ الفاظ تھے سابق صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی پروفیسر خالد محمود کے جو یہاں شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے پریم چند سمینار ہال میں اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔

انھوں نے مزید کہا کہ یہاں پڑھنے والے تمام طالب علم مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان کو اتنا اچھا شعبہ پڑھنے کو ملا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کے فرائض پروفیسر خالد محمود نے انجام دیے اور مہمانان خصوصی کے بطور پروفیسر تسنیم فاطمہ (سابق نائب شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) اور پروفیسر وائی وملا (سابق نائب شیخ الجامعہ، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ) نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی نے انجام دیے۔ اس دوران ڈاکٹر یونس غازی کی دو کتابوں 'انمول خزانہ' (بچوں کے لیے نظمیں) اور 'عکس دروں' (نظموں کا مجموعہ) کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر یونس غازی کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک شال، ایک ٹرافی اور ایک کولاژ فوٹو فریم دے کر اعزاز سے نوازا گیا۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر وائی وملا نے کہا کہ اردو بہت خوبصورت زبان ہے اور اردو کا سفر چلتے رہنا چاہیے۔ میں دعا گو ہوں کہ شعبۂ اردو کی یہ ادبی سرگرمیاں اسی طرح جاری وساری رہیں۔ پروفیسر تسنیم فاطمہ نے کہا کہ ڈاکٹر یونس غازی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں یہ جشن نہایت کامیاب رہا۔ میں ان کو دل سے مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ یونس غازی کا کلام ان کے جذبات واحساسات کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کی شاعری فنی اعتبار سے، افکار و نظریات کے اعتبار سے اہم شاعری ہے۔ دوسرا تکنیکی اجلاس ایک بجے منعقد ہوا جس کی مجلس صدارت پر پروفیسر جمال احمد صدیقی (صدر شعبۂ لائبریری سائنس)، ڈاکٹر خالد مبشر، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور پروفیسر اسلم جمشید پوری رونق افروز رہے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر شاداب علیم نے 'دبستان میرٹھ کا نمائندہ شاعر: ڈاکٹر یونس غازی'، ڈاکٹر آصف علی نے 'ڈاکٹر یونس غازی کی نعت گوئی'، ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے 'ڈاکٹر یونس غازی کی تحقیقی وتنقیدی بصیرت'، ریسرچ اسکالر عظمیٰ سحر نے 'ڈاکٹر یونس غازی فکر وفن کے آئینے میں'، شاہد چودھری نے 'عکس دروں' اور نوید خان نے ڈاکٹر یونس غازی: بحیثیت نظم گو شاعر 'عکس دروں' کے حوالے سے اپنے پرمغز مقالات پیش کیے۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر جمال احمد صدیقی نے کہا کہ یونس غازی ہمارے شہر کی معزز شخصیت کے ساتھ ساتھ بااخلاق انسان اور ایک اچھے ادیب ہیں۔ انھوں نے نثر اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی ہے اور دونوں میدانوں میں بے مثل کارنامے انجام دیے ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر خالد مبشر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 5 فروری 2024

بہار

شیوہر میں فروغِ اردو سمینار

باراچکیا: اردو ہمارے دل میں بستی ہے اور روزمرہ کی زندگی میں ہم سبھی اس کو خوب خوب استعمال کرتے ہیں اور الفاظ کے حسن و جمال سے معلوم کرتے ہیں کہ یہ اردو

ہے۔ اردو ہر ہندوستانی کی زبان ہے اور اپنی شیرینی، مٹھاس اور شعر وشاعری کے سبب ہمارے دلوں پر راج کرتی ہے۔ مذکورہ باتیں محبّ اردو اور شیوہر کے فعال اور متحرک ڈی ایم پنکج کمار نے محکمہ کابینہ سکریٹریٹ اردو ڈائریکٹوریٹ پٹنہ کی ہدایت کی روشنی میں گاندھی نگر بھون شیوہر میں منعقدہ فروغ اردو سمینار، مشاعرہ اور عمل گاہ سے خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ موصوف نے مزید کہا کہ وہ چالیس سال قبل اردو کے زلف گرہ گیر کے شکار ہوئے اور ایک دوست سے اردو لکھنا سیکھا اور اب تک اپنا نام اردو میں بھی لکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حکومت اردو کی ترویج واشاعت کے لیے پابند عہد ہے اور اس کے ہمہ گیر ترقی کے لیے اردو اساتذہ کی بحالی کا عمل جاری ہے۔ شیوہر میں بھی ضلع اردو زبان سیل پوری توانائی کے ساتھ اپنے فرائض کو احسن طریقے سے انجام دے رہا ہے اور یہ شاندار ادبی محفل سیل کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ موصوف نے کہا کہ ضلع کے سبھی سرکاری پروگرام میں اردو زبان کی شمولیت کو لازم کیا جائے گا تا کہ ضلع میں عوامی سطح پر اردو کی بھرپور ترقی ہو اور لوگ اس کو لکھنا پڑھنا سیکھیں۔ ڈی ڈی سی اتل کمار ورما نے سمینار اور معاشرہ کی محفل کو اردو میں جامع خطاب کیا اور اردو کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی۔ افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ایس ڈی ایم شیوہر آفاق احمد نے کہا کہ ملک کے تقسیم کے باوجود اردو پوری آن بان اور شان کے ساتھ زندہ ہے اور روز افزوں ترقی کر رہی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ عوامی زبان ہے اور اس کو ہر ہندوستانی کا پیار اور ایثار حاصل ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ جس کی اردو اچھی ہوگی اس کی دوسری زبان بھی اچھی ہوگی۔ اس لیے اساتذہ کو چاہیے کہ پوری دیانت داری اور لگن سے طلبہ کو اردو کی تعلیم دیں۔ اردو کے فروغ میں اساتذہ کا اہم کردار ہے اور اس کو قائم رکھنا ہماری ذمے داری ہے۔ موصوف نے ایک کہنہ مشق شاعر کی حیثیت سے اپنے تازہ کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ انچارج افسر ضلع اردو زبان سیل مع اسسٹنٹ ڈائرکٹر اقلیتی فلاح اودھیش کمار نے افتتاحی کلمات ادا کیے اور تشریف لانے والے مہمانوں کا پرجوش استقبال کیا۔ موصوف نے اپنے خطبے میں اردو کی پیدائش، تاریخی نوعیت اور علاقے کے تعلق سے اہم معلومات سے سامعین کو روشناس کیا۔ موصوف کی خصوصی دلچسپی نے اس پروگرام کو کامیابی عطا کیا۔ قاضی فخر الدین قاسمی، مفتی ساجد اقبال قاسمی اور مناظر ارشد نے مختلف عنوانات پر مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 جنوری 2024

مرزا اسداللہ خاں غالب ومولانا محمد علی جوہر

بتیا: ادارہ ادب اسلامی ہند بتیا کی جانب سے ایک ادبی نشست مورخہ 31 دسمبر 2023 بروز اتوار مرزا اسد اللہ

خاں غالب ومولانا محمد علی جوہر کے نام سے جناب محمد علی صاحب (امیر مقامی) جماعت اسلامی ہند بتیا کے دولت خانے پر منعقد ہوئی'اس تقریب کی صدارت بزرگ اور کہنہ مشق شاعر ابوالخیر نشتر نے کی اور نظامت کا فریضہ ادارہ کے صدر جناب محمد قمر الزماں قمر نے ادا کیا' تقریب دو ادوار پر مشتمل تھی پہلے دور میں مرزا اسد اللہ خاں غالب اور مولانا محمد علی جوہر عنوانات پر مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر ایم عارف نے 'مرزا اسد اللہ خاں غالب کی نثر نگاری' کے عنوان پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر غالب کا 'اردو دیوان' اردو ادب کا تاج محل ہے تو غالب کی 'نثر' قطب مینار اور لال قلعہ سے کم نہیں۔ شعری اور نثری ادب کی تاریخ میں غالب کو یکساں اہمیت حاصل ہے لیکن غالب کی نثر کے ساتھ بدقسمتی یہ ہے کہ ناقدین ادب نے غالب کی شاعری کو ہی اپنی بحث کا موضوع خاص بنایا ہے اور اس عظیم المرتبت ادیب کو دنیا کی نظر میں صرف شاعر ہی تسلیم کیا جاتا رہا ہے اور اس کی نثر سے چشم پوشی کی جاتی رہی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ادھر چند برسوں میں اردو نثر میں غالب کی نثر پر کئی تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں اس کے برعکس اردو شاعری میں غالب پر ہزاروں تحقیقی مقالے اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور اس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے جبکہ غالب کی نثر غالب کی شاعری سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔ دوسرے مقالہ نگار فہیم حیدر ندوی سکریٹری ادارہ ادب اسلامی ہند بتیا نے مولانا محمد علی جوہر کے عنوان پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر صرف ایک فرد نہیں بلکہ اپنے آپ میں ایک انجمن تھے، آزادی کے بے باک سپاہی تھے آپ کے تذکرہ کے بغیر آزادئی ہند اور اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ آپ کی شاعری روح کو تڑپا دینے والی ہے آپ نظم کے ساتھ غزل گو اور نثر نگار بھی تھے ہندو مسلم اتحاد ہو' قوم پرستی ہو' مکمل آزادی کا مطالبہ ہو ان تمام مقاصد کے لیے آپ کی زندگی وقف تھی۔ آزادی کی جد و جہد کا سرگرم حصہ ہونے کی وجہ سے زندگی کا کافی حصہ قید و بند میں گزرا۔ آپ کو اردو شعر و ادب سے دلی شغف تھا۔ اخیر میں جان عالم، حسن معاویہ، آفاق عالم اور اقبال رضا کریسنٹ کمپیوٹر نے بھی اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اس کے علاوہ شمیم خاں' امان اللہ آفتاب عالم' ماجد عالم' سید ایان وغیرہم کی بھی شرکت نے ادبا و شعرا کا حوصلہ بڑھایا۔ تقریب کا اختتام حسن معاویہ کی دعا پر ہوا۔

پریس ریلیز: فہیم حیدر ندوی، سکریٹری ادارہ ادب اسلامی ہند مغربی چمپارن (بہار)، 10 جنوری 2024

فروغ اردو سمینار

موتیہاری: اردو ڈائریکٹوریٹ بہار کے حسب ہدایت ضلع فروغ اردو سیل موتیہاری کے زیر اہتمام ٹاؤن ہال میں فروغ اردو سمینار و مشاعرہ کا انعقاد ہوا جس کا آغاز مشری چمپارن ڈی ایم سوربھ جوروال نے شمع روشن کر کے کیا۔ اس موقعے سے ڈی ایم سوربھ جوروال نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان و ادب گنگا جمنی تہذیب کی شناخت ہے۔ اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے ہم سب کو مل کر آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ اردو زبان کے اکثر و بیشتر الفاظ عام لوگ بآسانی سمجھ لیتے ہیں۔ تمام اردو اساتذہ اردو کی تعلیم کو بہتر سے بہتر کریں۔ بہار سرکار کے ذریعے اردو فروغ کے لیے چلائے جا رہے منصوبے سے استفادہ کریں۔ ضلع پنچایتی راج افسر و انچارج فروغ اردو سیل اپیندر کمار پال نے کہا کہ زبان کسی مذہب و دھرم کی نہیں ہوتی ہے، بلکہ وہ اپنے ملک کی زبان ہوتی ہے۔ بغیر اپنی زبان کی ترویج و اشاعت کے بغیر ملک کی ترقی نہیں ہو سکتی ہے۔ دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک نے اپنی زبان کی ترویج و اشاعت پر خصوصی توجہ دی اور آج وہ ہر محاذ پر کامیاب ہیں۔ گھر گھر میں اردو ہندی کی شمع روشن کرنے کی ضرورت ہے۔ محکمہ اردو ڈائریکٹورٹ کا مقصد ہی اردو زبان کی ترویج و ترقی ہے۔ جب تک ہم ایک دوسرے کی قدر نہیں کریں گے خود ہمیں عزت نہیں ملے گی۔ ہمیں اپنی زبانوں کی حفاظت کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ ایم ایس کالج موتیہاری کے صدر شعبہ اردو مشہود احمد ندوی نے کہا کہ ہندوستان کی پاکیزہ سرزمین پر آنکھ کھولنے والی سب سے پیاری زبان اردو زبان ہے۔ اردو کی شیرینی و مٹھاس کا عالم یہ ہے کہ اس کے اندر ہر انسان کی روح کی تسکین کا سامان ہے۔ اردو کی تعلیم کے ذریعے بھی ہم سرکاری ملازمت حاصل کر سکتے ہیں۔ مولانا غلام ربانی مصباحی صدر بلاک مترجم موتیہاری نے کہا کہ اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے حکومت بہار پابند عہد ہے۔ اسکولوں میں اردو کی خالی اسامیوں کو پر کرنے کے لیے ہر ممکن اقدام کر رہی ہے۔ اس موقعے سے ابوٹا کے خازن محمد فیروز عالم نے مقالہ پیش کرتے ہوئے اردو کے فروغ اور طلبا میں اردو کے تئیں گھٹتے رجحان پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ سرکار اردو کے فروغ کے لیے کوشاں ہے لیکن اس کے باوجود سسٹم کی خامیوں کی وجہ سے اردو کا کما حقہ فروغ نہیں ہو پا رہا ہے۔ اظہر حسین انصاری نے کہا کہ اردو زبان کی تعلیم و تدریس پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اردو کو ہم اپنی بول چال کی زبان بنا لیں۔ صحافی انتظار الحق نے کہا کہ سخت جاڑے کے باوجود بھی فروغ اردو سمینار و مشاعرہ میں کثیر تعداد میں اردو ساتذہ و محبان اردو کی شرکت اپنی پیاری زبان سے بے پناہ الفت و محبت کی نشانی ہے۔ ناظم سمینار صحافی جناب عزیر انجم نے کہا کہ اہل اردو زبان و ادب کو احساس کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہیے بلکہ انھیں ہمیں ہمت و حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے اور اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے ہر ممکن اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 جنوری 2024

اردو زبان پر ایک روزہ ورکشاپ

بہار شریف (نالندہ): ضلع ہیڈ کوارٹر بہار شریف شہر کے اسپتال جوراہا کے قریب واقع ٹاؤن ہال میں اردو کی ترقی اور اس کے فروغ کے لیے ایک روزہ ورکشاپ، سمینار اور مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس پروگرام کا افتتاح ضلع مجسٹریٹ ششا نک سبھانکر نے شمع روشن کر کے کیا جب کہ پروگرام کی صدارت بینام گیلانی نے کی اور نظامت تنویر ساکت نے کی۔ اس موقعے پر ضلع مجسٹریٹ نے اردو زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ملک اور ریاست کی ثقافتی ترقی میں اردو زبان کا کردار اہم رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ حکومت کی طرف سے اردو کی ترقی کے لیے تمام تر کوششیں کی جا رہی ہیں اور جہاں کہیں زیادہ ضرورت ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ حکومت سے وہ اسے پورا کرانے کی کوشش کریں گے۔ اے ڈی جی فاریسٹ نالندہ محمد اسرار احمد نے اردو زبان کی تعریف کی اور اردو کو ہندی کی بہن قرار دیتے ہوئے کہا کہ اردو اور ہندی دونوں کا تال میل نہایت ہی ضروری

ہے۔ مزید انھوں نے کہا کہ اسکولوں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو کے موضوعات پر مباحثوں اور پروگراموں کے انعقاد سے بھی اردو کی ترقی کی رفتار تیز ہوگی۔ پروگرام میں لوگوں کی کم شرکت پر فخر الدین عارفی نے کہا ایسے پروگراموں میں صرف اردو سے محبت کرنے والے ہی شرکت کرتے ہیں۔ انھوں نے ہر گھر میں اردو اخبار لینے کا مشورہ دیا تا کہ گھروں کے بچے بھی اردو کو اچھی طرح سیکھ سکیں۔ ضلع اوقات کمیٹی کے سکریٹری محمد سلطان انصاری نے کہا کہ اردو ترقی کے لیے ہم سب کو کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کی ترقی کے لیے سبھی لوگوں کو فکرمند ہونے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے مقامی طور پر بھی پروگرام کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ جس قوم کی زبان مرجاتی ہے اس قوم کو مردہ قوم کہا جاتا ہے۔ پر اوقاف کمیٹی کے ضلع صدر منا ملک، محمد اصغر شمیم، محمد ارشد استھانوی، ڈاکٹر اے کے علوی کے علاوہ سبھی لوگوں نے اپنے خطاب میں اردو کی ترقی کے لیے گھروں میں ادو پڑھانے، اردو اخبار خریدنے اور سبھی جگہوں پر اردو کا استعمال کرنے پر تفصیل سے گفتگو کی اور اردو زبان کی ترقی کے طویل سفر پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 31 جنوری 2024

تلنگانہ

دکنی زبان وادب: تاریخ وتحقیق

حیدرآباد: شعبہ اردو، اسکول آف ہیومانیٹیز، یونیورسٹی آف حیدرآباد کے زیر اہتمام، شریمتی راجکماری اندرا

دیوی دھن راجگیر کے تعاون سے ایک روزہ قومی سمینار بعنوان 'دکنی زبان و ادب تاریخ اور تحقیق' مورخہ 18 جنوری 2024 بروز جمعرات بوقت 10:30 بجے اسکول آف ہیومانیٹیز کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ اس سمینار میں افتتاحی اور اختتامی اجلاس کے علاوہ تین ٹکنیکل سیشن کا اہتمام کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر وی کرشنا (ڈین، اسکول آف ہیومانٹیز، یونیورسٹی آف حیدر آباد) نے کی اور پروگرام کے مہمان خصوصی پروفیسر خطیب سید مصطفیٰ (سابق صدر، شعبہ، لسانیات، اے ایم ایو) پروفیسر مجید بیدار (سابق صدر، شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد)، پروفیسر نسیم الدین فریس (سابق ڈین، اسکول آف لینگویجز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)، پروفیسر شوکت حیات اور پروفسر قاسم علی خان (سابق صدر شعبۂ اردو، ڈاکٹر بی آر اے او یو) شامل تھے۔

پروگرام کی نظامت شام عرفات ریسرچ اسکالر، یونیورسٹی آف حیدرآباد نے کی۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر فضل اللہ مکرم نے تمام مہمانوں کا فرداً فرداً استقبال کیا۔ اس کے بعد اس سمینار کے کوآرڈینیٹر نشاط احمد (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد) نے سمینار کے اعراض و مقاصد بیان کرتے ہوے کہا کہ "دکنی زبان کی اہمیت کو اجاگر کرنا۔ نئی نسل کو دکنی زبان کی اہمیت اور دکنی زبان کی قرات سے واقف کرانا۔ طلبا کو دکنی تحقیق کی طرف مائل کرانا۔ دکنی مخطوطات تک رسائی حاصل کرانا ہے۔ انھوں نے کہا کہ دکنی کو بادشاہوں کی سر پرستی ملی ہے لہٰذا اس دور میں بہت سی تصنیفات وجود میں آئیں۔ آج بھی کئی مخطوطات لائبریریوں میں موجود ہے لیکن ان پر کام کرنے والے موجود نہیں ہیں"۔

پروفیسر شوکت حیات کو دعوت سخن دی گئی۔ انھوں نے کہا کہ دکنی کے حوالے سے بہت سے گوشے ہیں جن پر بات ہونی چاہیے، انشاء اللہ ہم آگے بھی اس طرح کے سمینار میں شریک ہوں گے۔ ان کے بعد پروفیسر خطیب سید مصطفیٰ (سابق صدر، شعبہ، لسانیات، اے ایم یو) نے خطاب فرمایا۔ انھوں نے دکنی کو لسانیات کے نقطہ نظر سے سمجھانے کی کوشش کی، کلاسکی دکنی اور عصری دکنی کے درمیان کے لسانی فرق کی طرف اشارہ کیا، نیز انھوں نے کہا کہ سولہویں سترھویں صدی کی دکنی کو کلاسیکل دکنی کہنا چاہیے، وقت گزرنے کے ساتھ جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ان کو سمجھنے اور تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے بعد پروفیسر مجید بیدار نے قدیم مثنویوں کے اشعار سنا کر ان کے لسانی حسن پر گفتگو کی۔ انھوں نے بتایا کہ بہمنی دور کی دکنی میں فارسی اور عربی کے بنسبت سنسکرت کے الفاظ زیادہ تھے۔ 1600 کے بعد دکنی میں سنسکرت کی جگہ عربی اور فارسی نے لے لی۔ انھوں نے دکنی کو چند حصوں میں تقسیم کیا۔ جن میں، اورنگ آبادی دکنی، ارکاٹی دکنی، میسوری دکنی، براری دکنی وغیرہ اہم ہیں۔ انھوں نے کلاسکی دکنی اور عصری دکنی میں جمع بنانے کے طریقے کو بتایا۔ انھوں نے کہا کہ کلاسکی دکنی میں فاعل کے ساتھ ساتھ فعل کو بھی جمع بنانے کی روایت تھی۔ مثلاً لڑکیاں آتیاں ہیں۔

سمینار کے کلیدی خطبے کے لیے پروفیسر نسیم الدین فریس (سابق ڈین، اسکول آف لینگویجز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی) نے انتہائی پر مغز کلیدی خطبہ دیا جو واقعی میں سمینار کا کلید ثابت ہوا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں دکن کی پوری تاریخ کا احاطہ کیا۔ تقریر کے آغاز میں ہی واضح کیا کہ دکنی زبان کے بارے میں عام طور پر یہ غلط فہمی ہے کہ آج جو دکنی بولی جاتی ہے یہ وہی دکنی ہے جو قلی قطب شاہ اور وجہی کے دور میں بولی جاتی تھی حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ آج جو دکنی بولی جاتی ہے اس میں جملوں کی ساخت معیاری اور قدیم دکنی سے بالکل مختلف ہے۔ انھوں نے بتایا کہ 1347ء میں جب بہمنی سلطنت کی بنیاد پڑی تو دکنی نے یہاں بولی کی سطح سے اٹھ کر زبان کی شکل اختیار کر لی جسے اشرف بیابانی نے ہندوی کہا ہے۔ پروفیسر نسیم الدین فریس نے دکنی میں تحقیق وتنقید کی روایت پر بھی روشنی ڈالی۔ خطبے کے بعد اجلاس کے صدر پروفیسر وی کرشنا (ڈین، اسکول آف ہیومانٹیز، یونی ورسٹی آف حیدرآباد) نے صدارتی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ہندی میں دکنی پڑھاتے تھے جو تلگو زبان سے ملتی جلتی تھی حالانکہ میرا ماننا ہے کہ دکنی وہ نہیں ہے بلکہ اس سے بہت مختلف ہے۔ انھوں نے راجکماری اندرا دیوی کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے دکنی کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے انھوں نے یہ بھی کہا کہ میری خواہش تھی کہ شعبہ اردو اور شعبہ ہندی دونوں کے اشتراک سے دکنی پر ایک سمینار منعقد ہو لیکن چند وجوہات کی بنا پر یہ ممکن نہ ہو سکا۔ مجھے خوشی ہے کہ شعبہ اردو نے اس طرف توجہ کی اور ایک اچھے موضوع پر سمینار کروایا۔ صدارتی کلمات کے بعد ڈاکٹر محمد کاشف (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد) نے تمام مہمانان وحاضرین کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کیا۔

ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد پہلی نشست کا آغاز ہوا، جس کی نظامت اسماء امروز ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد نے کی۔ اس نشست کی

صدارت پروفیسر مجید بیدار (سابق صدر، شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد) پروفیسر خطیب سید مصطفیٰ (سابق صدر، شعبہ لسانیات، اے ایم ایو) نے کی۔ ان حضرات کی صدارت میں کل پانچ مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر شیخ سلیم (سابق صدر، شعبہ اردو انوار العلوم ڈگری کالج حیدر آباد) نے 'دکنی محقق عبد الجبار خان صوفی ملکا پوری کی خدمات'، جناب علی مصری (سابق صدر، شعبہ اردو، انڈین اسکول، جدہ) نے 'دکنی کے غیر دکنی محققین سخنوران گجرات۔ ایک جائزہ' ڈاکٹر حمیرہ سعید (ایسوسی ایٹ پروفیسر گورنمنٹ ڈگری کالج سنگاریڈی) نے 'دکنیات کی تدریس و تفہیم میں دکنی لغات کی اہمیت' ڈاکٹر وصی اللہ بختیاری (گورنمنٹ ڈگری کالج کڈپہ) نے 'رائل سیما کے دو چکی نامے، ایک تحقیقی جائزہ' ڈاکٹر رئیس فاطمہ نے 'دکنی ادب کی تحقیق و بازیافت' پر اپنے مقالات پیش کیے۔ ان مقالات کے بعد اس نشست کے صدور پروفیسر مجید بیدار (سابق صدر، شعبہ اردو، عثمانیہ یونی ورسٹی، حیدرآباد) اور پروفیسر خطیب سید مصطفیٰ (سابق صدر، شعبہ لسانیات، اے ایم ایو) نے صدارتی کلمات میں پیش کیے گئے مقالوں پر تبصرہ کیا۔

ظہرانے کے بعد تیسری نشست کا آغاز ہوا جس کی نظامت قمر مغل ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد نے کی۔ اس نشست کے صدور پروفیسر نسیم الدین فریس (مانو) اور ڈاکٹر معید جاوید (جامعہ عثمانیہ) تھے۔ اس نشست میں کل چھ مقالے پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر نثار احمد نے (ایس وی یو یونیورسٹی تیروپتی) 'شہر میریہ خانوادہ کے چند شعرا کا دکنی کلام' ڈاکٹر بدر سلطانہ (مانو) نے ہاشمی بیجاپوری بحیثیت ریختی گو شاعر' ڈاکٹر صبیحہ نسرین (اویو) نے 'معراج نامہ' ڈاکٹر منیب آفاق، ڈاکٹر سمیہ تمکین نے (ڈاکٹر بی آر اے یو حیدرآباد) 'محمد قلی قطب شاہ کی مذہبی شاعری' اسماء امروز نے 'ولی کی جمالیاتی کائنات' پر اپنے مقالے پیش کیے۔ تیسری نشست کی نظامت نہا نورین ریسرچ اسکالر یونیورسٹی آف حیدرآباد نے کی۔ نشست کی صدارت کا فریضہ پروفیسر حبیب نثار (سابق صدر شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد) اور پروفیسر شوکت حیات نے انجام دیا۔ اس نشست میں کل سات مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر فاروق باشا (گورنمنٹ ڈگری کالج نندیال) نے 'دکنی مثنوی میں ہندوستانی عناصر'، ڈاکٹر عظمت اللہ (گورنمنٹ آرٹس اینڈ سائنس کالج محبوب نگر) نے 'فلم اور میڈیا میں جدید دکنی زبان: ایک جائزہ'، ڈاکٹر عبدالقوی (تلنگانہ یونیورسٹی نظام آباد) نے 'دکنی ادب اور پروفیسر رفیعہ سلطانہ' کفیل احمد (ریسرچ اسکالر یونیورسٹی آف حیدرآباد) نے 'پرت نامہ ایک نامراد مثنوی'، نازیہ بیگم (ریسرچ سکالر یونیورسٹی آف حیدرآباد) نے 'ڈاکٹر زور کے ادبی کارنامے'، نسرین (ریسرچ اسکالر یونیورسٹی آف حیدرآباد) نے 'نذیر دہقانی اور گلی نلگنڈوی کی شاعری میں محاورے' کے عنوانات کے تحت اپنے مقالے پیش کیے۔ اس کے بعد صدور نشست پروفیسر شوکت حیات اور وفیسر حبیب نثار نے مقالات پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

ٹیکنکل سیشن کی نظامت ڈاکٹر اے ار منظر (ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد) نے کی۔ اسٹوڈنٹ یونین یونیورسٹی آف حیدرآباد کے صدر اور شعبہ اردو کے ریسرچ اسکالر عتیق احمد ڈاکٹر مدثر احمد گنائی (جموں وکشمیر)، ریاض احمد، (ریسرچ اسکالر یونیورسٹی آف حیدرآباد)، ڈاکٹر وصی اللہ بختیاری (گورنمنٹ ڈگری کالج کڈپہ) ڈاکٹر غوثیہ سلطانہ (مہیلا یونیورسٹی)، ڈاکٹر حمیرہ سعید (سنگا ریڈی) وغیرہ نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے سمینار کی کامیابی پر منتظمین سمینار کو مبارک باد دی۔

پریس ریلیز: سید فضل اللہ مکرم، حیدرآباد، 24 جنوری 2024

تملناڈو

تمل ناڈو اسٹیٹ اردو اکیڈمی، چنئی کا اعزازی اجلاس

چنئی: یوم جمہوریہ کے موقعے پر تمل ناڈو اسٹیٹ اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام ایک شاندار اعزازی اجلاس اور کل ہند اردو مشاعرہ منعقد ہوا۔ یہ تاریخ ساز اجلاس 26 اور 28 جنوری 2024 کو منعقد ہوا۔ پہلا اجلاس قائد ملت گورنمنٹ آرٹس کالج، فار ویمن، چنئی میں انعقاد پذیر ہوا اور دوسرا اجلاس تمل ناڈو بیت المال کے فنکشن ہال میں منعقد ہوا۔ اس جلسے کے مہمان خصوصی کی حیثیت سے وزیر اوقاف جناب چنجی مستان صاحب تشریف فرما تھے۔ آپ کے ہاتھوں اس جلسے کا افتتاح عمل میں آیا۔ نیز تحریری وتقریری مقابلوں میں کامیاب ہونے والے طلبہ و طالبات کو وزیر اوقاف نے اپنے اسناد تقسیم کیں۔ اس اجلاس میں چنئی شہر کے تقریباً بیس سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں کے طلبا اور طالبات پورے جوش وخروش کے ساتھ شریک رہے۔ پہلے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر وسیم باری نے فرمائی۔ اردو اکیڈمی کے وائس چیرمین ڈاکٹر نعیم الرحمٰن نے اجلاس میں شرکت کرنے والے تمام مہمانان کا تعارف کرایا۔ اس اجلاس میں روس کے قونصل جنرل جناب الیکزینڈر ڈونوڈو، رجسٹرار بی ایس عبد الرحمٰن یونیورسٹی۔ ڈاکٹر راجا حسین، سابق شیخ الجامعہ، تمل ناڈو اوپن یونیورسٹی جناب کے پارتھا سارتھی، رجسٹرار مدراس یونیورسٹی جناب آر ویویکانندن، ڈاکٹر جعفر اکبر خان، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ آف مدراس اور شعبہ اردو مدراس یونیورسٹی کے پروفیسر جناب ڈاکٹر ایم بی امان اللہ نے شرکت کی۔ اس اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر نعیم الرحمٰن نے تمل ناڈو اردو اکیڈمی کے تحت ایک شاندار کتب خانہ کی تشکیل دینے کا مطالبہ رکھا۔ اس مطالبے کی وزیر اوقاف جناب چنجی مستان نے تائید کی اور بہت جلد اس پر عمل پیرا ہونے کا یقین دلایا۔ اس جلسے میں مختلف اسکولوں کے طلبا و طالبات نے اپنی بہترین ثقافتی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اس اجلاس میں تمل ناڈو کے مختلف کالجوں کے اساتذہ کو مہمانان خصوصی کے ہاتھوں تمغوں سے نوازا گیا۔ وزیر اوقاف چنجی مستان صاحب نے اپنے خصوصی خطاب میں ڈاکٹر عبد الرحمٰن کی اردو خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں دلی مبارکباد پیش کی جب کہ ڈاکٹر طیب خرادی، نیو کالج چنئی نے ہدیہ تشکر پیش کیا۔ دیگر مہمانان اعزازی نے بھی یوم جمہوریہ کے تعلق سے بصیرت افروز تقریریں فرمائیں۔

تمل ناڈو اردو اکیڈمی کا دوسرا اجلاس اور کل ہند اردو مشاعرہ تمل ناڈو بیت المال کے فنکشن ہال میں پورے آب وتاب کے ساتھ انعقاد پذیر ہوا۔ یوم جمہوریہ کے اس تقریب میں تمل ناڈو کے قد آور شعرا و شاعرات نے اپنا کلام سنا کر داد وتحسین حاصل کی۔

پریس ریلیز: عائشہ صدیقہ۔ جے، تمل ناڈو، 31 جنوری 2024

راجستھان

غالب غدر کے پس منظر میں

نئی دہلی: گورنمنٹ لوہیا کالج، چورو ضلع راجستھان کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام مرزا غالب پر ایک روزہ سمینار 'غالب غدر کے پس منظر میں' کے عنوان سے منعقد ہوا۔ اس موقعے پر شمشاد علی نے بغاوت کے دوران غالب کی زندگی پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب نے مشکل حالات میں بھی اپنا تحریری کام جاری رکھا اور فارسی کتاب دستنبو لکھ کر ہمیں 1857 کے حالات سے روشناس کرایا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی ایڈیشنل پولس سپرنٹنڈنٹ اے سی پی جھنجھنو اسماعیل خان تھے۔ غالب کی شاعری کے ذریعے انھوں نے 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے دوران غالب کے ادبی کارناموں پر گفتگو کی، جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا۔ اس موقعے پر اسماعیل خان کو لوہیا کالج کی جانب سے شعبہ اردو کو فرنیچر فراہم کرنے پر یادگاری تحفہ بھی دیا گیا۔ اردو سمینار کے کلیدی مقرر پروفیسر ایس ڈی سونی نے غالب کی ادبی زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ غالب کے خطوط سے ہم پہلی جدوجہد آزادی اور غالب کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ انھوں نے غالب کو ہندوستان کا قیمتی ورثہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایسے شاعر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ پرنسپل ڈاکٹر جے بی خان نے کہا کہ شعبہ اردو اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے اس طرح کے سمینار منعقد کر کے قابل ستائش کام کر رہا ہے۔ شعبہ اردو کے سربراہ محمد جاوید خان نے اپنا تحقیقی مقالہ پیش کرتے ہوئے غالب کی ادبی شاعری کو اردو کے لیے ایک عظیم نعمت قرار دیا اور مہمانوں سے اظہار تشکر بھی کیا۔ اس موقعے پر شاہ رخ خان، محمد شفیق وغیرہ نے بھی اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 29 جنوری 2024

مہاراشٹر

ہندوستانی ادب میں گاندھی جی کی شخصیت

کامٹی: سیٹھ کیسری مل پوروال کالج کے شعبہ اردو کی جانب سے یک روزہ قومی سمینار منعقد کیا گیا۔ اس سمینار کا موضوع 'ہندوستانی ادب میں گاندھی جی کی شخصیت' تھا۔ یہ موضوع گاندھی جی جیسے عظیم رہنما کو خراج عقیدت پیش کرنے کے مقصد سے منعقد کیا گیا۔ سمینار کے ابتدائی اجلاس کی صدارت کالج کے پرنسپل پروفیسر ڈاکٹر ونئے چوہان نے فرمائی۔ کلیدی خطبہ مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی سے تشریف لائے ڈاکٹر شمس الہدیٰ نے دیا جب کہ راشٹر سنت تکڑوجی مہاراج ناگپور یونیورسٹی کے شعبہ گاندھی وچار دھارا کے پروفیسر پرمود واانکر مہمان رہے۔ صدر جلسہ نے کہا کہ آج گاندھی جی کے خیالات کو عام کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ وہ گاندھی جی کے فلسفہ کو عام کرنے کے حوالے سے گفتگو کر رہے تھے۔ ڈاکٹر شمس الہدیٰ نے کہا کہ گاندھی جی پر ان کی زندگی میں جو کچھ لکھا گیا اس سے کہیں زیادہ ان کے قتل کے بعد اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے ان کی شخصیت اور خیالات پر لکھا ہے۔ انھوں نے پنڈت آنند نارائن ملا کی نظم بھی پڑھ کر سنائی۔ پروفیسر پرمود واانکر نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج کل گاندھی جی کے خیالات کو لوگوں میں صرف پڑھنے تک محدود کر دیا ہے۔ وہ اسے اپنی زندگی میں عمل میں لانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس سمینار کی غرض و غایت اور افتتاحی کلمات شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر اظہر ابرار نے پیش کیے۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت پروفیسر محمد اسرار نے کی اور شعبہ مراٹھی کے صدر ڈاکٹر مہیش جوگی نے مہمانان اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

مقالہ خوانی کے اجلاس کی صدارت پروفیسر پرمود وانکر نے کی اور ڈاکٹر شمس الہدیٰ مہمان رہے۔ اس اجلاس میں گاندھی جی کی زندگی، ان کے خیالات کا ہندوستانی ادب اور معاشرے پر اثرات ان موضوعات پر 13 مقالے پڑھے گئے۔ یہ مقالے اردو، ہندی، مراٹھی تینوں زبانوں میں تھے۔ ڈاکٹر ثمیر کبیر، ڈاکٹر صبیحہ خورشید، پروفیسر ثنا بانو، پروفیسر گلفشاں انجم وغیرہ نے پیش کیے۔ شعبہ ہندی کے صدر ڈاکٹر وکاس کامڑی اور شعبہ مراٹھی کے صدر ڈاکٹر مہیش جوگی نے بھی مقالے پڑھے۔ ان تمام پر صدر اجلاس پروفیسر پرمود وانکر اور شمس الہدیٰ نے تبصرہ کیا۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر مہیش جوگی نے کی اور ڈاکٹر وکاس کامڑی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر ونئے چوہان نے کی۔ صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ جب تک ہم ادب کے ذریعے گاندھی جی کے فلسفہ کو لوگوں تک نہیں پہنچائیں گے تب تک عام لوگوں تک اس کی رسائی نہیں ہو سکے گی۔ ڈاکٹر شمس الہدیٰ نے کہا کہ یہ سمینار ہر لحاظ سے کامیاب رہا ہے، کیونکہ جتنے مقالے پڑھے گئے وہ گاندھی جی کے خیالات کو اور وسیع پیمانے پر سمجھنے میں مددگار ثابت ہوں گے۔ شعبہ اردو کے پروفیسر محمد اسرار نے اس اجلاس کی نظامت بحسن خوبی انجام دی اور صدر شعبہ اردو ڈاکٹر اظہر ابرار نے تمام حاضرین اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

اس سمینار میں کالج کے طلبا و طالبات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ وائس پرنسپل پروفیسر ڈاکٹر چکرورتی نے سمینار کی کامیابی پر شعبہ اردو کے اساتذہ اور طلبا کو مبارک باد پیش کی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر اظہر ابرار احمد، اسسٹنٹ پروفیسر و صدر شعبہ اردو، سیٹھ کیسری مل پوروال کالج، ناگپور، 2 فروری 2024

انشائیہ ورکشاپ

ناگپور: 18 جنوری 2024 'ہمارے یہاں ہر قسم کی تحریروں اور خاص طور پر طنزیہ و مزاحیہ مضامین کو انشائیے کے نام سے پیش کرنے کا رجحان اس صنف کے فروغ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوا ہے۔ انشائیہ ایک مشکل اور لطیف صنف ہے۔ ریسرچ اسکالرس، اساتذہ اور خاص طور پر طلبہ کو انشائیے سے متعلق تنقیدی مضامین

اور اہم انشائیہ نگاروں کی تخلیقات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔' اردو انشائیہ نگاری ورکشاپ میں معروف انشائیہ نگار محمد اسد اللہ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔ راشٹر سنت تکڑو جی مہاراج ناگپور یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کی جانب سے 'انشائیہ نگاری' پر ایک روزہ سمینار منعقد کیا گیا جس کی صدارت کے فرائض فیکلٹی کے ڈین ڈاکٹر شیام راؤ کوریٹی نے انجام دیے۔ افتتاحی اجلاس میں صدر شعبہ ڈاکٹر سنتوش گرہے نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے

کہا کہ اس قسم کی سرگرمیاں طلبہ کی صلاحیتوں کو نکھارنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ اردو لکچرر اسٹاف کی نمائندگی کرتے ہوئے ڈاکٹر ثمیر کبیر نے اظہارِ خیال کے دوران کہا کہ ہماری یونیورسٹیوں میں انشائیے پر بہت کم سمینار اور ورک شاپ منعقد کیے جاتے ہیں۔ اس صنف کے متعلق طلبا کی رہنمائی ضروری ہے۔ اس ورکشاپ کے خصوصی مقررین معروف انشائیہ نگار ڈاکٹر محمد اسد اللہ اور افسانہ نگار ڈاکٹر یحییٰ جمیل نے دوسرے اجلاس میں انشائیہ نگاری کے آغاز وارتقا، مغرب میں انشائیہ نگاری، عہدِ سرسید اور آزادی کے بعد انشائیہ نگاری، انشائیے کے اجزائے ترکیبی اور اس صنف کے فنی تقاضوں پر تفصیل سے گفتگو کی۔ ڈاکٹر یحییٰ جمیل نے کہا کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ نگاری کو ایک تحریک کی شکل دی اور اس صنف کو مغربی ایسے کے طرز پر اردو میں تخلیقی بنیادیں فراہم کیں۔ انشائیہ غیر افسانوی ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ یہ ہمارے خیالات اور احساسات کے ادبی اظہار کا ایک بہت موثر ذریعہ ہے۔

انشائیہ ورک شاپ کے دوسرے اجلاس میں یونیورسٹی کے طلبہ نے انشائیے کے فکر وفن سے متعلق سوالات کیے، مقررین نے ان کے مفصل جوابات دیے۔ اسی اجلاس میں طلبہ نے مختلف موضوعات پر انشائیے تحریر کیے جن پر مہمانوں نے اظہارِ خیال کیا اور طلبہ کی رہنمائی فرمائی۔ صدرِ جلسہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ اس قسم کے ورکشاپ میں ماہرین اساتذہ کی تقاریر طلبا کے لیے مطالعے سے زیادہ کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ انشائیے کی تخلیق میں انسانی مشاہدات اور احساسات کے فنی اظہار کے بہتر امکانات موجود ہیں۔ اس ورک شاپ میں ڈاکٹر شائستہ تبسم، ڈاکٹر صبیحہ خورشید، ڈاکٹر سمیہ افشاں، ڈاکٹر عصمت کوثر، ڈاکٹر مہر یاسمین، ڈاکٹر ترنم نیاز، محترمہ گل افشاں انجم اور محترمہ ثنا بانو کے علاوہ یونیورسٹی کے طلبہ وطالبات کی کثیر تعداد موجود تھی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ثمیر کبیر نے انجام دیے اور ڈاکٹر ترنم نیاز نے رسم شکریہ ادا کی۔

پریس ریلیز: محمد اسد اللہ شیخ، مہاراشٹر، 19 جنوری 2024

حسرت موہانی

بھیونڈی: 17 جنوری (پریس ریلیز) ملک گیر شہرت کے حامل شاعر، سیاستداں اور عظیم مجاہد آزادی حسرت موہانی کی شاعری میں سیاست، روحانیت اور تغزل کے عنوان پر حالات میڈیا ہاؤس کے زیر اہتمام ایک تاریخی مذاکرے کا انعقاد ہوا۔ اس مذاکرے کی مجلس میں سامعین سے خطاب کرتے ہوئے مشہور محقق، نقاد اور کالم نگار شمیم

طارق نے کہا کہ حسرت موہانی کو ان کی زندگی میں قابو میں کرنا جتنا مشکل تھا اتنا ہی مشکل ان کی موت کے بعد ان کی گوناگوں خوبیوں کا احاطہ کرنا بھی ہے۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں وہ شاعر، صحافی، صوفی، انقلابی اور مجاہد آزادی تھے لیکن ان کی شخصیت کے ہر پہلو پر ایک پہلو غالب تھا کہ وہ بے ریا اور مخلص شخص تھے۔ انھوں نے اردو غزل کو بھی اس وقت حیات نو بخشی جب یہ صنف ہر چہار طرف سے نرغے میں تھی۔ ان کی غزلوں میں عاشقانہ، عارفانہ اور سیاسی مضامین موزوں کیے گئے ہیں۔ شمیم طارق نے حسرت کے شعروں کے حوالے سے مثالیں بھی پیش کیں اور کہا کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ حسرت کی غزلوں کا مطالعہ کرنے والوں میں اگرچہ نامورانِ اردو شامل ہیں مگر ان کی شاعری اور غزل کے تمام پہلوؤں پر مکمل روشنی آج تک نہیں ڈالی جاسکی ہے۔ شمیم طارق نے کہا کہ حسرت جب موہان سے علی گڑھ پہنچے تو وہاں کے طلبا نے ان کا وضع قطع، لباس اور انداز گفتگو دیکھ کر 'خالہ ماں' کا خطاب دیا لیکن ان کی ذہانت، شرافت اور جرات سامنے آتے ہی ان کو مولانا کہنا شروع کردیا۔ اردو کے معروف صحافی اور کالم نگار ڈاکٹر سید احمد قادری نے جو اس پروگرام کی صدارت کررہے تھے کہا کہ شمیم طارق نے حسرت کی شاعری اور شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرلیا ہے اور بڑی خوبی سے کیا ہے انھوں نے کہا کہ ہمیں اپنے اکابرین کو یاد کرتے رہنا چاہیے ورنہ ہماری نئی نسل اپنی سیاسی و تمدنی تاریخ بھول جائے گی۔ آج کا یہ پروگرام اسی مقصد کو پورا کررہا ہے۔ معروف انشائیہ نگار محمد رفیع انصاری نے حسرت موہانی کی علمی، ادبی، سیاسی، سماجی اور شعری خدمات کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے بڑے ہی منفرد انداز میں ایک پر مغز مقالہ پیش کیا جسے سامعین نے بغور سنا اور داد سے نوازا۔ بھیونڈی کے صنوبر ہال میں منعقدہ اس تاریخی مذاکرے میں سیاست، صحافت، روحانیت اور اردو شعر وادب کے شیدائی سامعین کثیر تعداد میں موجود رہے۔ پروگرام کے کنوینر ایم ابوبکر نے تمام مہمانان کرام اور معزز سامعین کا شکریہ ادا کیا جبکہ عامر اصغر قریشی نے نظامت کے فرائض بہ حسن وخوبی انجام دیا۔

پریس ریلیز: حالات میڈیا، بھیونڈی، 22 جنوری 2024

سیٹھ کیسری مل پوروال کالج میں یک روزہ ریاستی سطح سمینار کا انعقاد

کامٹی: سیٹھ کیسری مل پوروال کالج میں شعبہ اردو کے جانب سے یک روزہ ریاستی سطح کے سمینار کا انعقاد 10 جنوری 2024 بروز بدھ کو کیا گیا۔ اس سمینار کا عنوان 'اردو زبان اور تحریک آزادی' تھا۔ سمینار کی صدارت کالج کے پرنسپل پروفیسر ڈاکٹر ونئے چوہان نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر وائس پرنسپل ڈاکٹر رینو تیواری اور وائس پرنسپل ڈاکٹر منیش چکرورتی موجود تھے۔ کانفرنس کے کنوینر اور شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر اظہر ابرار نے غرض وغایت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''اردو زبان اس ملک کی ایک اہم زبان ہے، اور اس زبان سے سبھی عوام خواص نے پیار کیا ہے۔'' ڈاکٹر منیش چکرورتی نے کہا کہ سبھی زبانوں کے

مصنفین اور شعرائے کرام نے تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں بنگالی زبان کے اہم شاعر قاضی نذرالاسلام کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر رینو تواری نے کہا کہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں جب حب الوطنی کی نظمیں پڑھی اور سنی جاتی ہیں تو دل میں وطن سے محبت کے جذبات امڈ پڑتے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے علامہ اقبال، اکبرالہ آبادی اور الطاف حسین حالی کا بھی ذکر کیا۔ افتتاحی تقریب کی صدارت فرمارہے کالج کے پرنسپل پروفیسر ڈاکٹر ونئے چوہان نے کہا کہ ''زبان جذبات کو بیان کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ زبان کی اہمیت زندگی میں کبھی بھی کم نہیں ہوگی۔ اور اردو زبان ہمارے ملک میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔''

افتتاحی تقریب کی نظامت کے فرائض بی اے سال دوم کی طالبہ تنزیل فاطمہ نے بحسن وخوبی انجام دیا۔ پروفیسر زرینہ سلیم، اور پروفیسر ثنا راعین نے اس تقریب میں خصوصی طور پر شرکت کی۔ اس سمینار میں بارہ طلبا وطالبات نے مختلف موضوعات پر اپنے مقالے پیش کیے۔ ان مقالوں پر مختلف کالجز کے تین مہمانان نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ وسنت راؤ نائک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنس سے شعبہ اردو کی صدر ڈاکٹر نصرت مینو، راشٹر سنت تکڑو جی مہاراج ناگپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے ڈاکٹر ثمیر کبیر

اور پوروال کالج سے ڈاکٹر غزالہ ہاشمی نے طلبا و طالبات کو مقالہ لکھنے والے اسے پیش کرنے کے متعلق رہنمائی کی۔

مقالہ خوانی کے سیشن کی نظامت بی اے سال دوم کے طالب علم فضیل راشد نے کی۔ اس سمینار میں آرٹس، کامرس اور سائنس کے طلبا و طالبات نے کثیر تعداد میں حصہ لیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر اظہر ابرار احمد، اسسٹنٹ پروفیسر و صدر شعبہ اردو، سیٹھ کیسری مل پوروال کالج، ناگپور، 23 جنوری 2024

محفلِ طنز و مزاح

مالیگاؤں: اسکس لائبریری مالیگاؤں کے زیرِ اہتمام اور زندہ دلانِ مالیگاؤں اور مالیگاؤں آرٹس اینڈ کلچرل ایسوسی ایشن کے تعاون سے ایک شان دار محفلِ طنز و مزاح کا انعقاد کیا گیا۔ اس کی صدارت مشہور صنعت کار جمیل کرانتی نے کی۔ سراج احمد دلار نے پروگرام کی غرض و غایت اور مقاصد تفصیل سے بیان کیے۔ تبرک کے مستقل عنوان سے عثمان غنی اسکس نے مرحوم محمد عمر قدسی کے انتقال پر محمد اسماعیل اکبر مرحوم کے لکھے گئے ایک دلچسپ مضمون کی خواندگی

کی۔ مختار یوسفی اور محمد رضا سر کی ہزلوں نے سامعین کو قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا۔ شفیق محسن اور آصف سبحانی نے اپنے مزاحیہ مضامین سے حاضرینِ محفل کو سردی میں بھی گرما دیا۔ رمضان فیمس کے گیت نے بھی اپنا رنگ جمایا۔ منصور اکبر نے آصف مومن صدر اسکس لائبریری اور ظہیر قدسی صدر زندہ دلانِ مالیگاؤں کی خدمت میں اتنی کامیاب محفل کے انعقاد پر بطور شکریہ شال کا نذرانہ پیش کیا۔ مبین نذیر، ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی اور پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے تاثرات بیان کیے۔ آخر میں صدر محفل جمیل کرانتی نے اپنے مزاحیہ خطبۂ صدارت سے محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ عثمان غنی اسکس کے شکریے کے ساتھ محفل کا اختتام ہوا۔ محمد مصطفےٰ سرکتی نے بڑی حسن و خوبی سے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اسکس لائبریری کا وسیع ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ منتظمین نے اعلان کیا کہ ہر ماہ کے پہلے منگل کو محفلِ طنز و مزاح کا انعقاد کیا جائے گا جس میں شاعروں ادیبوں اور دیگر فنکاروں کو اپنی طنزیہ اور مزاحیہ تخلیقات پیش کرنے کا موقع دیا جائے گا۔

پریس ریلیز: اسکس لائبریری مالیگاؤں، 5 جنوری 2024

اعزاز و اکرام

ساہتیہ اکادمی کا یوا پرسکار

کولکاتا: یوتھ ڈے کے موقعے پر ساہتیہ اکادمی نے اردو سمیت 22 زبانوں کے نوجوان لکھاریوں کو 2023 کے

لیے باوقار یوتھ ایوارڈ پیش کیا۔ 50 ہزار روپے کی رقم اور ایک کندہ تانبے کی تختی بطور انعام دی گئی ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے صدر مادھو کوشک نے کولکاتا کے رابندر سدن میں منعقدہ ایک پروگرام کے دوران مصنّفین کو اعزاز سے نوازا۔ پروگرام کے آغاز میں اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے تعریفی کلام پڑھا جب کہ ایوارڈ پیش کرنے سے پہلے اکادمی کے نائب صدر پروفیسر کمود شرما نے ایوارڈ یافتہ مصنّفین کو گلدستہ پیش کرتے ہوئے مبارکباد دی۔ ایوارڈ یافتہ مصنفین میں جنٹو گیتارتھ (آسامی)، حمیر الدین مدیا (بنگالی)، بیناوسری وائمری (بوڈو)، دھیرج کمار رینا (ڈوگری)، انیرودھ کنیسیٹی (انگریزی)، اتل کمار رائے (ہندی)، منجوناتھ چلورو (کنڑ)، نگہت نسرین (کشمیری)، تنوی سریدھر کامت بمبولکر (کونکنی)، سنسکرت مشرا (میتھلی)، گنیش پٹور (ملیالم)، تھنگنم پرشورام (مانی پوری)، وشاکھا وشوناتھ (مراٹھی)، نین کلا دیوی (نیپالی)، دلیشور رانا (اڑیہ)، سندیپ شرما (پنجابی)، دیوی لال ماہیا (راجستھانی)، مدھوسودن مشرا (سنسکرت)، پپی توڈو (سنتھالی)، مونیکا پنجوانی (سندھی)، رام تھنگم (تمل)، تاکیدا اسلا جانی (تیلگو) اور توصیف خان (اردو) ان میں سے دھیرج کمار رینا ایوارڈ لینے کے لیے حاضر نہیں ہو سکے۔ تقریب کے آغاز میں اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے نیشنل یوتھ ڈے کے مبارک موقعے پر سوامی وویکانند کے خیالات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ سماج کی صحیح ترقی کے لیے نوجوان مصنّفین کی حوصلہ افزائی ضروری ہے۔ اس موقعے پر اپنی صدارتی تقریر میں مادھو کوشک نے کہا کہ ساہتیہ اکادمی کا یہ پلیٹ فارم پورے ہندوستانی ادب کی نمائندگی کرتا ہے اور ہمارے نوجوان ادیب ہندوستانی زبانوں کے ادب کا مستقبل ہیں۔ تقریب کے مہمان خصوصی ممتاز بنگالی شاعر ڈاکٹر سبودھ سرکار نے کہا کہ نوجوان مصنّفین اکثر اپنی تحریر کی کامیابی کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار رہتے ہیں لیکن ان کی انقلابی تحریر نئے امکانات کی نشاندہی کرتی ہے۔ اپنے اختتامی بیان میں اکادمی کے نائب صدر پروفیسر کمود شرما نے کہا کہ اکادمی کے اس فورم کو دیکھتے ہوئے وہ محسوس کرتی ہیں کہ ادب اور ادب کا مستقبل بالکل خطرے میں نہیں ہے۔ سوشل میڈیا کے موجودہ دور میں ادیبوں کو بغیر کسی مداخلت کے اظہار خیال کرنے کا ایک وسیع پلیٹ فارم میسر ہے۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 14 جنوری 2024

آفتاب نعمانی

نجیب آباد: 12 اکھل بھارتیہ پتر کار سرکشا پریشد کی مقامی یونٹ کی میٹنگ میں شہر کے سینئر صحافی ڈاکٹر آفتاب نعمانی کو تنظیم کی جانب سے غیر جانبدارانہ اور بے باک صحافت کرنے پر شال اوڑھا کر اعزاز سے سرفراز کیا۔ محلّہ حویلی تلہ میں اکھل بھارتیہ پتر کار سرکشا سمیتی کے سٹی یونٹ کے نو منتخب صدر نوشاد سیفی کی رہائش پر ایک میٹنگ کا اہتمام کیا گیا جس میں مقررین نے تنظیم کو مضبوط کرنے اور اپنے قلم کو دیانت داری کے ساتھ چلانے اور معاشرے کے مفاد میں کام کرنے پر زور دیا۔ سٹی صدر نوشاد سیفی نے اپنے خطاب میں سب کو ساتھ لے کر تنظیم کو مضبوط کرنے اور صحافیوں کی آواز بلند کرنے کا یقین دلایا۔ ضلع صدر ہاشم احمد نے اپنے خطاب میں کہا کہ صحافی سماج کا آئینہ ہیں اور اسے داغ دار نہیں ہونے دیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ ہماری تنظیم کئی ریاستوں میں کام کر رہی ہے۔ سرپرست ڈاکٹر آفتاب نعمانی نے کہا کہ صحافیوں کو اپنی شناخت خود بنانی چاہیے اور ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے جس سے تنظیم اور خود کا امیج خراب ہو۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 13 جنوری 2024

اجرا

خرابات

نئی دہلی: پروفیسر اخلاق آہن فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے شاعر ہیں۔ 'خرابات' ان کی اردو نظموں کا مجموعہ ہے جس کی رسم اجرا آج جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں سی ایچ ایل آر اور جے این یو کے شعبہ فارسی کے اشتراک سے عمل میں آئی۔ پروگرام میں ہندوستان و بیرون ملک کے کئی معروف ادیبوں نے شرکت کی۔ اخلاق آہن کے شعری مجموعے 'خرابات' کے حوالے سے اس مذاکرہ کی صدارت کے فرائض معروف ادیب پروفیسر انیس الرحمٰن (سابق صدر شعبہ انگریزی، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے انجام دیے۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اخلاق آہن کی شاعری ایسی نہیں ہے کہ اسے ایک نشست میں پڑھ کر اس سے لطف اندوز ہوا جا سکے، یہ شاعری اپنے قاری سے غور وفکر کا تقاضا کرتی ہے۔ کلیدی خطبہ معروف دانشور، ایڈوکیٹ خلیل الرحمٰن نے پیش کیا جس میں انھوں نے اخلاق صاحب کی شاعری کے ادراک کے لیے عالمی اور سنسکرت شعریات کے حوالے پیش کیے اور ان کی شاعری کو اپنی نوع کی ایک مختلف شاعری قرار دیا اور ساتھ ہی معاصر نظمیہ شعری روایت میں ن م راشد اور میراجی کی روایت اور معیار سے آہن کی شاعری کا تقابل کیا۔ پروفیسر شافع قدوائی (صدر شعبہ ماس کمیونیکیشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) علی گڑھ نے اخلاق آہن کی نظموں کا انگریزی نظم نگاروں سے تقابلی مطالعہ کیا اور ان کے شعری انفراد کے اہم خطوط کی نشاندہی کی۔ پروگرام میں کینیڈا سے معروف نقاد اور محقق ڈاکٹر تقی عابدی نے آن لائن شرکت کر کے اور ایرانی استاد ڈاکٹر فاطمہ رجبی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مقامی اساتذہ میں پروفیسر عراق رضا زیدی، پروفیسر عبدالخالق رشید، پروفیسر خواجہ اکرام الدین اور پروفیسر مندر ناتھ ٹھاکر نے اس موقعے پر اخلاق آہن کی شاعری کے تعلق سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ محترمہ تطہیر فاطمہ اور تجمل حسین راحت نے اخلاق آہن صاحب کی کچھ نظمیں پیش کیں۔ صدارتی تقریر سے قبل پروفیسر اخلاق آہن نے اپنی چند نظمیں سامعین کو سنائیں جس سے پروگرام کے وقار میں مزید اضافہ ہوا۔ پروگرام کی ابتدا میں سی ایچ ایل آر کے جوائنٹ سکریٹری رافع کمال نے اخلاق آہن اور ان کی کتاب کا انگریزی میں تعارف پیش کیا۔ سی ایچ ایل آر کی صدر ودوشی گور نے استقبالیہ کلمات ادا کیے اور اختتام میں اظہار تشکر کے فرائض بھی انجام دیے۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض سی ایچ ایل آر، نئی دہلی کے جنرل سکریٹری سید تالیف حیدر نے انجام دیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 جنوری 2024

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر فن اور شخصیت

نئی دہلی: غالب اکادمی میں گزشتہ روز نارنگ ساقی کی مرتبہ کتاب 'کنور مہندر سنگھ بیدی سحر فن اور شخصیت' کے

اجرا کے لیے ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر سہیل انجم نے کتاب کا تعارف کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میں کنور مہندر سنگھ بیدی کی شخصیت پر سیکڑوں مضامین ہیں۔ منظوم خراج عقیدت کے ساتھ کنور مہندر سنگھ بیدی کی شاعری اور نثر پارے کے نمونے ہیں۔ گویا یہ کتاب کنور مہندر سنگھ بیدی کی شخصیت کا نگارخانہ ہے۔ اس کتاب میں رنگارنگی ہے۔ یہ رنگارنگی ان کی شخصیت میں بھی تھی۔ بیدی صاحب میں انسانی خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر خالد علوی نے اپنی تقریر میں کہا کہ بیدی صاحب کی شخصیت کثیر الجہات تھی۔ ان کی شاعری قابل توجہ ہے۔ سہل ممتنع کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ان کی شاعری آسان ہے لیکن معنی کے اعتبار سے اس میں تہہ داری ہے۔ 'یادوں کا جشن' کے حوالے سے خالد علوی نے کہا کہ اس کتاب میں بیدی صاحب کی شخصیت کی مختلف جہتیں سامنے آتی ہیں۔ وہ صرف شاعر و ادیب اور منتظم نہیں بلکہ سماج کے ہر طبقے پر ان کی نظر ہوتی ہے، وہ سب کے مسائل حل کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ نارنگ ساقی نے بیدی کی شعری و نثری تخلیقات کو شائع کر کے ان کی یاد کو زندہ رکھا ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے کتاب کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ آج کے دور میں نارنگ ساقی کا دم غنیمت ہے کہ انھوں نے بیدی صاحب کی یاد کو قائم رکھا۔ بیدی صاحب گنگا جمنی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ تقریب کی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر جی آر کنول نے کہا کہ بیدی صاحب کی شخصیت تہہ دار تھی۔ وہ زمیندار تھے، کسانوں اور مزدوروں کی تفریح کا انتظام بیدی صاحب کرتے تھے۔ وہ دشوار کام کو آسان کرتے تھے۔ وہ سپر مین تھے۔ نہرو نے کہا تھا اگر دہلی سے مسلمان چلے جائیں گے تو یہ ایک کلنک ہوگا۔ بیدی صاحب نے دہلی میں رونما فساد کو روکا اور مسلمانوں کو دہلی میں تحفظ فراہم کیا۔ ان کا انداز حکیمانہ تھا۔ اس موقعے پر عقیل احمد نے کہا کہ بیدی صاحب کا سلسلہ براہ راست گرونانک سے ہے۔ وہ زمیندار اور حاکم منصف شاعر ادیب بھی تھے۔ انسان دوست اور ہمدرد بھی تھے۔ انھوں نے ہر میدان میں اپنا نقش چھوڑا ہے۔ سنگرور سے آئے کرشن بیتاب نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ وہ شاعروں کے ہیرو تھے۔ انھوں نے بہت سے لوگوں کا بھلا کیا ہے۔ اس موقعے پر متین امروہوی نے بیدی صاحب کا قلمی چہرہ پیش کیا۔ آخر میں نارنگ ساقی نے اظہار تشکر کیا۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں شاعر وادیب موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 16 جنوری 2024

گزرتے ہوئے

اورنگ آباد: اردو کے ممتاز ومنفرد شاعر وادیب پروفیسر صادق کا حیات نامہ 'گزرتے ہوئے' عنوان سے مراٹھی زبان میں شائع ہوا ہے۔ اس کی مصنفہ ڈاکٹر ارملا چاکورکر ہیں جو ایم بی بی ایس ایم ڈی میڈیکل پریکٹشنر ہیں۔ وہ شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ مراٹھی میں سوانح عمریاں لکھنے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ حال ہی میں 'گزرتے ہوئے' عنوان سے ان کی ایک نئی کتاب شائع ہوئی ہے جو اردو اور ہندی کے ممتاز شاعر وادیب اور مصور پروفیسر صادق کی حیات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔ اس مراٹھی کتاب کی رسم اجرا وارثان حرف وقلم کے عالیشان ہال میں منعقد کی گئی جس میں اردو، ہندی اور مراٹھی کے نامور قلمکاروں نے شرکت کی اور پروفیسر صادق کے ساتھ اپنے تعلقات اور ان کی ادبی اور تہذیبی خدمات کو سراہا۔ پروفیسر ارتکاز افضل نے کہا کہ صادق کی جائے ولادت اجین ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ صادق عصر حاضر کے ممتاز و مقبول اور غیر معمول شاعر وادیب ہیں۔ ڈاکٹر ارملا چاکور نے کہا کہ پروفیسر صادق نے مراٹھواڑہ یونیورسٹی کے پیوپلس کالج ناندیڑ میں چھ سال لکچرار کی خدمات انجام دینے کے بعد یوپی ایس سی سے سلیکٹ ہوکر مرکزی وزارت تعلیمات کے ترقی اردو بورڈ نئی دہلی میں آ گئے جہاں انھیں حیات اللہ انصاری اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسے صف اول کے ادیبوں کے ساتھ کام کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ یہاں انھوں نے 'اردو دنیا' نام سے ایک بروشر کی اشاعت کا ڈول ڈالا جو پہلے سال بھر میں دو تین بر شائع ہوتا تھا اور بعد میں اس نے ایک مستقل ماہنامہ کی شکل اختیار کر لی۔ ترقی اردو بورڈ میں صادق کا دوسرا

یادگار کام تعلیم بالغان سے متعلق تھا حیات اللہ انصاری کے اس خواب کو پروفیسر صادق کی حکمت عملی نے پورا کردیا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 جنوری 2024

اوراقِ ماضی

حیدرآباد: 12 جنوری (پریس نوٹ) میں نے انگریزی کتاب "Echoes from the Past" پڑھی ہے۔ وہ کسی بھی طرح اصلی کتاب 'اوراقِ ماضی' سے کم نہیں ہے۔

اس کتاب کا تلگو ترجمہ بھی ہونا چاہیے۔ اگر شاہد حسین صاحب ترجمہ کروالیتے ہیں تو میں اسے شائع کرواؤں گا۔ ان خیالات کا اظہار سابق کمشنر پولیس حیدرآباد جناب اے کے خان (آئی پی ایس ریٹائرڈ) نے کیا۔ وہ اوراقِ ماضی کے انگریزی ترجمہ کی رسم اجرا میں خطاب کررہے تھے۔ جناب شاہد حسین زبیری، ٹرسٹی نظامس ٹرسٹ کی کتاب 'اوراقِ ماضی' کا انگریزی ترجمہ ''Echoes From the Past'' کا اجرا سالار جنگ میوزیم کے تراب علی خان بھون آڈیٹوریم میں کیا گیا۔ پروفیسر آمنہ کشور نے اردو کی کتاب کا انگریزی ترجمہ کیا۔

اپنی صدارتی تقریر میں جناب اے کے خان نے کہا کہ انھیں پرنس مکرم جاہ بہادر سے تین مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ جب مکرم جاہ کے انتقال کی خبر ملی تو انھوں نے اس وقت کے وزیر اعلیٰ جناب چندر شیکھر راؤ کو اس کی اطلاع دی۔ وزیر اعلی نے جواب میں کہا کہ وہ ہمارے حکمران تھے۔ مکرم جاہ کی عزت واحترام ریاست حیدرآباد کا ہر ذی حیثیت شہری کرتا تھا۔ اس لیے ان کی آخری رسومات ایک حکمران کی طرح ادا کی گئیں۔ جناب شاہد حسین زبیری نے اپنے خطاب میں کہا کہ میں نے مکرم جاہ کو جیسا دیکھا ان کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ قارئین کے حوالے کردیا ہے۔ اس طرح اس کتاب کو میں نے پوری دیانت داری سے لکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب میں کتاب کا ترجمہ پڑھ رہا تھا تو سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ آمنہ کشور نے میری اردو کتاب کا ترجمہ کیا ہے یا میں نے انگریزی کتاب کا۔ اردو یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی میں انگریزی کی سابقہ استاد پروفیسر آمنہ کشور جو کتاب کی مترجم بھی ہیں نے کہا کہ ترجمہ خود ایک فن ہے۔ اس کی کامیابی یہ ہے کہ ایک زبان کی روح دوسری زبان میں منتقل ہو اور وہ اسی زبان میں ہونے کا احساس دلائے۔ جناب ذوالفقار علی، ایم ایل اے چارمینار نے اس موقعے پر اظہار خیال کیا اور کہا کہ لوگ نظام پر بلا سوچے سمجھے تہمتیں لگاتے رہے ہیں۔ لیکن شاہد صاحب نے اپنی کتاب میں بتایا کہ کس طرح نظام ہفتم میر عثمان علی خان نے حیدرآباد کی ترقی میں حصہ لیا اور خصوصی طور پر تعلیمی ترقی کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی کو قائم کیا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو امداد دی اور بنارس ہندو یونیورسٹی کو اس سے بڑھ کر امداد دی۔ اسی طرح نواب مکرم جاہ کے خلاف لوگوں کی الزام تراشیوں کا بھی مصنف نے معقول جواب اپنی کتاب میں دیا ہے۔ پروفیسر انور جہاں زبیری، سابق وائس چانسلر، کالی کٹ یونیورسٹی نے کہا کہ جب میں نے اردو کتاب پڑھی تو وہ اتنی دلچسپ تھی کہ میں نے اس کتاب کو شروع کیا تو دو سے تین نشستوں میں ہی مکمل کر لیا۔ ان کے مطابق شاہد حسین اپنے لفظوں سے کسی بھی واقعے کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ نئے لوگوں کے لیے انگریزی میں کتاب کی اشد ضرورت تھی جسے پروفیسر آمنہ کشور نے پورا کردیا۔ پروفیسر شگفتہ شاہین، او ایس ڈی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ جہاں یہ کتاب تاریخی اہمیت حامل ہے وہیں مکمل طور پر دلچسپ بھی ہے۔ کتاب کے ہر صفحے سے شاہد صاحب کی نواب مکرم جاہ سے محبت عیاں ہوتی ہے۔ اس موقعے پر جناب منصور کشور نے بھی خطاب کیا۔ ممتاز صحافی جناب میر ایوب علی خان نے کارروائی چلائی۔ جناب کاشف حسین زبیری، فرزند شاہد حسین نے شکریہ ادا کیا۔ قدسی رضوی اور صائمہ حسین نے شاہد حسین زبیری کی کتاب کے اقتباسات سنائے۔ اس موقعے پر حاضرین کی کثرت کے باعث سالار جنگ میوزیم کا وسیع وعریض ہال بھی اپنی تنگ دامنی کا شکوہ کررہا تھا۔

پریس ریلیز: محمد اطہر احمد صدیقی، حیدرآباد، 12 جنوری 2024

محمود عاصم فلاحی ندوی کی کتاب کا اجرا

جونپور: کھیتاسرائے تھانہ حلقہ کے موضع معروف پور واقع مدرسہ درسگاہ اسلامی میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والے ڈاکٹر محمود عاصم فلاحی ندوی (میڈیا کوآرڈینیٹر عرب لیگ مشن نئی دہلی) کے اعزاز میں تقریب کا انعقاد کیا گیا اور اس دوران ڈاکٹر محمود عاصم کی صحافتی میدان کی 6 کتابوں جن میں عربی زبان کے علاوہ اردو کی ایک کتاب کی رسم اجرا علاقہ کے معززین کے بدست ہوئی۔ نظامت عبداللہ فاروق پرنسپل درسگاہ اسلامی معروف پور اور صدارت جلال الدین سرور اور سبکدوش پرنسپل ماسٹر اختر نے کی۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالوحید قاسمی نے کہا کہ محمود عاصم نے صحافت کے میدان کا انتخاب کیا ہے اور اردو کے علاوہ عربی زبان میں صحافتی خدمات کو متعارف کرایا ہے جو کہ لائق تعریف قدم ہے۔ قلم کی طاقت نے دنیا کو آئینہ دکھایا ہے قلم نے بیشتر ممالک میں تحریک کا کام کیا ہے۔ ایک قلمکار کا تعلق آرٹ وادب سے ہوتا ہے۔ ادب ہی انسانی دماغ کو بڑھانے کا ذریعہ بنتا ہے دنیا کی سب سے بڑی طاقت میڈیا ہے اور محمود عاصم نے صحافتی میدان کا انتخاب کیا ہے اور چھوٹی سی عمر میں کتابوں کی تصنیف کرکے اپنی لیاقت کو ثابت کیا ہے۔ ڈاکٹر فخر الدین قاسمی نے کہا کہ پیدائش کے وقت انسان بچہ پھر فرد کہلاتا ہے لیکن جب اس پر محنت ہوتی ہے تو وہ شخص میں تبدیل ہوجاتا ہے اور حوصلہ افزائی ہوئی تو شخصیت میں تبدیل ہوجاتا ہے اور ایک دن وہی شخص بین الاقوامی سطح پر اپنا اور علاقہ کا نام روشن کرتا ہے اور فرد کو شخص بنانے میں سب سے بڑا رول والدین کا ہوتا ہے، والدین کے لیے سب سے قیمتی تحفہ اولاد ہے، ہم اولاد کو دنیا کی ہر چیز دینے کی فکر تو کرتے ہیں لیکن افسوس کہ ہمارے پاس اولاد کو دینے کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر محمود عاصم نے کہا کہ آج کی اعزازی تقریب میرے لیے بہت خاص ہے کیونکہ میری بتدائی تعلیم اسی مدرسے سے ہوئی ہے اور یہیں پر میرا بچپن گزرا ہے عام طور پر ہمارے سماج میں زندوں کی حوصلہ افزائی کا رواج بہت کم ہے لیکن باعث فخر ہیں ہمارے گاؤں کے لوگ جنھوں نے مجھ جیسے چھوٹے سے طالب علم کی حوصلہ افزائی کے لیے تقریب کا انعقاد کیا ہے۔ حوصلہ افزائی سے مزید کچھ کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 جنوری 2024

نقشِ تحریر

گلبرگہ: ڈاکٹر انیس صدیقی معتمد کی اطلاع کے بموجب انجمن ترقی اردو ہند (شاخ) گلبرگہ کے زیر اہتمام، 28 جنوری 2024 کو بہ مقام حضرت خواجہ بندہ نواز ایوان

اردو، معروف ادیب و شاعر واجد اختر صدیقی کی چوتھی تصنیف 'نقش تحریر' کی تقریب رسم اجرا کا انعقاد عمل میں آیا۔ محترمہ کنیز فاطمہ ایم ایل اے، کلبرگی (شمال) نے کتاب کی رسم اجرا انجام دینے کے بعد اپنے اظہار خیال میں واجد اختر صدیقی کو فعال قلمکار قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کی دیگر تصانیف میرے مطالعہ میں رہی ہیں۔ ان کی تحریروں کو میں ادب میں اضافہ سمجھتی ہوں۔ انھوں نے اس موقع پر انجمن کی کارکردگی کی سراہنا کرتے ہوئے اس تقریب کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی۔

بطور مہمان خصوصی شریک تقریب ششیل جی نموشی رکن کونسل شمال مشرقی حلقہ اساتذہ نے کہا کہ واجد اختر صدیقی، ایک مثالی ٹیچر ہیں۔ بحیثیت شاعر و ادیب بھی ان کی خدمات لائق ستائش ہیں۔ ایک فرد میں ان تمام خوبیوں کا یکجا ہونا غیر معمولی بات ہے۔ مزاح نگار منظور وقار نے کہا کہ واجد اختر صدیقی نے بہت معیاری مضامین تحریر کیے ہیں۔ محبوب اصغر خان نائب مدیر، روزنامہ منصف حیدرآباد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ واجد اختر صدیقی نے اپنے علاقے کے قلمکاروں پر مضامین لکھ کر ان کو حقیقی معنوں میں خراج پیش کیا ہے۔ ممتاز ادیب و شاعر ڈاکٹر رؤف خیر نے کہا کہ واجد اختر صدیقی نے گلبرگہ اور اس کے اطراف کے قلمکاروں پر قلم اٹھا کر ایک دستاویزی حیثیت کی حامل کتاب پیش کی ہے۔ شیخ مجیب، صدر، پرائمری اسکول ٹیچرس اسوسی ایشن گلبرگہ (شمال) نے کہا کہ واجد اختر صدیقی کی کتاب یقیناً اردو ٹیچرس اور طلبہ کی رہنمائی کا کام کرے گی۔ واجد اختر صدیقی نے اپنے تاثرات میں انجمن کے ذمے داران اور شرکائے اجلاس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ان کے یہ مضامین گلبرگہ کی ادبی صورتحال کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ ان کی ادبی حیثیت کے استحکام میں استاد مرحوم ڈاکٹر وحید انجم کا اہم کردار رہا ہے۔ اسی لیے انھوں نے 'نقش تحریر' کو مرحوم کے نام معنون کیا ہے۔ صدارتی خطاب میں ڈاکٹر پیرزادہ فہیم الدین نے کہا کہ واجد اختر صدیقی متحرک اور فعال شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی علمی، ادبی اور تدریسی خدمات قابل قدر ہیں۔ تقریب کے آغاز میں خواجہ پاشاہ انعام دار، نائب صدر انجمن نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے۔ ڈاکٹر انیس صدیقی معتمد انجمن نے صاحب کتاب اور مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ محمد جاوید اقبال صدیقی نے نظامت کے فرائض بہ حسن وخوبی انجام دیے۔ ڈاکٹر ظہیر شیخ، نصرت محی الدین پٹیل، سید نظیر الدین متولی، مجیب شیخ، ساجد علی رنجولوی نے بہ حیثیت مہمان اعزازی شرکت کی۔ سامعین کی کثیر تعداد میں شرکت نے اس تقریب کو شاندار کامیابی سے ہمکنار کیا۔

ڈاکٹر انیس صدیقی، معتمد انجمن، گلبرگہ، 6 فروری 2024

وفیات

ساحل احمد

اردو کے معروف ادیب، محقق، شاعر اور افسانہ نگار ڈاکٹر ساحل احمد، نئی دہلی کے ہولی فیملی ہسپتال میں 25 جنوری کو انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 86 برس تھی۔ وہ کئی برسوں سے بیمار تھے لیکن ایک ماہ قبل طبیعت بگڑنے لگی تو ان کو

ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ ان کو تقریباً 28 دنوں سے وینٹی لیٹر پر رکھا گیا تھا۔ وہ 21 اپریل 1938 کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ اور الہ آباد میں تعلیم حاصل کی۔ یوئنگ کرسچین آٹونامس کالج، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد کے شعبہ اردو کے صدر اور ریڈر کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹی سعدیہ ہیں۔ ان کی تدفین بعد نماز مغرب اوکھلا کے بٹلہ ہاؤس قبرستان میں عمل میں آئی۔ ڈاکٹر ساحل احمد نے اردو زبان وادب کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی کم و بیش 90 کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کی کتابوں سے ادب کے طلبا اور ریسرچ اسکالرز نے بے پایاں استفادہ کیا جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اللہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرمائے، آمین!

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 جنوری 2024 ودیگر ذرائع

فاروق نازکی

سری نگر: وادی کشمیر سے تعلق رکھنے والے معروف براڈ کاسٹر اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ شاعر فاروق نازکی 6 فروری کو انتقال کر گئے۔ وہ 83 برس کے تھے۔ خاندانی ذرائع کے مطابق

فاروق نازکی نے کٹرہ کے نارائن ہسپتال میں زندگی کی آخری سانسیں لیں۔ وہ طویل عرصے سے صاحب فراش تھے۔ انھوں نے کہا کہ علاج ومعالجہ کے لیے وہ کٹرہ میں تھے جہاں ان کا فرزند ایک بڑے سپر اسپیشلٹی ہسپتال میں بحیثیت ڈاکٹر تعینات ہے۔ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک فرزند اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ 14 فروری 1940 کو بانڈی پورہ میں جنم لینے والے فاروق نازکی نے اپنے کیریئر کا آغاز روزنامہ 'زمیندار' میں ایک صحافی کی حیثیت سے کیا اور اس دوران وہ ایک کیجول نیوز ریڈر کے بطور بھی کام کرتے تھے۔ مرحوم نے 1986 سے 1997 تک دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیے اور سال 2000 میں وہ دوردرشن کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے بطور نوکری سبکدوش ہوگئے۔ شعبہ صحافت میں اپنے اَن مٹ نقوش چھوڑنے کے ساتھ ساتھ فاروق نازکی نے اردو اور کشمیری زبان میں طبع آزمائی کی اور دونوں زبانوں میں ان کی تخلیقات اور رشحات قلم کو ادبی حلقوں میں داد و تحسین حاصل ہوئی۔ سال 1995 میں انھیں کشمیری زبان کے ان کے شعری مجموعہ 'نار ہتن کنزل وانس' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے علاوہ ان کے اردو اور کشمیری زبان میں کئی مجموعے منظر عام پر آئے جن کو ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔ فاروق نازکی ایک کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے۔ مایہ ناز شاعر اور کہنہ مشق ادیب ہونے علاوہ کشمیر میں ان کا شمار ٹی وی کے ایک پہل کار کے طور کیا جاتا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 7 فروری 2024

ارشد مینا نگری

مالیگاؤں: ارشد مینا نگری کا مختصر علالت کے بعد پیر کو 82 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مالیگاؤں کے عائشہ نگر قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں اہلیہ، دو بیٹیاں اور چھ بیٹے ہیں۔ ارشد مینا نگری 3 مارچ 1942 کو مینا نگر، ضلع جلگاؤں مہاراشٹر میں پیدا ہوئے۔

انھوں نے مالیگاؤں سے تعلیم حاصل کی۔ وہ 1961 سے مارچ 2000 تک درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ دو درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے مطبوعہ شعری مجموعوں میں احساس (1999)، اجالے (1999)، دھرتی کے تارے (2010)، (2010)، سہروں کے چہروں (2011)، ماں (2012)، ابرنیساں (2014)، ہم سب ایک ہیں (2015)، پیارا ہندوستان، بولتے پتھر (2016) قابل ذکر ہیں۔ ادب اطفال کے حوالے سے 'دھرتی کے تارے' ان کی اہم کتاب ہے جو 2010 میں شائع ہوئی تھی۔ ماہنامہ بیباک، ششماہی احساس، ماہنامہ شاعر، ادبی محاذ، سہ ماہی عکس ادب جیسے رسالوں نے ان پہ گوشے بھی شائع کیے ہیں۔ ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کے حوالے کئی کتابیں تحریر کی گئی ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی اور مراٹھی زبانوں میں بھی انھوں نے شاعری کی ہے۔ ان دونوں حلقوں میں بھی کافی مقبول ہیں۔ ان کے کئی البم اور کیسٹس جاری ہوچکے ہیں۔ انھیں بہت سارے اعزازات بھی مل چکے ہیں اور ان پر کئی تنقیدی کتابیں بھی شائع ہوچکی ہیں۔

مختلف اخبارات سے

اوشا کرن خان

لہریاسرائے: اوشا کرن خان کا 11 فروری 2024 کو انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 80 برس کی تھیں۔ اوشا کرن خان کی پیدائش 7 جولائی 1945 کو لہریاسرائے دربھنگہ بہار میں ہوئی۔

بحیثیت ناول نگار اور کہانی کار ان کی مستحکم شناخت تھی۔ انھوں نے ناٹک بھی لکھے ہیں۔ ہندی اور میتھلی زبانوں میں ان کی کئی تصنیفات ہیں۔ انھوں نے ہندی میں پانی پر لکیر، پھاگن کے بعد، سیم انت کتھا، رتنارے نین جیسے ناول لکھے ہیں جب کہ ہندی کہانیوں میں گیلی پاک، کاسوان، دو بجان، وِوِش، وکرامدتیہ، جنم اودھی، گھر سے گھر تک کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ میتھلی زبان میں انھوں نے انوتریت پرش، حسینہ منزل، بھامتی، سرجن ہار جیسے ناول لکھے ہیں۔ 2023 میں ان کے ناول 'حسینہ منزل' کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ مشہور شاعر و ادیب ضیا فاروقی نے کیا ہے۔ فاروقی صاحب نے ان کے ایک اور ناول 'اگن ہنڈولا' کا بھی ترجمہ کیا ہے۔

اوشا کرن خان کو ان کی خدمات کے عوض کئی اعزازات بھی حاصل ہوچکے ہیں۔ ان میں خاص طور پر پدم شری ایوارڈ قابل ذکر ہے۔ ان کے علاوہ ہندی سیوی سمان (بہار راشٹریہ بھاشا پریشد، بہار سرکار)، مہا دیوی ورما اعزاز (بہار راج بھاشا وبھاگ)، دنکر راشٹریہ اعزاز، ساہتیہ اکادمی اعزاز، کسمانجلی اعزاز، ودیا نواس مشرا اعزاز بھی مل چکے ہیں۔

ہندی اور دیگر اخبارات سے

اشرف علی عابدی

نئی دھلی: لکھنوی تہذیب کی چلتی پھرتی پہچان اور آل انڈیا ریڈیو میں ایک مدت تک اردو خبروں کے ذریعے اپنی آواز کو طول و عرض میں پہنچانے والے عظیم براڈ کاسٹر سید اشرف علی عابدی طویل بیماری کے بعد اپنے ملک حقیقی سے جاملے۔ مرحوم کی آواز کی کھنک انھیں اپنے ہمعصر ساتھیوں سے مختلف بناتی تھی۔ سید اشرف علی عابدی نہایت ملنسار انسان تھے جو بڑے چھوٹوں سب سے ایک ہی انداز میں ملتے تھے۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ بیٹے عدنان عرف منو، جو رائٹر کے ساتھ فوٹوگرافر بھی ہیں اور دو بیٹیاں ہیں۔ سید اشرف علی عابدی نے بے شمار ریڈیائی فیچر لکھے اور انھیں اپنی آواز سے جاوداں بنا دیا۔ ان کا ذہن ہر وقت کچھ نیا کرنے کا متلاشی رہتا تھا اور زندگی کا کوئی ایسا میدان نہیں تھا جہاں ان کا دخل نہ رہا ہو۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 8 جنوری 2024

سالک بستوی

بستی: اردو دنیا کے معروف شاعر و ادیب اور جامعۃ الاصلاح و جامعۃ المحسنات کے بانی و ڈائرکٹر مولانا ممتاز احمد معروف بہ سالک بستوی کا نیپال میں 3 فروری 2024 کو ایک روڈ ایکسیڈینٹ میں انتقال ہوگیا۔ ان کی نماز جنازہ 4 فروری 2024 بروز اتوار بعد نماز ظہر ان کے آبائی غوری بجہا بازار سدھارتھ نگر کے قبرستان میں ادا کی گئی۔

سالک بستوی 9 اپریل 1960 کو غوری (سدھارتھ نگر) میں پیدا ہوئے تھے۔ اس اعتبار سے مرحوم کی عمر تقریباً 64 برس تھی۔ سالک صاحب ایک زود گو شاعر تھے۔ ان کے شعری مجموعے کا نام 'لالۂ صحرا' ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ ایک ماہر اور بیباک خطیب بھی تھے۔ انھوں نے جامع مسجد لوہار شعری سگرام پورہ سورت میں امامت و خطابت کی ذمے داری بھی نبھائی ہے۔

فیس بک اور دیگر ذرائع

جمیل حیدر شاد

کولکاتا: اردو کے معروف شاعر جمیل حیدر شاد کا 26 جنوری 2024 کو میڈی کیئر نرسنگ ہوم میں انتقال ہوگیا۔ ان کی ولادت 10 جنوری 1953 کو ہوئی تھی۔ ان کی عمر 71 برس سے زائد تھی۔ کافی دنوں سے علیل تھے۔

جمیل حیدر شاد کی پیدائش 10 جنوری 1953 کلکتہ، مغربی بنگال میں ہوئی تھی۔ ان کا آبائی وطن سلون، رائے بریلی (یوپی) ہے۔ ان کے والد کا نام غلام نبی جگو قریشی ہے۔ انھوں نے بی ایس سی (آنرز)، ادیب کامل، ایم اے (اردو، پالیٹیکل سائنس)، ڈی ڈی ایچ، ڈی ایم ایچ کی ڈگریاں حاصل کی تھیں اور یہ درس و تدریس سے وابستہ تھے۔ انھوں نے شاعری کا آغاز 1972 میں کیا تھا۔ مرحوم پاسبان ادب کے سکریٹری بھی تھے۔ ان کی نماز جنازہ جامع مسجد راجہ بازار میں ادا کی گئی اور تدفین باگ ماری قبرستان عمل میں آئی۔

بحوالہ عنبر شمیم، کولکاتا

اکبر حسین اکبر

کولکاتا: اردو کے معروف شاعر اکبر حسین اکبر کا 23 جنوری 2024 کو 66 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کی ولادت 12 نومبر 1958 کو نوادہ بہار میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام انور حسین تھا۔ اکبر حسین نے ایم اے تک کی تعلیم حاصل کی تھی۔ انھیں شعر و شاعری سے خاصا شغف تھا۔ شبنم کی آہٹ، برف برف چنگاری (2003) ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ان کی تجہیز و تکفین بعد نماز عشا سولہ آنہ قبرستان کولکاتا میں ہوئی۔

بحوالہ عنبر شمیم، کولکاتا

جلیل الدین شعلہ

کولکاتا: صحافی اور خوش نویس طیب علی (روزانہ ہند) سے ملی اطلاع کے مطابق اردو کے معروف صحافی اور مترجم جناب جلیل الدین شعلہ نے گذشتہ 30 جنوری 2024 کی شب آٹھ بجے اس دار فانی کو الوداع کہا۔ وہ پچھلے کچھ دنوں سے علیل تھے۔ دو روز قبل ان کی حالت بگڑنے پر چترنجن نیشنل میڈیکل کالج اسپتال لے جایا گیا، مگر وہ جانبر نہ ہوسکے۔ کچھ عرصہ قبل ان کی اہلیہ کا بھی انتقال ہوگیا تھا۔ صحافت مرحوم کا پیشہ بھی تھا اور شوق بھی۔ صحافت کے لیے انھوں نے اپنی پوری زندگی وقف کردی تھی۔ روزنامہ 'آبشار'، روزنامہ 'ہند' کے علاوہ کلکتے کے زیادہ تر اخبارات سے وہ منسلک رہے۔ انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے میں انھیں کمال مہارت حاصل تھی۔ مغربی بنگال اردو اکادمی کے سہ ماہی رسالہ 'روح ادب' کے سابق مدیر نظام الحسینی کے بڑے بھائی بھی تھے۔

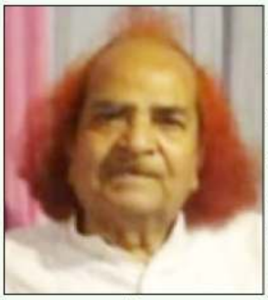

بحوالہ عنبر شمیم، کولکاتا، و روزنامہ 'اخبار مشرق' کولکاتا، 1 فروری 2024

فردالحسن فرد

پٹنہ: معروف شاعر اور ارم پبلشنگ ہاؤس کے مالک فرد الحسن فرد کا 5 فروری کو پھلواری شریف میں ساڑھے گیارہ بجے دن میں انتقال ہوگیا۔ انھیں سانس لینے میں دقت ہونے پر ہسپتال لے جایا گیا مگر راستے میں ہی ان کی موت ہوگئی۔ وہ معروف شاعر اور مصنف تھے۔ 'بے ترتیب' اور 'بے ربط' ان کی کتاب ہے۔ ان کی عمر تقریباً 50 برس تھی۔ ان کا جسد خاکی آبائی وطن قاضی محلّہ شیر گھاٹی لے جایا گیا جہاں آبائی قبرستان میں 6 فروری کو ان کی تدفین عمل آئی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ چار بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔ ان کے انتقال پر علمی و ادبی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ ان کے انتقال پر متعدد ادبی، سیاسی و سماجی شخصیات نے تعزیت کا اظہار کیا۔ اظہار تعزیت کرتے ہوئے ڈاکٹر انوارالہدیٰ اور ڈاکٹر اسلم جاوداں نے کہا کہ وہ نہایت ہی خلیق، ملنسار انسان تھے۔ وہ اردو کی محفلوں کی بہترین نظامت بھی کرتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 فروری 2024

کفایت دہلوی

دہلی: اردو ادب کی معروف شخصیت ماہنامہ 'باجی' اور 'فلمی ستارے' کے مدیر و حاجی انیس دہلوی کے فرزند، عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ دوحہ قطر کے ہندوستانی کنوینر کفایت دہلوی کا 13 فروری شب میں انتقال ہوگیا۔ اطلاعات کے مطابق 12 بجے کے آس پاس ان کی طبیعت بگڑی اور انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی تدفین مہندیان قبرستان میں عمل میں آئی۔ ان کے انتقال پر اراکین مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا ہے کہ مرحوم کفایت صاحب دہلی کے انتہائی معزز اور اردو زبان و ادب کے حوالے سے معروف خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد انیس دہلوی 1994 سے انڈیا میں مجلس کے کوآرڈینیٹر تھے۔ رواں صدی کے آغاز میں ان کے انتقال کے بعد کفایت صاحب نے تمام ذمہ داریاں سنبھالیں اور آخری سانس تک بحسن و خوبی نبھائیں۔ آپ بھارت میں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ کی جیوری کے اجلاس ترتیب دیتے، مجلس کے عالمی مشاعروں میں شرکت کرنے والے شعرا سے رابطہ کرتے اور تمام کارروائیاں مکمل کرنے کے بعد انھیں دہلی ایئرپورٹ سے دوحہ کے لیے الوداع کہتے۔ آپ ایک نفیس اور طرح دار شخصیت کے مالک تھے۔ خاموشی اور خلوص کے ساتھ چیئرمین محمد عتیق صاحب کی ہدایات کے مطابق مجلس کی جانب سے دی جانے والی ہر ذمہ داری نبھاتے تھے۔

بحوالہ مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ قطر، 14 فروری 2024

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

उर्दू दुनिया, मासिक, मार्च-२०२४,वर्ष:२६, अंक:३
URDU DUNIYA Monthly, March-2024, Vol.26, Issue:03
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/02/2024
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

قومی اردو کونسل میں جشن جمہوریہ کی تصویری جھلکیاں

Printed and Published by Prof. Dhananjay Singh, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6